# اصلاح

## دین و دنیا کا حسین تحفہ

اقتباسات از خطبات

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

مرتب

پیر طریقت بقیۃ السلف عارف باللہ

حضرت مولانا محمد علاء الدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی

باہتمام : مولوی مصطفیٰ صاحب (نوئیڈا)

خانقاہ اشرفیہ و مکتبہ رحمت عالم رحمانی چوک پالی گھنشیام پور دربھنگہ بہار (انڈیا)

# اصلاح

## دین ودنیا کا حسین تحفہ

﴿اقتباسات از خطبات﴾

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا **اشرف علی تھانوی** رحمۃ اللہ علیہ

﴿مرتب﴾

پیر طریقت بقیۃ السلف عارف باللہ

**حضرت مولانا محمد علاء الدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی**

**باھتمام**

مولوی مصطفیٰ صاحب نوئیڈا

خلیفہ: حضرت مولانا محمد علاء الدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی

خانقاہ اشرفیہ ومکتبہ رحمت عالم

ناشر: خانقاہ اشرفیہ ومکتبہ رحمت عالم رحمانی چوک پالی گھنشیام پور دربھنگہ بہار (انڈیا)

# طالب حق کو طباعت کی اجازت ہے



نام کتاب: ________ اصلاح دین ودنیا کا حسین تحفہ

اقتباسات از خطبات: ________ حکیم الامتؒ

مرتب: ________ حضرت مولانا محمد علاء الدین صاحب قاسمی

باھتمام: ________ مولوی مصطفیٰ صاحب، نوئیڈا

کمپیوٹر وکتابت: ________ عبداللہ علاء الدین قاسمی

صفحات: ________ ۳۴۴

ایڈیشن: ________ پہلا ایڈیشن

قیمت: ________

## ملنے کے پتے

☆ خانقاہ اشرفیہ ومکتبہ رحمت عالم رحمانی چوک پالی گھنشیام پور ضلع دربھنگہ (بہار)

☆ محمد عمر نزد مدینہ مسجد پورانی سیما پوری (نئی دہلی)

☆ مولوی مصطفیٰ صاحب، نوئیڈا (یوپی)

☆ قاری عبدالجبار صاحب، کلکتہ، (ویسٹ بنگال)

Email:Abdullahdbg1994@gmail.com

Mobile:9899544197-7654132008

# فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# مقدمہ

مجھے افسوس ہے اور اپنی عدیم الفرصتی پر حیف صد حیف ہے کہ بعض عوارض وادبار ایام کی بناء پر طویل عرصہ سے قلم وقرطاس سے انس وربط نہ رہ سکا، اس کو اپنی تقصیر وکوتاہی کہا جائے یا تقدیر ایزدی، بہرحال ؎

ہر چہ از دوست می رسد نیکو ست

حضرت حکیم الامتؒ کی تصانیف وتالیفات پر کام کرنا ایک عظیم مشن ہے، امت کی قیادت وہدایت کے لیے آپ نے اپنی زندگی کے ہر لمحہ کو قربان کر دیا تھا، اہل اخلاص اس جہاں میں اور بھی بہت ہیں مگر میری نظر میں آپؒ جیسا مخلص صدیوں میں پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ راقم کو آپؒ کی کتابوں اور مبارک مشن کو فروغ دینے کے لیے شرح صدر ہو گیا۔

الحمدللہ حضرت حکیم الامتؒ کے ملفوظات اور خطبات پر ازیں قبل بھی میں میری بعض تحریریں قارئین کی نظروں سے گزر کر خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

حضرت اقدس سرہٗ کی ہر تحریر انمول اور ہر ملفوظ نہایت مؤثر ہے، تاریخ اور تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے کہ حکیم الامتؒ عہد ماضی سے لے کر آج تک علماء وصلحاء کی جماعتوں میں درنایاب اور نادرالوجود ہستی رہے ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ آپؒ نے زندگی کے کسی بھی محاذ پر کوئی بھی عمل یا سرگرمی دنیا کے لیے نہیں کی، بلکہ دین اور دنیا کے تمام کاموں میں رضائے الٰہی کو ہی پیش نظر رکھا، چنانچہ آپؒ کا کوئی

ہم عصر ہو یا عہد مابعد کا شخص کوئی یہ نہیں ثابت کرسکتا کہ آپؒ نے فلاں کام دنیا کے لیے کیا اور فلاں کام دین کے لیے۔

جب بھی آپ کی زبان مبارک سے کوئی لفظ یا کلمہ صادر ہوا تو اللہ کی رضا کے لیے اور کوئی بھی سطر زیر تحریر آئی تو صرف اور صرف اللہ کی خاطر، دنیا کے لیے نہ آپ کی زبان کبھی کھلی اور نہ ہی آپ نے کچھ لکھا، آپؒ نے جو کہا اللہ کے لیے، جو لکھا اللہ کے لیے۔

چھ ماہ قبل میرے ایک مخلص مسترشد اور کرم فرما عزیز الاولیاء مولوی مصطفٰے صاحب نے مجھ سے اپنی ایک قلبی تمنا اور دلی آرزو ظاہر کی کہ ماضی کے فلاں فلاں مشائخ نے مجھے حضرت حکیم الامتؒ کی بعض تصانیف پر کام کرنے کی سعادت میں شرکت کی ترغیب دلائی ہے، لہٰذا اس پر کچھ کام ہونا چاہیئے، ممدوح نے جب چند بار اصرار فرمایا تو ناچیز نے عزم بالجزم کرلیا کہ ان شاء اللہ کام کرنا ہے، اللہ کی توفیق ہوگی، چنانچہ آپ کی ہمت افزائی اور تحریک وترغیب کے پیش نظر میں نے اپنی کشتی کو توکلاً علی اللہ بحر العلوم حضرت حکیم الامتؒ کے دریائے ناپیدا کنار میں ڈال دیا، مولوی مصطفٰے صاحب کی دعاء اور حضرت حکیم الامتؒ کی نسبت کی برکت سے میرا سفینۂ تحریر ساحل مقصود کو پہنچ گیا، مجھے کتنی کامیابی ملی اور کتنا صحیح کام ہوا اس کا فیصلہ تو قارئین کریں گے، مگر اس کامیابی کا اولین سہراء مولوی مصطفٰے اور مولوی عبداللہ سلمہٗ کو جاتا ہے کہ ان حضرات کی دعاؤں اور محنتوں سے یہ ہوسکا۔

زیر نظر کتاب ''اصلاح دین ودنیا کا حسین تحفہ'' دراصل حضرت حکیم الامتؒ کے ان قیمتی ومؤثر اصلاحی خطبات کا مجموعۂ اقتباسات ہے جو مختلف اوراق میں

تقریباً ۸۰۰ صفحات پر مشتمل ایک کتاب ''دین ودنیا'' میں منتشر تھے ان میں سے جو نہایت مفید اور ضروری مضامین تھے راقم نے تحقیق اور مراجعت کر کے ان پر سہل اور عام فہم اور دلکش جدید عناوین قائم کر دئے تا کہ قارئین کو ان سے زیادہ سے زیادہ دلچسپی ہو اور بغیر کسی تأمل وتوقف کے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا آسان ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا کریں کہ آئندہ بھی حضرتؒ کی کتابوں کو آسان وسہل شکلوں میں پیش کرنے کی سعادت عطا فرمائے، اور تمام شرکاء ومعاونین کو اپنے پاس سے اجر جزیل عطا فرمائے، آمین۔

(حضرت مولانا) **محمد علاء الدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی**

خانقاہ اشرفیہ ومکتبہ رحمت عالم رحمانی چوک پالی گھنشیام پور

ضلع دربھنگہ، بہار (انڈیا)

۲۷/ذی قعدہ، چہارشنبہ، ۱۴۴۵ھ

مطابق ۵/جون، ۲۰۲۴ء

# تعویذ کیوں اور کیسے ایجاد ہوئی؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا: تعویذ لکھنا اصل میں پڑھنے کا نائب ہے، یہ دوسرے درجہ کی چیز ہے، مگر عام مذاق یہ ہے کہ پڑھنے کی اتنی وقعت نہیں ہے جتنی تعویذوں کی وقعت ہے۔

حدیث سے تعویذوں کی جو حالت معلوم ہوتی ہے اس پر وہ عبداللہ بن عمرؓ کی عادت دال ہے جو حصن حصین میں مذکور ہے کہ وہ اپنے بچوں کو ایک دعاء أَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰہ، یعنی میں اللہ تعالیٰ کے کلمات کے ساتھ پناہ لیتا ہوں، پڑھاتے تھے اور جو سیانے نہ تھے ان کو برکت پہنچانے کا یہ طریقہ تھا کہ دعا لکھ کر گلے میں ڈال دیتے تھے۔ یہ حدیث ہے ماخذ تعویذ کا۔

اس سے تصریحاً معلوم ہوا کہ اصل مقصود پڑھانا تھا مگر جو سیانے نہ تھے ان کو برکت پہنچانے کا یہ طریقہ تھا کہ دعا لکھ کر گلے میں ڈال دیتے۔ تو تعویذ باندھنے کا دوسرا درجہ ہے، مگر بوجہ ناحقیقت شناسی کے عکس ہو گیا، کہ تعویذ کا اثر زیادہ سمجھنے لگے اور پڑھنے کا کم، غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ اکثر لوگ اس زمانہ میں جاہل ہوتے ہیں، اسلئے ہمارے بزرگوں نے تقوی کا طریق اختیار کیا، دوسرے پڑھنے میں دقت ہے اور نفس ہمیشہ اپنی آسانی کی صورت نکال لیتا ہے، بہر حال اسماء الٰہیہ میں برکت ضرور ہے، مگر جب کہ مناسبت بھی ہو۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص ر ۱۸)

# اخلاق کی حقیقت

فرمایا: بعض الفاظ کے معنی غلط مشہور ہو جاتے ہیں یہ تو عوام کی غلطی ہے ،بعض الفاظ کے معنی میں خواص بھی غلطی کرتے ہیں، مثلا خوش خلقی کے معنی خواص میں بھی غلط مشہور ہے، چنانچہ دیکھ لیں کہ خوش اخلاق اس کو سمجھتے ہیں کہ ذرا نرم ہو غصہ نہ کرتا ہو، حالانکہ یہ اخلاق نہیں بلکہ آثار ہیں اخلاق کے اور اخلاق ایک ملکۂ باطنی ہے، یعنی صفات حمیدہ میں درجہ ملکہ کا حاصل ہو جائے تو اس شخص کو صاحب اخلاق کہیں گے، مثلاً تواضع اس کو کہتے ہیں کہ اپنے کو سب سے چھوٹا سمجھے، یہ نہیں کہ ظاہراً منکسر ہو کر ملے یہ اس کا ایک اثر ہے، اور اس کے محمود ہونے کی شرط اس کا موقع پر ہونا ہے، چنانچہ اس کے آثار محمودہ کی مدح قرآن سے بھی ثابت ہے۔

وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا۔

(سورۃ الفرقان، آیت: ۶۳)

ترجمہ: خدا تعالی کے خاص بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔

تو اس آیت میں تواضع کا ایک اثر بتلایا ہے۔ کیونکہ کبھی کسی شئ کو ماہیت سے بتلایا جاتا ہے، اور کبھی اثر سے، تو نرمی وخشوع سے چلنا حقیقت میں اثر ہے تواضع کا۔

چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ایک شخص نماز پڑھتے ہوئے داڑھی سے کھیل رہا تھا جیسے اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ نماز کے اندر کپڑوں سے یا بالوں سے شغل کیا

کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر اس کے قلب میں خشو ہوتا تو داڑھی سے نہ کھیلتا، تو اس حدیث سے بھی یہ بات ثابت ہوئی کہ خوف وخشیت قلب میں ہے اور اس کا یہ اثر ہے کہ نماز میں لہولعب نہ ہو۔

غرض نرمی سے چلنا آثار میں سے ہے اس کو تواضع سمجھتے ہیں، دو غلطیاں ہوئیں، ایک تو یہ کہ اخلاق بالمعنی الحقیقی کو غیر ضروری حصول سمجھے، کیونکہ اس کے معنی بدل کر اپنے کو اس کا عامل سمجھے اور فارغ ہو گئے، اب حالت یہ ہے کہ دل میں تو سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑے ہیں، اور زبان سے کہتے ہیں کہ ہم کچھ بھی نہیں، حالانکہ دل میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اس کا امتحان یہ ہے کہ جب بہ تکلّف متواضع بننے والا کہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں کوئی شخص جرأت کر کے یہ کہہ دے کہ واقعی میں سخت غلطی میں مبتلا رہا، آج مجھے معلوم ہوا کہ آپ تو کچھ بھی نہیں محض ناکارہ ہیں، پھر دیکھئے کتنے خفا ہوتے ہیں، صاحبو! اگر حقیقت میں ایسا سمجھتے تھے تو ناراض کیوں ہوئے، معلوم ہوا کہ ہرگز اپنے کو ایسا نہیں سمجھتے، بلکہ اس لیے ایسے الفاظ کہتے ہیں کہ یہ عادت عرفاً محمود ہے، دوسرے لوگ اس پر اور مدح کرتے ہیں، گویا اور مدح کرانے کے لیے نفس نے یہ طریقہ نکال لیا ہے اس کی یہ تواضع بھی بغرض تکبر ہے جس کا امتحان یہی ہے جو عرض کیا گیا، اس طریقہ سے اصلی متواضع اور تصنع کرنے والے کا خوب پتہ چل جاتا ہے۔

دوسری غلطی یہ ہے جب نرمی کو تواضع سمجھا گیا تو سختی بدخلقی پر محمول کیا جائے گا، چنانچہ بعض مرتبہ اہل اللہ اپنے متعلقین پر سختی کرتے ہیں اور دیکھنے والے ان پر

تہمت لگاتے ہیں کہ بدخلق ہیں، صاحبو! اصلاح کا نام بدخلقی اسی وجہ سے ہوا کہ اخلاق کے معنیٰ بدل دیئے، بلکہ سختی کے موقع پر نرمی کرنا یہ بدخلقی ہے۔

صاحبو! اگر بچہ سنکھیا یا افیون کھانے لگے اور معلوم ہو کہ ابھی نگل جائے گا، اس وقت کیا اخلاق یہی ہے کہ دل شکنی نہ کرو یا یہ کہ اس کے منہ میں اُنگلی ڈال کر اس کو نکال لو اور سزا دو، اب بتلائیے، اس میں سے کون برتاؤ خوش خلقی ہے، حقیقت میں اس کو ہلاکت سے نہ روکنا یہ بدخلقی ہے اور راحت رسانی یہ خوش خلقی ہے، یا مثلاً ایک اندھا جا رہا ہے اور کنواں آ گیا اور کہنے سے رک نہیں سکتا، تو کیا خوش خلقی یہی ہے کہ نہایت متانت سے کہے حافظ صاحب آپ کے آگے کنواں ہے ذرا بچ کر چلئے یا ہاتھ پکڑ کر جھٹکا دینا خلق ہے ؎

اگر بینم کہ نا بینا و چاہ ست
اگر خاموش بنشینم گناہ ست

ترجمہ: اگر دیکھیں اندھا جا رہا ہے اور اس کے سامنے کنواں ہے
اس وقت خاموش بیٹھنا اور اس کو نہ بچانا گناہ ہے۔

مشہور ہے کہ ایک قاری صاحب جو اینٹھ مروڑ کر پڑھتے تھے انہوں نے شاگردوں سے کہہ رکھا تھا کہ گفتگو بھی قرأت سے کیا کرو، ایک مرتبہ حافظ صاحب حقہ پی رہے تھے، ایک چنگاری پگڑی میں جا لگی، تو ایک شاگرد نے بڑی دیر میں قرأت سے یہ مضمون ادا کیا کہ، جناب حافظ صاحب آپ کی دستار مبارک میں ایک چنگاری لگ گئی ہے، اتنی دیر میں حافظ صاحب کی دستار بہت سی جل گئی، کیا

کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ قرأت کا موقع ہے،اس نے بڑی غلطی کی کہ غیر موقعہ قرأت میں قرأت استعمال کی۔

اسی طرح جو نرمی غیر موقع میں ہوگی وہ بھی مذموم ہوگی ،اور اخلاق میں شمار نہ ہوگی ، یہاں سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بزرگوں سے جو سختی صادر ہوتی ہے اس کو سختی کہنا عجب ہے، وہ صرف اپنے لوگوں سے سختی کرتے ہیں،جس سے اصلاح مقصود ہوتی ہے۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پیشاب کرنا شروع کردیا،صحابہؓ نے اس کو گھورا،اور دھمکانا چاہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس کا پیشاب قطع نہ کرو! سبحان اللہ کیسی حکمت کی بات ہے؟ اس لئے کہ یا تو وہ روکتا یا بھاگتا ،روکنے میں تو اس کو سخت تکلیف ہوتی اور بھاگنے سے مسجد اور زیادہ خراب ہوتی ، جب وہ باطمینان پیشاب کر چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ڈول اس جگہ بہادینے کا حکم فرمادیا،اس کے بعد اعرابی کو بلا کر نرمی سے فرمادیا کہ یہ مسجد اللہ کا گھر ہے،اس میں عبادت کی جاتی ہے،اس کو ناپاکی سے ملوث نہیں کرنا چاہیئے۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/ ۱۸ تا ۲۲)

# مسلمانوں کو آپس میں متحد ہو کر رہنا چاہئے

فرمایا: اگر کسی کی غیبت ہوتی ہو تو غیبت کرنے والے کو روکنا چاہئے، اگر وہ نہ مانے تو خود اٹھ جانا چاہئے، اسی طرح ہر شخص کو ضروری ہے کہ اپنے کو سب سے کم سمجھے، اس طرح سے ان شاء اللہ تعالیٰ مخالفتیں بہت کم ہوں گی، کیونکہ اکثر جو عداوتیں ہو جاتی ہیں ان کا بڑا سبب یہی تکبر ہے، جس سے غیبت بھی پیدا ہوتی ہے، علیٰ ہذا ہر مسلمان کو اپنے دوسرے بھائی مسلمان کے لئے دعائے خیر کرنی چاہئے، غرض ہر مسلمان سے اگر وہ مبتلائے معاصی بھی وہ برتاؤ کرو، جو اپنے بیمار بھائی سے کرتے ہو، کیونکہ مسلمان سب بھائی بھائی ہیں، حدیث میں ارشاد ہے: وَکُوْنُوْا عِبَادَ اللہ اِخْوَاناً، یعنی تم اللہ تعالیٰ کے بندے آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ، غرض ایک تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ واقعہ ہے جو اس اعرابی کے قصے میں سنا۔

دوسرا واقعہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک مرتبہ مسجد شریف میں تشریف لائے اور دیوار مسجد پر تھوک لگا دیکھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ سُرخ ہو گیا، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو لکڑی سے کھرچ دیا، ایک صحابیؓ خوشبو لائے اور اس جگہ مل دی، اب دیکھئے کہ وہی ذات بابرکات جنہوں نے وہاں سختی نہیں کی جب کہ ایک شخص نے مسجد میں پیشاب کر دیا تھا، یہاں صرف تھوکنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ سُرخ ہو گیا تو فرق یہ تھا کہ پہلا آدمی دیہاتی تھا اور یہ دوسرے شخص آپ کی صحبت کے فیض یافتہ تھے، تو معلوم ہوا کہ غیر واقف سے دوسرا برتاؤ ہوتا ہے، اور واقف سے دوسرا، پس

اگر ہر سختی بد خلقی ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی صادر نہ ہوتی، جن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ کا ہے: اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۔ (سورہ قلم، آیت ٦٨)

ترجمہ: بلا شک آپ اخلاق حسنہ کے اعلیٰ پیمانہ پر ہیں۔

اور لیجئے ایک مرتبہ ایک صحابیؓ لفظ کے بارہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کر رہے تھے کہ اگر بکری جنگل میں ملے تو اس کو حفاظت کے لئے اپنے قبضہ میں کر لیا جاوے یا نہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں اس کو لے آنا چاہئے، ورنہ درندے اس کو ہلاک کر دیں گے، پھر کسی نے پوچھا کہ اگر اونٹ ملے تو اس کو بھی ایسا ہی کیا جائے، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غصہ آ گیا، اور چہرۂ مبارک سُرخ ہو گیا، فرمایا کہ اس کی حفاظت کی کیا ضرورت ہے وہ خود موذی جانوروں کے دفع کرنے پر قادر ہے، درختوں سے پتے کھاتا ہوا اپنے مالک سے آ ملے گا۔

اس بات پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو غصہ اس لئے آیا کہ اس سوال سے حرص اور طمع مترشح ہو رہی تھی، کیا اب بھی یہ کہا جائے گا کہ بد خلقی مطلق سختی اور غصہ کا نام ہے، آج علماء پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ ذرا سی بات میں خفا ہو جاتے ہیں، ان کے اخلاق عمدہ نہیں، سو بحمد للہ ان واقعات کے معلوم کرنے کے بعد یہ الزام رفع ہو گیا ہو گا۔

اس سے ایک اور بات بھی نکل آئی، وہ یہ ہے کہ بعض طلبہ استاذوں کی شکایت کیا کرتے ہیں کہ، بڑے سخت ہیں تو معلوم ہو گیا کہ یہ سنت ہے کہ بے موقع بات پر غصہ کیا جائے اور بعض طالب علم بھی بہت بکھیڑے نکالا کرتے ہیں اور استاذ کو تنگ کرنا چاہتے ہیں، یہ بڑی گستاخی اور بے ادبی ہے، اگر استاذ سے غلطی بھی

ہوجائے تو اس وقت خاموش ہو جانا چاہئے، دوسرے وقت ادب سے عرض کیا جاسکتا ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص؍ ۲۴ تا ۲۵)

دیکھئے! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ کون خوش خلق ہوگا، مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی بعضی باتوں پر سختی اور غصہ کا اظہار فرمایا ہے، تو بزرگوں کی نسبت یہ خیال کرنا کہ یہ بداخلاق ہیں، بالکل بے جا ہے، بعض بزرگوں نے ایسا کیا ہے کہ ایک چھوٹی سی بات سے بہت بڑی بات پر استدلال کرتے تھے اور اس کے مقتضاء پر عمل کرتے تھے۔

ایک بزرگ کا واقعہ ہے کہ جب کوئی ان کے پاس بیعت ہونے آتا تو وہ اس کیلئے کھانا کچھ زیادہ بھیجتے، اور جب وہاں سے بچ کر آتا تو یہ دیکھتے کہ روٹی اور سالن تناسب سے بچا ہے یا بلا تناسب، اول صورت میں بیعت کرتے دوسری صورت میں انکار کردیتے، تو ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ بہت چھوٹی سی بات پر وہ ایسی سختی کرتے تھے، مگر حقیقت میں وہ اس سے استدلال کرتے تھے، اس کی بے انتظامی پر، اور بدانتظام شخص کو وہ اپنی خدمت میں نہیں رکھتے تھے، کیونکہ کوئی کام بدون انتظام کے نہیں ہوسکتا، اور واقعی جس میں انتظام کا مادہ نہ ہو وہ کسی کام کو نباہ نہیں سکتا، کچھ دن کیا پھر چھوڑ دیا۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص؍ ۲۷)

تو بعضی بات ظاہر میں چھوٹی معلوم ہوتی ہے، مگر اس کا منشاء بڑا ہوتا ہے، عوام اس کو نہیں سمجھتے، اسی لئے خدا تعالیٰ کے معاملات میں بھی ایسے لوگوں سے سخت غلطی ہوتی ہے کہ بعض امور عظیمہ کو چھوٹا سمجھ کر اس پر دلیر ہوجاتے ہیں اور یوں کہتے ہیں کہ خدا کی زات بہت بے پرواہ ہے، ان کے یہاں چھوٹی چھوٹی

باتوں پر گرفت نہیں ہوتی ،سو یہ سخت غلطی ہے ،جس کو تم چھوٹی سمجھتے ہو وہ ممکن ہے کہ واقعہ میں بہت بڑی ہو۔

صاحبو! اول تو خدا تعالیٰ کے بہت حقوق ہیں ،اس کے اعتبار سے وہاں کوئی مخالفت چھوٹی نہیں ہوتی ،اوراس پر یہ شبہ ہو کہ پھر کیا صغیرہ پر بھی عذاب ہوگا تو صغیرہ وکبیرہ میں کیا فرق رہا، جواب یہ ہے کہ اگر اہل سنت نے اس حقیقت کو سمجھا ہے ،صغیرہ پر بھی تعذیب کو جائز رکھا ہے، اور صغیرہ کو جو صغیرہ کہتے ہیں ،وہ دوسرے اس سے بڑے گناہ کے اعتبار سے نہ یہ کہ واقع میں چھوٹا ہے، پس یہ فرق اعتباری ہے ،ورنہ حقیقت میں عظمت خداوندی پر نظر کرنے کے بعد تو ہر گناہ کبیرہ ہے، دوسرے اس سے قطع نظر کر کے بھی بعض گناہ کی حقیقت شدید ہوتی ہے گو صورتاً کسی نظر سے بوجہ عدم تأمل خفیف معلوم ہو۔

چنانچہ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ وہ ایک دن جا رہے تھے، ''ہولی'' کا دن تھا ،ہندو آپس میں ایک دوسرے پر ''رنگ'' ڈال رہے تھے، بازار میں ہر شئ رنگین آتی تھی ،انہوں نے ایک گدھے کو دیکھا کہ اس کو پر رنگ نہیں تو ہنس کر کہا، تجھے کسی نے نہیں رنگا، لا تجھ کو میں رنگ دوں، اور پان کی پیک اس پر ڈال دی ،جب مر گئے تو کسی کو مکشوف ہوا کہ ان کی نسبت حکم ہوا کہ ان کو ہولی والوں میں لے جاؤ، کیونکہ انہوں نے گدھے پر پان کی پیک ڈال کر ہولی والوں کی شرکت کی تھی۔

صاحبو! پان کی پیک ڈالنا چھوٹی بات نہیں ،اس میں تشبہ بالکفار تھا جو بڑی بات ہے ،تو گناہ کو چھوٹا سمجھنے سے اور اس پر مواخذہ سننے سے کبھی خدا پر بھی

لوگوں کا یہ گمان ہوجاتا ہے کہ اللہ میاں، بہت غصہ فرماتے ہیں، ذرا سی بات پر خفاء ہوجاتے ہیں، استغفر اللہ، غرض اخلاق کی تفسیر میں ایسا ہی لوگوں کو دھوکہ ہوگیا ہے، جس میں خواص تک مبتلا ہے، یہ بات بھی جملہ معترضہ کے طور پر بیان ہوگئی۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/۲۸ تا۲۹)

## اخلاص اللہ کا حکم بھی ہے اور عبادت بھی

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں: اسی لیے اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَاللہ مُخْلِصاً مجھ کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے حکم ہوا ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کروں کہ عبادت کو اسی ہی کے لیے خالص رکھوں فرمایا: امرت ان اخلص، مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اخلاص کروں نہیں فرمایا، کیونکہ اگر امرت ان اخلص فرماتے تو اس سے یہ نہ معلوم ہوتا کہ اخلاص اتنی ضروری شئ ہے کہ عبادت تک اس کے بغیر معتبر نہیں، جب عبادت کے ساتھ بھی حالانکہ وہ خود ایک عمدہ مقصود شئ ہے، اخلاص کا ہونا ضروری ہے تو اس سے اخلاص کی عظمتِ شان اور زیادہ معلوم ہوگئی کہ عبادت جیسی چیز بھی بدون اس کے ہیچ ہے۔

ایسے ہی اخلاص کے لیے عبادت بھی ضروری ہے، کیونکہ صرف اخلاص ہی مامور نہیں، امرت ان اخلص مجھ کو حکم ہوا ہے کہ میں اخلاص کروں نہیں فرمایا گیا عبادت اور اخلاص دونوں مامور بہ ہیں، اس سے ان لوگوں کی غلطی ثابت ہوگئی جو عبادت کو ضروری نہیں سمجھتے، مگر چونکہ یہاں فقط فائدہ اخلاص ہے اس لیے زیادہ

ما مور بہ ہوا، مراد یہی ہے کہ خدا کی عبادت اس طرح کروں کہ عبادت اس کے لیے خالص ہو بلکہ یہ فرمایا کہ مخلصین له الدین، اس طرح کہ اس ہی کے لیے دین کو خالص رکھوں، جس سے معلوم ہوا کہ عبادت دینی جب ہی ہے کہ اس میں اخلاص بھی ہو، تو مسئلہ یہ ثابت ہوا کہ صورۃ عبادت جب تک اس میں اخلاص نہ ہو دین نہیں، اور جب روح یعنی اخلاص بھی ہو تب البتہ یہ عبادت دین اور خدا کے یہاں قابل قبول ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۳۱ تا ۳۲)

اب عقلی طور پر سمجھئے! اخلاص کی ضرورت اس کے ترجمہ سے سمجھ میں آوے گی، اخلاص کا ترجمہ ہے خالص کردن، خالص اسے کہتے ہیں جس میں کسی چیز کی آمیزش نہ ہو، جیسے عوام نخالص کہتے ہیں، مثلاً خالص گھی وہ ہے، جس میں تیل کا ملاؤ نہ ہو، تو اخلاص کے لغوی معنی خالص کرنے کے ہوئے، اب اپنے برتاؤ کو دیکھیے! آپ کے ساتھ جب کوئی محبت ظاہر کرتا ہے تو آپ اس کی نیت کو بھی دیکھتے ہیں یا نہیں دیکھتے، اگر ایک شخص نذر بھی دے اور پھر کہے کہ میری سفارش کر دیجیے تو آپ یہی سمجھیں گے کہ یہ نذر اپنی غرض کے لیے تھی یا مثلاً کوئی آپ کی دعوت کرے اور چلتے وقت کہے کہ میرے ذمہ قرضہ ہے کیا آپ کو یہ دعوت نا گوار نہ گزرے گی؟

غرض صبح سے شام تک اپنے معاملات پر نظر کر لیجئے! کہ جو محبت خالص ہوتی ہے اسی کی قدر ہوتی ہے آپ بھی اسی دوستی کو پسند کرتے ہیں جس میں آمیزش نہ ہو، تو خدا تعالیٰ جو کہ طیب ہے آمیزش دار عبادت ومحبت کی کیوں کر قدر کریں گے، افسوس محبوبان دنیا کے واسطے تو کوشش کی جاتی ہے کہ ہدیہ خالص ہو اس میں کسی چیز کا میل

نہ ہو، اور خدائی دربار میں جو عبادت پیش کی جاتی ہے اس کے خالص ہونے کی کوشش نہیں کی جاتی غرض نقلی اور عقلی طور پر اخلاص کی ضرورت ثابت ہوگئی۔

(خطبات حکیم الامتؒ ص / ۳۲ تا ۳۳)

## مجاہدہ کے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا

اور آرام سے رہنے میں طبیعت میں نشاط رہتا ہے اور نشاط میں کام سہل ہوتا ہے، اسی واسطے ہمارے حضرت کی رائے یہ تھی کہ نفس کو خوب خوش رکھو، مگر کام بھی بہت لو، اور چکی پسواؤ اور جب کام نہ کرو تب بھی یہ سزا نہ دو کہ غذا کم کر دو، بلکہ کثرت نوافل سے اس کا تدارک کرو چنانچہ نماز کی شان ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ نماز گراں ہے وہ اس سے گھبراتا ہے بس اس طور پر وہ معمول روزانہ میں سستی نہ کرے گا۔

اکثر لوگ مجھ سے کہا کرتے ہیں کہ ایسی ترکیب بتلا دو کہ کھانا کم کھانے کی عادت ہو جائے، میں کہا کرتا ہوں کہ اگر کھانا کم ہو گیا اور کمزور اور لاغر ہو گئے تو اتنا کام بھی نہ کر سکو گے جتنا اب کر رہے ہو، اس کے علاوہ مجاہدہ کے اور طریقے بھی تو ہیں، حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی عادت تھی کہ جس روز تہجد کے لیے آنکھ نہ کھلتی تھی تو اپنے بدن پر قمچیاں مار مار کر توڑ دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر اس کے بعد پھر ایسا ہوا تو ہم پھر ایسا ہی کریں گے، تو کھانا کم کرنا کیا ضروری ہے؟ مجاہدے اور بھی تو ہیں۔

خلاصہ یہ کہ ایسی محنت میرا مقصود نہیں، میرا مقصود یہ ہے کہ اصلاح کی دھن میں لگ جاؤ، باقی کھانا پینا چھوڑنے کی کوئی ضرورت نہیں، دین میں کچھ دشواری نہیں، جو کچھ تم کو دشواری معلوم ہو رہی ہے سبب اس کا صرف یہ ہے کہ تم نے ارادہ نہیں کیا، اور ارادہ نہ کرنے سے ہر کام گو وہ کتنا ہی آسان ہو مشکل ہو جاتا ہے۔

چنانچہ ایک حکایت یاد آئی کہ زمانہ شاہی میں دو احدی آدمی تھے، ایک پڑا تھا دوسرا اس کے پاس بیٹھا تھا، راستہ میں ایک شخص گھوڑے پر سوار جا رہا تھا، ایک احدی نے اس کو آواز دی کہ اے میاں! گھوڑے سوار ذرا میری ایک بات سنتا جا وہ اس کے پاس آیا کہ کہہ کیا کہتا ہے؟ اس نے کہا کہ یہ جو بیر میرے سینے پر پڑا ہے ذرا میرے منہ میں ڈال دے، اس نے ایک کوڑا مارا کہ بلا ضرورت مجھ چلتے ہوئے کو راستہ سے بلایا اور اتنا نہ ہوا کہ خود کھا لے یا اس سے کہہ دے کے جو پاس بیٹھا ہے، اس نے کہا صاحب میں کبھی اس کام کو نہ کروں گا کیونکہ صبح کتا میرے منہ میں موتتا رہا اور یہ پاس بیٹھا تھا مگر اس نے ہٹایا نہیں، سوار نے ایک کوڑا اس کے بھی مارا اور بُرا بھلا کہتا ہوا چلا گیا۔

غرض یہ ہے کہ ارادہ وہ چیز ہے کہ اگر یہ نہ ہو تو آسان سے آسان کام بھی مشکل ہو جاتا ہے، اب بھی ہم لوگوں کے پاس سے کچھ نہیں گیا صرف ایک چیز گئی ہے وہ یہ کہ ہم اپنی دولت سے کہ اس میں ارادہ بھی ہے کام نہیں لیتے، باوجود دولت مند ہونے کے ہمارے وہ حالت ہے کہ۔

یک سبد پُرناں ترا برفرق سد
توہمی جوئی لب ناں دربدر

جیسے ایک شخص کے سر پر روٹیوں کا بڑا ٹوکرا رکھا ہو، اور وہ در بدر بھیک مانگتا پھرتا ہے، حضرات آپ کے پاس بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے اور پھر اجنبیا نہ ڈھونڈتے پھرتے ہو کہ کچھ بتلا دیجیے، مگر آپ چاہتے ہی نہیں اور بغیر آپ کے چاہے اور کام کیسے کچھ نہیں ہوسکتا، اور یہ جو حکایتیں مشہور ہیں کہ بعض اولیاء کو ایک دن میں سب کچھ مل گیا تو اس کی حقیقت سن لیجئے۔

حضرت شاہ ابوالمعالی رحمۃ اللہ علیہ کی اس قسم کی حکایت ہے کہ انھوں نے شاہ بھیک رحمۃ اللہ علیہ کو ایک دن میں سب کچھ دے دیا، مگر یہ غلطی ہے کہ ایک دن میں سب ہوگیا، بات یہ ہے کہ علت تامہ کا جز اخیر اس ایک دن میں پایا گیا، یہ نہیں کہ تمام اجزاء اسی دن میں پائے گئے، لوگ اس کو تو دیکھتے ہیں کہ ایک دن میں کامل کر دیا، یہ نہیں دیکھتے کہ اس ایک دن سے پہلے انھوں نے کتنی مشقت برداشت کی تھی، شاہ بھیک صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کیفیت تھی کہ ایک مدت دراز تک شیخ کی خدمت میں تکلیفیں اٹھائیں۔

ایک واقعہ ان کا یہ ہے کہ ایک مرتبہ شیخ ان پر خفا ہو گئے، اور فرمایا کہ ہمارے سامنے نہ آنا چنانچہ یہ حیران و پریشان انہٹہ کہ چاروں طرف پھرتے تھے اور امتثال امر کے سبب سامنے نہ آتے تھے اس میں یہ حال تھا۔

اریدوصالہ ویرید ھجری
فاترک ماارید لمایرید

یعنی میں ملنا چاہتا ہوں محبوب ملنا نہیں چاہتا، تو میں اپنی مرضی کو اس کی مرضی کے سامنے چھوڑ دیتا ہوں، عشق اسی کو کہتے ہیں، چنانچہ مدت تک سامنے نہ آئے، برسات کا موسم آیا، اور کثرت بارش سے شیخ کا مکان گر گیا، اب مکان بنانے کو مزدور کہاں سے آئے؟ کیونکہ ناداری اس قدر تھی کہ اکثر فاقہ کی نوبت آتی تھی ،سہارن پور کے لوگ دعوت کیا کرتے تھے تو حضرت شاہ بھیک صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس قدر جانثار خادم تھے کہ اہل وعیال کے لئے بعد عشاء کے پیادہ پا گنو پا انبہٹہ کھانا پہنچا کر تہجد کے وقت آ کر شیخ کو وضو کراتے، تو بی بی صاحبہ بولیں کہ یہ جتنے خادم یہاں پڑے ہیں سب اپنی غرض کے ہیں، ایک بیچارہ گوارسائل گیا تھا وہ کام کاج کر دیا کرتا تھا اسی کو آپ نے نکال باہر کیا آپ نے فرمایا کہ میں نے ہی تو نکالا ہے تم نے تو نہیں نکالا، تم بلالو میں کب منع کرتا ہوں، بات یہ ہے کہ دل سے تو نفرت نہیں تھی چنانچہ انہوں نے کہلا بھیجا کہ مکان گر گیا ہے اس کے بنانے کے لیے حضرت نے تمہارے بلانے کی مجھ کو اجازت دے دی ہے، یہ تو مشتاق تھے ہی فوراً حاضر ہوئے، مگر خوف کے مارے حضرت کے سامنے نہیں گئے۔

ایک دن چھت کوٹ رہے تھے کہ حضرت شاہ ابوالمعالی صاحب رحمۃ اللہ علیہ گھر میں کھانا کھانے تشریف لائے، کھانا کھاتے ہوئے ایک لقمہ ہاتھ میں لے کر حضرت شاہ بھیکؒ کو دکھایا کہ لے بھیکؒ یہ ایسے بے تاب ہوئے کہ فوراً چھت پر سے کود پڑے اور حاضر ہوئے شیخ نے منہ میں لقمہ دیا اور گلے سے لگا لیا اور خلعت خلافت عطا کیا۔

اس حکایت کو سن کر لوگ کہتے ہیں کہ ایک نظر میں کام ہو گیا، ایک دن میں کامل بنا دیا، مگر دیکھئے وہ ایک نظر کتنے دنوں میں ہوئی، ایک دیا سلائی میں لکڑی جل جاتی ہے، مگر خشک لکڑی ہو تو جل جاتی ہے، تو دیکھو اس کے خشک ہونے میں کتنا زمانہ صرف ہوتا ہے، اور اگر ایک موٹا تازہ درخت یہ سوچنے لگے کہ مجھ میں تو آگ لگتی ہی نہیں دیا سلائی جلاتی ہی نہیں تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا یہ خیال صحیح ہے، ہرگز نہیں، یہی کہا جائے گا کہ وہ لکڑی تو سوکھ چکی تھی اس میں رطوبت کم ہو گئی تھی اس لیے ایک دیا سلائی سے جل گئی، درخت میں رطوبتیں بہت ہیں، نیز موٹا بہت ہے اس لیے ایک دیا سلائی کافی نہیں۔

ایسے ہی جن کو ایک نظر کافی ہو گئی ہے خبر بھی ہے ان کے نفس پہلے سے کتنے صاف ہو چکے تھے، تمہارے نفوس موٹے ہو رہے ہیں، ان میں مادہ فاسد بہت بڑھ رہا ہے، اس لیے ایک نظر کافی نہیں ہو سکتی ہے، تو لوگوں کو یہ دھوکے ہو گئے ہیں، ایک دوسری غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ کوئی اس کو بہت مشکل سمجھ رہا ہے اس لیے اپنی اصلاح سے ہاتھ دھو بیٹھا، اور کوئی اتنا آسان سمجھے ہوئے ہے کہ صرف ایک نگاہ کا کام سمجھتا ہے حالانکہ ؎

صوفی نہ شود صافی تا درنہ کشد جامے

بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

یعنی جب تک جام الفت نوش کر کے خوب مجاہدات اور ریاضات نہ کرے اس وقت تک اصلاح اور تصفیہ حاصل نہیں ہو سکتا ہے۔

اور فرماتے ہیں ۔

شنیدم رہروے سرزمینے
ہمیں گفت ایں معمار باقرینے

ایک سالک کو سنا کہ اپنے ہم نشین سے یہ نقطہ بیان کر رہا تھا۔
کہ اے صوفی شراب اس وقت صاف اور عمدہ ہوتی ہے کہ چالیس دن تک شیشہ میں رکھی رہے۔

اور فرماتے ہیں۔

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن
دلبدست دیگرے دادن وحیراں
بودن

یعنی عاشقی کیا ہے محبوب کا بندہ ہو جانا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے کر خود حیران ہو جانا۔

سوئے زلفش نظرے گردن ورویش دیدن
گاہ کافر شدن وگاہ مسلمان بودن

اس کے زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرہ کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی رہنا۔

کافر ومسلمان ایک اصطلاح ہے، فنا کو کفر اور اسلام کو بقا سے تعبیر کرتے ہیں، اور فنا کی تجلی کو زلف اور بقا کی تجلی کو رخ سے تعبیر کرتے ہیں، بحر حال اس سے

معلوم ہوا کہ یہ کام نہ اتنا آسان ہے جتنا لوگ سمجھتے ہیں کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑے اور ایسا مشکل بھی نہیں ہے جس سے ڈر کر ہاتھ دھو کر بیٹھ جاویں۔

(دین ودنیا، خطباتِ حکیم الامتؒ ص ر ۷ ۳ تا ۴۳)

ہم لوگ نماز پڑھتے ہیں مگر کبھی اس طرف توجہ نہ ہوئی کہ نیت خالص ہے یا نہیں، اور اگر کسی کے کہنے سے توجہ ہوئی بھی تو یوں چاہتے ہیں کہ خود کچھ نہ کریں اپنے آپ اخلاص ہونے لگے، جب اس قدر بے توجہی ہے تو اَنُلْزِمُكُمُوْهَا وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ، کیا اپنی رحمت تمہارے سر چپکانا ہے، حالانکہ تم کو اس کی پرواہ بھی نہیں تو اخلاص اتنا آسان نہیں کہ بلا طلب بھی مل جاوے۔

چونکہ دین کے دو شعبے ہیں، ایک علم دوسرا عمل، تو جیسے عمل میں اخلاص ضروری ہے ایسے ہی علم میں بھی ضروری ہے، اب دیکھئے کہ تحصیل علم میں تمہاری کیا نیت ہوتی ہے، ایسے بہت کم ہیں کہ جن کی یہ نیت ہو کہ غیر مرضیات حق سے بچیں، اور خدا تعالی اس سے خوش ہوگا، جب علم میں اخلاص نہیں تو عمل میں کہاں سے آئے، اول علم میں اخلاص پیدا کرنا ضروری ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ اگر نیت خالص نہ ہو تو تحصیل علم ہی چھوڑ دو، نہیں پڑھنا تو بہر حال ضروری ہے، کیونکہ اگر تحصیل کے وقت اخلاص نہیں ہے تاہم امید ہے کہ علم حاصل کر لینے سے پھر کبھی پیدا ہو جائے گا اور اگر علم بھی حاصل نہ کیا تو یہ امید بھی نہ رہے گی اسی طرح اگر علم میں اخلاص نہ ہو، تاہم عمل نہ چھوڑو کہ کبھی عمل کرتے کرتے اس کی برکت سے بھی اخلاص پیدا ہو جاتا ہے، کیونکہ ان دونوں میں تجاذب بھی ہے، کبھی عمل سے بھی نیت درست ہو جاتی ہے، جیسا کہ علم سے اکثر یہ

بات ہو جاتی ہے تو اگر نیت خالص نہ ہوئی ہو تب بھی چھوڑ نہ دے، کیونکہ آئندہ حاصل ہو جانے کی تو امید ہے، بزرگوں کا قول ہے۔

تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَیْرِ اللّٰہِ، فَأَبَی الْعِلْمُ اِلَّا اَنْ یَّکُوْنَ لِلّٰہِ۔ علم ہم نے غیر اللہ کے لیے پڑھا تھا مگر وہ مانا ہی نہیں کہ وہ غیر اللہ کا ہو کر رہے لہذا وہ اللہ ہی کا ہو کر رہا ،ہم نے فقہ اس لیے سیکھی تھی کہ فتویٰ لکھیں گے، مفتی کہلائیں گے، یا حدیث پڑھتے ہیں تا کہ وعظ کہیں گے، لوگ ہم کو نظرانے دیں گے، دانت گھسائی دیں گے، یا بعضوں نے مباحثہ کے لیے پڑھا تھا کہ بڑی عزت ہوگی، مگر علم خدا ہی کا ہو کر رہا علم نے مانا ہی نہیں کہ وہ غیر کا ہو کر رہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مثلاً قران میں کوئی آیت وعید پڑھی جس میں علم سے دنیا کمانے کی مذمت تھی اور قلب میں ایک کھٹکا پیدا ہوا کہ میں بھی تو اسی مرض میں مبتلا ہوں ،تو اپنے کو ملامت کرتا ہے اور روتا ہے، پس اس طرح عالم باعمل ہو گیا، یہ ہے :ابی العلم الا ان یکون اللہ ،یعنی علم مانا ہی نہیں ، بجز اس کے کہ وہ اللہ ہی کا ہو کر رہے، یا علم سے کبھی نہ کبھی اخلاص ہو ہی جاتا ہے۔

اس لیے اول تو اس کی کوشش کرنا چاہیے کہ پہلے ہی سے تحصیل علم نیت خالص ہو، اور اگر کسی کی نیت ابھی خالص نہ ہو تو اس کو چھوڑنا ہر گز نہیں چاہئے ،امید ہے کہ کبھی اخلاص حاصل ہو جائے گا ،اسی لیے اہل اللہ کہتے ہیں اگر ایک شخص کام کرتا ہے گو ریاء ہی سے ہو اس شخص سے اچھا ہے جو کام کرتا ہی نہیں، کیونکہ کبھی نہ کبھی ریاء بھی جاتی رہے گی اور عمل رہ جاوے گا ،مثلاً کوئی شخص ذکر کرتا ہے تو دوسرا آدمی

اس کو ریاء کار کہے تو اس سے کہا جائے گا کہ میاں تم نے تو ریاء کے لیے بھی نہ کیا، تم کس منہ سے طعن کرتے ہو سوداؔ نے کیا خواب کہا ہے ؎

سوداؔ قمار عشق میں شیریں سے کوہکن
بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا
کس منہ سے اپنے آپ کو کہتا ہے عشق باز
اے رُوسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

تو کرنے والا نہ کرنے والے سے پھر بھی اچھا ہے، البتہ اگر کرنے والوں کی یہ شکایت ہے کہ نیت کو خالص کرنا بھی تو فرض ہے اسے کیوں چھوڑ رکھا ہے، مثلاً ایک شخص بے چبائے کھانا کھاتا ہے تو اس سے یہ نہ کہا جائے گا کہ کھاتے کیوں ہو؟ ہاں یہ ضرور کہا جائے گا کہ اچھی طرح چبا کر کیوں نہیں کھاتے، بعض لوگ نماز نہیں پڑھتے کہ جیسی پڑھنی چاہیے ویسی تو ادا ہوتی نہیں، پھر پڑھنے سے کیا فائدہ، سو یہ لوگ سخت غلطی میں مبتلا ہیں، کیا اگر کوئی کام اچھی طرح نہ ہو سکے تو اس کو بالکل بھی نہ کرنا چاہیے، اگر ایک لڑکا تختی لکھنا چھوڑ دے کہ اچھا تو لکھا نہیں جاتا کیا کوئی اس عذر کو مانے گا؟ ہرگز نہیں، بلکہ اسے کہا جائے گا کہ تو خراب ہی لکھتا رہ کبھی نہ کبھی خط عمدہ ہو ہی جائے گا، ویسے ہی یہاں بھی سمجھ لو۔

# ارادہ اور طلب سچی ہو تو ایک دن ضرور منزل ملے گی

فرمایا: رہا یہ کہنا کہ جیسی ہونی چاہئے ویسی ادا نہیں ہوسکتی، یعنی ناممکن ہے، یہ بھی غلط ہے، ضرور ہوسکتی ہے، شریعت میں کوئی ایسا کام نہیں کہ نہ ہوسکے، ہاں ارادہ اور طلب پہلی شرط ہے، اب میں ایسے لوگوں کو جو یہ کام نہیں کرتے کہ عمل کامل تو ہوتا نہیں پھر کیا کام کریں، ایک بات سناتا ہوں کہ جس کو آپ کامل سمجھتے ہیں اس کی توفیق کے بعد بھی چونکہ اس وقت نظر صحیح ہوگی، اب اس کو ناقص ہی دیکھیے گا، بہرحال کام کیے جاؤ کامل ہو خواہ ناقص ہو انشاء اللہ ناقص ہی سے کامل ہوجائے گا۔

دیکھو! ایک شخص نے لکھنا شروع کیا اور خراب جیم لکھی گئی اور میر پنجا کش کی جیم دیکھ کر مایوس ہوگیا تو اس سے یہی کہا جائے گا کہ ابتداء ابتداء میں انتہا پر نظر نہیں کیا کرتے، جیسا کچھ ہے کیے جاؤ، ہوتے ہوتے کام ہوتا ہے، ایک دم سے نہیں ہوجاتا۔

اندریں رہ می تراش و می خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش

اسی ادھیڑ بُن میں لگے رہو آخر دم تک فارغ ہوکر مت بیٹھو۔

تادمِ آخر دمے آخر بود
کہ عنایت باتو صاحب سربود

آخری وقت تک تو کوئی گھڑی آخر ایسی ضرور ہوگی جس میں عنایت ربانی تمہاری ہم راز ورفیق بن جاوے گی، کام کیے جاؤ کسی نہ کسی روز انشاء اللہ فضل ہو جاوے گا، حافظ علیہ رحمۃ کہتے ہیں۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزے گلستاں غم مخور

یعنی یوسف گمشدہ کنعان میں واپس آجائیں گے، غم مت کرو فکر نہ کرو، کسی روز رنج والم کی کوٹھری چمن ہو جائے گی، یعنی کام اور طلب میں لگے رہو غمگین نہ ہو، انشاء اللہ تعالیٰ کسی روز فضل ایزدی بھی ہو جائے گا۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/ ۴۶ تا ۵۰)

## ذکر کرتے وقت نیت اور مقصود کیا ہونا چاہئے

ہمارا طالب ثمرات ہونا خلاف عبدیت ہے، اور اسی طرح یہ دیکھنا کہ میں اتنے دنوں سے کام کر رہا ہوں کچھ ملا بھی یا نہیں، خلاف اخلاص بھی ہے، کیونکہ ثمرات عاجلہ کا طالب ہونا ہے۔

اصلی غرض ذکر وغیرہ سے محض رضائے حق ہو، یعنی صرف یہ نیت ہو کہ اس سے خدا راضی ہوگا، اس کے خلاف جب کوئی نیت ہوگی گو وہ امر دنیوی نہ ہو، مثلاً ثمرات باطنہ واخلاص کے خلاف ہوگی، حضرت حافظ ضامن صاحب شہید رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ۔

ترجمہ: تم مجھے یاد کرو میں تمہیں یاد کروں گا۔

تو ہماری تو نیت ذکر کرنے سے یہ ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کے دربار میں ہمارا ذکر ہوگا، یہ وہ غرض ہے کہ شیطان اس میں کسی قسم کا وسوسہ بھی نہیں ڈال سکتا، کہ شاید حق تعالیٰ تم کو یاد نہ کریں، کیونکہ اس کا تو قرآن میں صریح وعدہ ہے، میں اسی تقریر کو دوسری طرح کہتا ہوں کہ ثمرات دو قسم کے ہیں، ایک وہ جو موعودہ ہیں، جیسے تمہارے ذکر اللہ کرنے سے اللہ تعالیٰ کا تم کو یاد فرمانا اس کا طالب ہونا تو مضمون نہیں، بلکہ مطلوب ہے، دوسرے وہ جو موعود نہیں، جیسے کیفیات واحوال اس کے طلب کرنے میں یہ کوتاہی ہے کہ جو موعود نہیں تو اس کا طالب کیوں ہے، اور جب مطلوب نہیں تو مقصود کیوں بنایا جائے، حاصل یہ کہ اور غرضوں کا مل جانا یہ بھی اخلاص کے خلاف ہے، طالب کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے کہ ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہرچہ کنی رضائے تو

یعنی زندہ رکھیں آپ کی عنایت ہے، اگر قتل کرے آپ پر قربان ہیں، دل آپ پر فریفتہ ہو گیا، جو کچھ ہمارے ساتھ تصرف کریں، ہم راضی ہیں، اس کی تو یہ شان اور یہ کیفیت ہونی چاہئے جو حضرت سرمد فرماتے ہیں۔

سرمد گلہ اختصار می باید کرد
یک کار ازیں دو کار می باید کرد
یا تن برضائے دوست می باید داد
یا قطع نظر زیارے می باید کرد

یعنی سرمد گلا شکوہ چھوڑنا چاہئے ، دو کاموں میں سے ایک کام کرنا چاہئے ، یا تو اس کی رضاجوئی میں جان دے دو، نہیں تو یاری کو چھوڑ دینا چاہئے۔

بیشک صاحب باطن کو ایسا ہی ہونا چاہئے ۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تم بندگی مزدوروں کی طرح بشرط اجرت مت کرو ، اس لیے کہ آقا بندہ پروری کی روش کو خود جانتے ہیں ، یعنی کیفیات واحوال کے لیے اطاعت مت کرو، خدا کی رضاجوئی کے لیے کرو۔

غرض کیفیات واحوال سب خدا کے قبضہ میں ہیں ، تم اپنا کام کیے جاؤ، اور غیر اختیاری امور کی فکر میں نہ پڑو۔

بحر حال اخلاص کی حقیقت تو سمجھ میں آ گئی کہ کوئی غرض نفسانی اپنی نہ ہو صرف رضاء حق مطلوب ہو۔

## اخلاص کو حاصل کرنے کا طریقہ

اب اس کے حاصل کرنے کا طریقہ اور علاج سمجھئے ! وہ یہ کہ جب کوئی کام کرنا ہو تو پہلے یہ دیکھ لیجئے کہ میں یہ کام کیوں کرتا ہوں ، اگر کوئی نیت فاسد ہو تو اس کو قلب سے نکال ڈالیے ، اور نیت خالص خدا کے لیے کرنی چاہئے ، اس علاج کی آسانی کے لیے بہتر یہ ہے کہ مخلصین کی حکایات دیکھا کریں ، اس سے بہت اثر ہوتا ہے ، چنانچہ مولانا نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ایک حکایت بیان فرمائی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت علی نے ایک یہودی کولڑائی میں زیر کیا، اور سینہ پر بیٹھ کر قصد کیا کہ خنجر سے ذبح کر دیں، یہودی نے چہرہ مبارک پرتھوک دیا، آپؓ نے فوراً چھوڑ دیا، یہودی نے حیران ہوکر پوچھا کہ آپؓ نے چھوڑ کیوں دیا؟ اب تو میں اور زیادہ قابل قتل تھا، فرمایا میں پہلے خالصاً للہ قتل کرتا، اور اب نفس کی بھی آمیزش ہو جاتی ہے اس لیے میں نے چھوڑ دیا، یہودی فوراً مسلمان ہوگیا، حقیقت میں یہ ہے اخلاص اگر اسی حکایت کو یاد رکھیں تو کافی ہے۔

دوسرے اہل اخلاص کی محبت اختیار کیجئے، ان کے اقوال اور افعال پر نظر کیجئے، تو انکھیں کھل جاویں گی، مجھے دو حکایتیں یاد آ گئی ایک بلگرام کی، کہ وہاں ایک بزرگ تھے، ان سے ایک شخص کچھ پڑھتے تھے، ایک دن جو پڑھنے آئے تو دیکھا کہ استاد کچھ مضمحل ہورہے ہیں اس روز ان کے گھر میں فاقہ تھا، یہ شخص باادب تھے، استاد پر فاقہ کا اثر دیکھ کر پڑھنے سے عذر کر دیا، اور اپنے گھر جا کر کچھ کھانا ان کے لیے لائے، ان بزرگ نے فرمایا کہ یہ کھانا ایسے وقت آیا کہ مجھے اس کی ضرورت ہے، مگر مجھے اس کے لینے سے معاف کرو، کیونکہ اس وقت اس کا قبول کرنا حدیث کے خلاف ہے، کیونکہ حدیث میں آیا ہے: ما اتاک من غیر اشراف نفس مخذوہٗ۔

یعنی جو چیز تمہارے پاس بلا انتظار نفس آجائے اس کو لے لو، تو جب تم میرے پاس سے گئے ہو اس وقت میرے دل میں یہ خطرہ گزرا تھا کہ تم کچھ لاؤ گے، یہ آدمی سلیقہ مند تھے کچھ بھی اصرار نہیں کیا، اور کھانا لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، جب ان کی نگاہ سے دور ہو گئے تو پھر لوٹے اور آ کر عرض کیا اب تو یہ کھانا لینا آپ کو

حدیث کے خلاف نہ ہوگا، کیونکہ جب میں لے کر چلا ہوں اس وقت تو آپ کو مایوسی ہوچکی تھی وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اوران کودعائیں دیں۔

(خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۶۳ تا ۶۷)

## کسی حال میں بھی باطل کوحق میں نہ ملاؤ

ہرزمانہ میں حق کو باطل سے ممتاز کردیا جائے، کیونکہ زمانہ نبوت سے بُعد ہو جانے کی وجہ سے بعض دفعہ حق و باطل مختلط ہوجاتا ہے،خواہ عوام کی بے تمیزی سے یا اہل غرض علماء کی وجہ سے،تو ایسے وقت میں حق تعالیٰ کسی ایسے مقبول بندے کو پیدا فرماتے ہیں جوحق کو باطل سے ممتاز کر کے صراط مستقیم کو واضح کردیتا ہے، یہ درجۂ تجدید ہے، اس کے متعلق حدیث میں پیشین گوئی ہے:ان اللہ یبعث فی امتی علیٰ رأس کل مئة من یجدد لھا دینھا ۔کہ حق تعالیٰ میری امت میں ہرسو برس کے بعدایک ایسے شخص کومبعوث فرماتے ہیں جو دین کی تجدید کردیتا ہے،یعنی حق کو باطل سے ممتاز کردیتا ہے، چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہرصدی پرکوئی نہ کوئی مجددضرور رہا ہے۔

تو یہ دو درجے اب بھی باقی ہیں اور قیامت تک رہیں گے، ایک تفریع ایک تجدید،اور یہ دونوں خدمتیں الگ الگ ہیں،اوراگرکوئی اللہ کا بندہ دونوں کا جامع ہو تو یہ خداتعالی کی رحمت ہے۔

اوریہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جولوگ قرآن کوتراویح میں اجرأت لے کرسناتے ہیں اس میں علاوہ فقہی گناہ کی بے غیرتی بھی کس قدر ہے کہ قرآن کو جو

خدا تعالیٰ کا کلام ہے ادنیٰ سی اجرأت کے معاوضہ میں سناتے پھریں، اور یہ ساری بے قدری اس لیے ہے کہ قرآن سستا مل گیا اس دولت کے حصول میں ہم کو کچھ خرچ کرنا نہیں پڑا، اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

حضرت ابراہیم ابن ادہم رحمۃ اللہ علیہ جب کسی فقیر کو فقر و فاقہ کی شکایت کرتے ہوئے دیکھتے تو فرمایا کرتے کہ تم اس کی قدر کیا جانو، تم کو گھر بیٹھے یہ دولت مل گئی ہے، اس کی قدر ابراہیم بن ادھمؒ سے پوچھو! جس نے سلطنت بیچ کر اس کو خریدا ہے۔

اسی طرح ہم نے ایمان کی دولت کو ماں باپ سے لیا ہے، بے محنت و مشقت ہم کو مل گئی ہے، اس لیے اس کی بے قدری ہے، ورنہ خدا کا نام وہ چیز ہے جس کے مقابلہ میں تمام دنیا ہیچ ہے، کیونکہ جنت کی سلطنت اسی کے عوض میں ملے گی، جس کے سامنے دنیا کی ہزار سلطنتیں بھی گرد ہیں، مگر افسوس آج کل دو پیسہ کے برابر بھی خدا کے نام کی قدر نہیں، چنانچہ وہ عہدہ دار اپنی بیوی سے پوچھتے ہی تھے کہ تجھ کو نماز سے کیا ملا وہ تو ملنا اس کو سمجھتے تھے جیسے ایک شخص کو ملا کرتا تھا۔

قصہ یہ ہے کہ ایک عہدہ دار رشوت لیا کرتے تھے، اور نماز کے بھی بہت پابند تھے، حتیٰ کہ فجر کی نماز کے بعد اشراق تک وظیفہ بھی پڑھا کرتے تھے، اور یہی وقت مقدمہ والوں سے رشوت طے کرنے کا تھا، مقدمہ والے آتے اور اشاروں سے رشوت کی رقم طے ہوتی تھی، کیونکہ پیر نے وظیفہ میں بولنے سے منع کر رکھا تھا، بس وہ اشاروں سے سو کہتا اور یہ دو انگلیاں اٹھا دیتے کہ ۲۰۰ لوں گا، پھر اشاروں

ہی سے کوئی رقم طے ہو جاتی تو یہ مصلے کا کونا پکڑ کر اٹھا دیتے کہ یہاں روپیہ رکھ دو ، پھر کوئی دوسرا آتا اور اس سے بھی یوں ہی گفتگو ہوتی غرض یہ ظالم اشراق پڑھ کر کئی سو روپے لے کر اٹھتا۔

## دعا کے ذریعہ دنیا مانگنا صحیح ہے مگر وظیفہ کے ذریعہ جائز نہیں

فرمایا: ایک تو دنیا کے واسطے خدا تعالیٰ سے دعا کرنا اور دعا کے ذریعے سے مانگنا یہ مذموم نہیں ہے، بلکہ یہ تو شانِ عبدیت ہے، اور ایک وظیفہ پڑھ کر مانگنا یہ مذموم ہے، اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے وہ یہ کہ دعا کر کے مانگنے میں ایک ذلت کی شان ہے، اور یہ اس مقصود کے موافق ہے جو بندوں کے پیدا کرنے سے اصل مقصود ہے، جس کو حق تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: **وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔**

اسی لیے حدیث میں ہے: الداعاء مخ العبادۃ، کہ دعا عبادت کا مغز ہے، اور میں نے عبادت کو جو اصل مقصود کہا ہے اس میں اصل کی قید اس واسطے لگائی کہ کوئی یوں نہ سمجھے کہ کھانا کمانا اور دنیا کے کاروبار کرنا ناجائز ہے، سو خوب سمجھ لو کہ یہ ناجائز نہیں بلکہ جائز ہے، بلکہ ایک درجہ میں مطلوب بھی ہے، مگر اصل مقصود نہیں بلکہ تابع مقصود ہے۔

اب سمجھئے کہ دعا میں ایک خاصہ ہے، جس کی وجہ سے دعا کر کے دنیا مانگنا جائز ہے، اور وظیفہ میں وہ بات نہیں، اس لیے مذموم ہے، دعا کی حقیقت وہ ہے جو

عبادت کی روح ہے، یعنی تذلل و اظہار احتیاج اور یہ وہ چیز ہے کہ اگر کوئی سادہ طبیعت آدمی کسی بادشاہ یا امیر کو دعا کرتے دیکھے اور دعا کے وقت جو عاجزی کے الفاظ وہ کہہ رہا ہے وہ سنے تو اس کو حیرت ہو جائے گی کہ اللہ یہ شخص بھی اتنا محتاج ہے، جو اس عاجزی سے اپنی احتیاج کو ظاہر کر رہا ہے۔

اکبر بادشاہ کی حکایت ہے کہ ایک دفعہ شکار میں وہ کسی طرف راستہ بھول کر جا نکلا، وہاں ایک دیہاتی زمیندار تھا، اس نے بادشاہ کو پہچانا تو نہیں، مگر اپنی کریم النفسی سے اس کی خوب خاطر مدارات کی، اکبر بہت خوش ہوا، تھوڑی دیر میں لشکر بھی آملا، تب دیہاتی کو معلوم ہوا کہ یہ تو بادشاہ تھا، اکبر نے چلتے وقت کچھ دیا بھی، اور کہہ دیا کہ جب یہ ختم ہو جاوے ہمارے پاس پھر آنا اور دربانوں سے کہہ دیا کہ یہ جب آوے روکنا نہیں۔

چنانچہ ایک بار وہ آپہنچا، اور اس کو محل میں پہنچا دیا گیا، اتفاق سے اکبر اس وقت نماز پڑھ رہے تھے، اس دیہاتی کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ بادشاہ ہو کر کسی کے سامنے جھک رہا ہے، جب اکبر نماز سے فارغ ہوئے اور ہاتھ اٹھا کر دعا کرنے لگے تو دیہاتی کو اور بھی حیرت ہوئی کہ یہ کس سے مانگ رہا ہے، آخر جب وہ دعا سے فارغ ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئے تو دیہاتی نے پوچھا کہ تم کس کے سامنے جھکتے اور کس سے ہاتھ پسار کر مانگ رہے تھے، اکبر نے کہا کہ میں خدا تعالیٰ کی عبادت کر رہا تھا اور اس سے اپنی حاجتیں مانگ رہا تھا، یہ سن کر دیہاتی پر ایک حالت طاری ہوئی، اور کہنے لگا کہ جب خدا تمہاری حاجت پوری کر سکتا ہے تو کیا میری حاجت پوری نہ کرے گا، بس میں اب تم سے کچھ نہیں مانگتا میں خدا ہی سے مانگوں گا۔

توصاحبو! دعا کا یہ رنگ ہے جس سے سراسر احتیاج اور عاجزی ٹپکتی ہے، اور وظیفہ میں یہ بات نہیں، بلکہ اکثر تو یہ ہے کہ وظیفہ پڑھ کر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وظیفہ کے زور سے ہمارا مقصود ضرور حاصل ہوگا، تو اس حالت میں عجز واحتیاج کہاں، پس دنیا کے واسطے وظیفہ پڑھنا اور دنیا کے لیے دعا کرنا برابر نہیں۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/۸۰ تا ۸۴)

اسی لیے اگر کوئی دنیا کے واسطے دعا مانگے اور یوں کہے کہ اے خدا! مجھے سو روپے دے دیجیے، تو یہ جائز ہے، بلکہ اس میں بھی وہی ثواب ہے جو آخرت کے لیے دعا کرنے میں ہے، بشرطیکہ دعا ناجائز کام کے لیے نہ ہو، کیونکہ دنیا کے لیے ہر دعا جائز نہیں، بلکہ جو شریعت کے موافق ہو وہی جائز ہے، مثلاً کوئی شخص ناجائز ملازمت کے لیے دعا مانگے تو یہ جائز نہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے حاکم کے ہاں ایک تو تحصیل داری کی درخواست دینا، اور ایک ڈکیتی کی درخواست دینا، ظاہر ہے کہ جس کام کو حاکم نے ممنوع قرار دے دیا، اس کی درخواست حاکم سے کرنا اور حاکم کو اس کے حصول کا ذریعہ بنانا بھی ممنوع ہوگا، تو جو دعا حدودِ شرعیہ سے باہر ہو وہ تو پسندیدہ ہے ہی نہیں، پھر اس کو پیش کرنا کیوں کر جائز ہوسکتا ہے، آج کل لوگ اس کی بھی رعایت نہیں کرتے کہ دعا شریعت کے موافق ہو۔

واقعی بات یہ ہے کہ ہم لوگ بڑی غفلت میں ہیں، جس کی وجہ زیادہ تر بے عملی ہے، ہم لوگ بعض دفعہ خدا تعالیٰ سے ایسی چیزیں مانگتے ہیں جو خدا تعالیٰ کو

ناپسند ہیں، چنانچہ اس وقت بہت سی ایسی نوکریاں ہیں جو ناجائز ہیں، اوران کے لیے دعا کرائی جاتی ہے، اوراگر وہ مل جائے تو مبارکباد دی جاتی ہے، افسوس کس کس بات کی اصلاح کی جائے۔

تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم

اورغضب یہ ہے کہ ایسی ناجائز ملازمتوں کے لیے اہل اللہ سے جا کر دعا کرائی جاتی ہے اوراس سے بڑھ کر یہ کہ مردوں کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ آپ ہمارا یہ کام کر دیجیے! گویا ساراا ختیار ان کے ہاتھوں میں ہے۔

حضرت مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا، اور کہنے لگا کہ حضرت میرا یہ کام کر دیجئے! شاہ صاحب نے فوراً حکم دیا کہ نکالو اس مشرک کو، یہ مجھ سے کہتا ہے کہ میرا کام کر دیجئے، ارے کیا تیرا کام کر دینا میرے اختیار میں ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۸۴ تا ۸۵)

# خدا سے تعلق قائم کرنے کیلئے دنیا کے

## کاموں سے فراغت کا انتظار ہرگز ہرگز مت کرنا

مولانا نے ایک حکایت لکھی ہے کہ ایک آلودۂ نجاست دریا پر سے گزرا ، دریا نے کہا کہ آ میرے اندر چلا آ، اس نے جواب دیا کہ میں ناپاک اور تو پاک وصاف، میں تجھ تک کیسے آؤں ، پاک ہوکر آؤں گا، دریا نے ہنس کر کہا کہ اے بیوقوف، پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے، کہ تو اسی حالت میں میرے پاس چلا آ، مجھ سے دور رہ کر تو پاک ہی نہیں ہوسکتا، ایک بار تو ناپاکی کی حالت ہی میں چلا آنا، پھر پاک ہوکر بھی آنا نصیب ہوگا ،اور جو اس انتظار میں رہا کہ پہلے پاک ہولوں پھر پانی کے پاس جاؤں گا تو عمر بھر نہ تجھے پاکی نصیب ہوگی نہ پانی کا قرب نصیب ہوگا۔

صاحبو! اسی طرح خدا تعالیٰ کے دربار میں آنے کے لیے تم اس کا انتظار نہ کرو ، کہ پہلے دنیا کے جھگڑوں سے فارغ ہولیں، پھر یکسو ہوکر خدا کی یاد میں لگیں گے ، کیونکہ یوں تو ساری عمر گزر جائے گی اور تم کو خدا کے ساتھ علاقہ نصیب نہیں ہوگا، یہ شیطانی اغوا ہے کہ اس نے علم کے پیرایہ میں جہل کے اندر مبتلا کر رکھا ہے، کہ عام لوگوں کو یہ پٹی پڑھادی ہے کہ بیٹے بیٹیوں کی شادی کر کے بہت سی جائیداد اور روپیہ حاصل کر کے پھر اللہ کی یاد میں لگنا، اس وقت تو دل میں دنیا کی گندگیوں سے ملوث ہے، ان سے پاک ہوکر آنا، مگر ان لوگوں کو عمر بھر بھی خدا کی یاد نصیب نہیں

ہوتی ، کیونکہ دنیا کے تعلقات بدون خدا سے علاقہ پیدا کئے قطع ہو ہی نہیں سکتے ، دنیا کے کاموں کی یہ حالت ہے کہ۔

لاینتہی ارب الا الی ارب۔

ان کی انتہا ہی کہیں نہیں ہے ایک کام کے بعد دوسرا کام نکلتا چلا جا تا ہے، بس ان لوگوں کی ہمیشہ وہ حالت رہتی ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
بازچوں فردا شودا امروزرا فردا کنم

روز یہی کہتے رہتے ہیں کہ کل کو یہ کام چھوڑ دیں گے،مگر جب کل ہوتی ہے پھر وہی حال ہوجا تا ہے،تو صاحبو! اس کا انتظار نہ کیجئے آپ جس حال میں ہیں اسی حال سے چلے آیئے ، دور رہ کر پاک ہونے کا انتظار نہ کیجئے ، پاک ہونے کا بھی طریقہ یہی ہے کہ ایک بار ناپا کی کی حالت ہی میں آجایئے اس لیے فرماتے ہیں۔

بازآ بازآ ہرآنچہ ہستی بازآ
گرکافرو گبروبت پرستی بازآ
ایں درگہ مادرگہ نومیدی نیست
صدبار اگر توبہ شکستی بازآ

انشاءاللہ خدا کے دربار میں حاضر ہونے سے بہت جلد یہ دلدر دھل جاوے گا،اور ایک دن یوں ہی بیڑا پار ہوجائے گا۔

# اللہ کے ولی خود کو سارے جہاں سے ذلیل سمجھتے ہیں

فرمایا: بہت سے لوگ بزرگوں کے پاس اسی خیال سے نہیں جاتے کہ یہ دنیا کا پاخانہ لے کر ان کے پاس کیا جاویں، وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

صاحبو! اس کا وسوسہ ہرگز نہ لاؤ، وہ حضرات تخلقوا باخلاق اللہ، سے متصف ہوتے ہیں، وہ کسی آنے والے کو حقیر نہیں سمجھتے، وہ عیب پوش اور کریم النفس ہوتے ہیں، بلکہ بخدا ان کی نظر میں اپنے سے زیادہ کوئی بھی ذلیل نہیں ہوتا، پھر وہ کسی کو نظر حقارت سے کیا دیکھتے، اس لیے تم اس ناپا کی سمیت ہی ان کے پاس چلے آؤ۔

مجھے ایک صاحب کی حالت تو نہیں مگر اس کی بنا بہت ہی پسند آئی، وہ جونپور سے میرے پاس بیعت ہونے آئے تھے، اور اس حال سے آئے کہ پاجامہ ٹخنوں سے نیچے اور داڑھی منڈی ہوئی، موچیں خوب بڑھی ہوئیں، اور آ کر مجھ سے اپنے سب حالات کہہ دئے، پھر بیعت کی درخواست کی، میں نے بعد مغرب کا وقت مقرر کر دیا، وہ دن جمعہ کا تھا، بھلے مانس نے اس دن بھی حجامت بنوائی، تو جو کچھ بال داڑھی کے نکل آئے تھے وہ بھی منڈوا دئے، یہ حرکت مجھے بہت ناگوار ہوئی، کہ ہاں آ کر بھی انہوں نے اس گناہ کو نہ چھوڑا، مگر بعد نماز جمعہ کے انہوں نے اپنے اس فعل کی جو بناء بیان کی اس پر مجھے وجد آ گیا، کہنے لگے کہ غالباً آپ کو آج میرا داڑھی منڈانا ناگوار ہوا ہوگا، میں نے کہا بے شک، کہنے لگے کہ خیال مجھے بھی ہوا تھا

کہ آپ کو ناگوار ہوگا، مگر میں نے چاہا کہ طبیب کے سامنے اپنے مرض کی اصلی حالت صاف صاف ظاہر کردوں، اس لیے میں نے اس شکل سے اپنے آپ کو پیش کر دیا، اب آپ جو تصرف چاہیں مجھ میں فرمائیں، میں سب کے لیے حاضر ہوں۔ (خطباتِ حکیم الامتؒ ص ۸۸ تا ۹۱)

## جو مستقل مزاج ہوتا ہے وہی کامیاب ہوتا ہے

گو وہ فعل مجھے ناگوار ہوا، مگر اس بناء کی قدر ہوئی، اور معلوم ہوگیا کہ اس شخص پر صدق کا حال غالب ہے، وہ بوجہ جہل کے بری طرح ظاہر ہوا، مگر واقعی میں اس کے صدق کی قدر کرتا ہوں اور یہ ایسی قدر ہے جیسے حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک چور کی قدر کی تھی۔

انہوں نے ایک شخص کو سولی پر لٹکا ہوا دیکھا تھا، ساتھ والوں سے پوچھا کہ اس کو سولی کیوں دی گئی؟ لوگوں نے کہا کہ حضرت یہ بڑا پکا چور تھا، ایک بار اس نے چوری کی تو دایاں ہاتھ کاٹا گیا، پھر بعض نہ آیا اور دوبارہ چوری کی تو بایاں پیر کاٹا گیا، پھر بعض نہ آیا تو قید کر دیا گیا، اس نے قید خانہ میں بھی چوری کی تو حاکم نے سولی کا حکم دے دیا، یہ سن کر حضرت جنید بغدادیؒ نے دوڑ کر اس کے قدم چوم لیے، اہل ظاہر نے اعتراض کیا کہ آپ ایک ایسے پکے چور کے قدم چومتے ہیں، فرمایا: میں نے چور کے قدم نہیں چومے، بلکہ اس کے استقلال کے قدم چومے ہیں، کہ وہ جیسا بھی کچھ تھا اپنی طلب کا پکا تھا، اس کا محبوب گو کیسا ہی برا تھا، مگر اس نے اس کے پیچھے جان دے دی اس کا یہ حال تھا کہ ۔

دست از طلب ندارم تا کامِ من برآید
یاتن رسد بجاناں یاجاں زتن برآید

میں اس کے استقلال کی قدر کرتا ہوں۔

اے لوگو! اگر ہم کو حق پر ثابت قدم رہنے میں ایسا استقلال حاصل ہو جائے تو ہمارا کام بن جائے، دیکھیے حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے اس شخص کے استقلال کی قدر کی، گو اس استقلال کی صورت بُری تھی، اسی طرح گو ان صاحب نے ایک بری حرکت کی کہ داڑھی منڈائی، مگر یہ حرکت چونکہ صدق پر مبنی تھی، اس لیے مجھے اس کی قدر ہوئی، کیونکہ ایسے سچے اور صاف دل آدمی سے یہ امید قوی ہوتی ہے کہ وہ بیعت کے وقت جو کچھ اقرار کرے گا سچے دل سے کرے گا، پھر اس کے خلاف نہ کرے گا، چنانچہ ان صاحب نے تھانہ بھون سے جا کر پھر عمر بھر داڑھی نہیں منڈائی، بلکہ ایک وقت میں ان کی اتنی بڑی داڑھی ہوگئی تھی کہ دیکھنے والے پہچانتے بھی نہ تھے کہ یہ وہی شخص ہے جو پہلے بالکل آزاد رند تھا، غرض وہ پورے نیک صالح بن گئے، بات یہ ہے کہ صفات حمیدہ ہر حال میں حمیدہ ہیں، جس میں کوئی صفت حمیدہ ہوتی ہے گو ایک وقت میں بری صورت سے اس کا ظہور ہو رہا ہو، مگر جب اصلاح ہوگی تو کامل ہوگی خوب سمجھ لو۔

تو میں کہتا ہوں کہ آپ کو اس شخص کی طرح گندگی اور بدحالی ہی میں اپنے کو کسی بزرگ کے سپرد کر دینا چاہیے، اس کا خیال نہ کیجئے کہ اس صورت سے ہم بزرگوں کے پاس کیسے جائیں۔

یہ گفتگو اس پر چلی تھی کہ گو بعض دفعہ اہل اللہ کو دعائے مغفرت سے بھی شرم آتی ہے، مگر وہ اس سے رکتے نہیں، بلکہ وہ دل کو سمجھاتے ہیں کہ شرم کس سے کریں، اگر اسی شرم میں رہیں اور خدا تعالیٰ سے دعا نہ کی تو یہ ناپا کی کیوں کر دھلے گی ،تو جب وہ حضرات امور مباح کی دعا سے بھی شرماتے ہیں گو اس پر عمل نہ کریں تو آپ یہ ناجائز کاموں کے لیے تو کیوں دعا کی ہمت کریں گے، اس لیے زندہ یا مردہ بزرگوں سے ایسی دعائیں کرانا محض بے سود اور صرف ان کو تکلیف دینا ہے، پس ناجائز دعائیں تو مستثنٰی ہیں، رہی جائز دعا چاہے دنیا ہی کی کیوں نہ ہو وہ تو عبادت ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ، دعا عبادت کا مغز ہے، کیونکہ دعا میں تذلل اور عاجزی کی شان ہوتی ہے، دعا کرنے والا اپنے کو ذلیل و محتاج سمجھ کر دعا کرتا ہے۔

## وظیفہ پڑھنے سے ثواب نہیں ملتا مگر دعا خواہ

### دنیا کیلئے ہو ثواب ملتا ہے

بخلاف اس کے جو وظیفہ پڑھتا ہے اس کی حالت تذلل کی نہیں ہوتی بلکہ اس کی حالت دعوے کی ہوتی ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ وظیفہ سے کامیابی ضروری ہے، ان کے مکالمات سے یہ بات ظاہر ہے، چنانچہ وہ کہا کرتے ہیں کہ حضرت ایسا وظیفہ بتلایئے کہ تیر ہدف ہو، اور اگر کسی وظیفہ کی نسبت یہ لکھ دیا جائے کہ یہ مجرب ہے تو اس پر ایسا بھروسہ ہو جاتا ہے کہ گویا تخلف ہوگا ہی نہیں، تو چونکہ اس میں دعویٰ کی شان ہے اس لیے یہ ناپسند ہے، مگر آج کل اکثر لوگ دعا کو چھوڑ کر وظائف پڑھتے

ہیں، گوان کا پڑھنا جائز تو ہے، اگر ان میں کوئی بات خلاف شریعت نہ ہو، مگر اس میں ثواب کچھ نہ ہوگا، کیونکہ ثواب کے لیے یہ قاعدہ ہے: انما الاعمال بانیات، اور وظائف میں ثواب کی نیت نہیں ہوتی بلکہ محض دنیا ملنے کی نیت ہوتی ہے، اس لیے ثواب کچھ نہ ہوگا، بخلاف دعا کے، کہ وہ اپنی ذات سے عبادت ہے، حتیٰ کہ اس میں اگر دنیا مانگی جائے تب بھی شریعت اس کو عبادت کہتی ہے، چنانچہ خود شریعت نے اس کو دنیا مانگنے کا طریق تجویز فرمایا ہے، پس دنیا کی نیت کرنا دعا کے منافی نہیں، کیونکہ احادیث میں دنیا کی نیت سے بھی دعا کرنے کا حکم ہے۔

مثلاً ایک حدیث میں ہے۔وسئلوا اللّٰہ العافیة، اللہ تعالیٰ سے عافیت کی دعا مانگو! اسی طرح حصول رزق وحصول غناء اداء دین وغیرہ کے لیے بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعائیں تعلیم فرمائی ہیں، اور اگر احادیث میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی دنیاوی راحت کو نہیں چھوڑا، جس کے لیے کوئی دعا نہ بتلائی ہو، اور کسی مصیبت کو نہیں چھوڑا جس سے پناہ مانگنے کا طریقہ نہ بتلایا ہو، بلکہ راحت ومصیبت کے علاوہ بھی ہر حالت کے متعلق ایک نہ ایک دعا آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے۔

مثلاً گھر میں آنا، گھر سے باہر جانا، سونا، جاگنا، اٹھنا، بیٹھنا، بیمار کی اعیادت کرنا، مسجد میں جانا اور نکلنا، بازار میں جانا، سفر شروع کرنا، سفر میں کسی جگہ اترنا، پھر وطن کو واپس آنا، بیت الخلا میں جانا، وہاں سے نکلنا، خوشی ورنج کی بات دیکھنا، چاند دیکھنا وغیرہ وغیرہ سب کے لیے احادیث میں الگ الگ دعائیں وارد ہیں، تو دنیا

کے لیے دعا مانگنا بھی عبادت اور اطاعت ہے، بخلاف عملیات کے کہ وہ دین کے لیے ہوں تو طاعت ہے ورنہ نہیں۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۹۱ تا ۹۴)

## صرف یہ کہنا کہ بزرگ کی اولاد ہیں ہم

### یا سلسلہ میں ہیں کارآمد نہیں ہوسکتا

اسی طرح بزرگوں کی طرف انتساب سے یہ نفع ضرور ہوتا ہے کہ یہ شخص اگر ایمان وعمل صالح اختیار کرے تو دوسروں سے جلدی کامیاب ہوتا یا بڑے درجے میں پہنچ جاتا ہے،لیکن اگر یہ سرکشی سے پیش آوے تو اس وقت نرا انتساب کافی نہ ہوگا۔

فرمایا: اس وقت مجھے اپنے استاد علیہ الرحمہ کا ایک ارشاد یاد آیا، جو ایک حدیث کی شرح میں انہوں نے فرمایا تھا، اول میں حدیث سنا دوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک منافق تھا، عبداللہ بن ابی، یہ رئیس المنافقین تھا، مگر اس کے لڑکے صحابیؓ اور مومن مخلص تھے، جب اس منافق کا انتقال ہوا تو اس کے لڑکے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اس کے کفن کے لیے اپنا کرتا عطا فرما دیجئے، شاید اس کی برکت سے خدا اس کی مغفرت فرمائے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا کرتا دے دیا، اور تجہیز وتکفین میں بھی شریک ہوئے، حتیٰ کہ نماز جنازہ بھی پڑھانا چاہی۔

اس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جوش آ گیا، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر مبارک پکڑ لی، کہ آپ کس کی نماز پڑھانا چاہتے ہیں، ایک منافق کی ،جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اِسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اَوۡ لَا تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ اِنۡ تَسۡتَغۡفِرۡ لَهُمۡ سَبۡعِيۡنَ مَرَّةً فَلَنۡ يَّغۡفِرَ اللّٰهُ لَهُمۡ ۔ (سورۃ التوبہ)

یعنی چاہے آپ منافقین کے لیے ستر دفعہ بھی دعا استغفار فرمائیں خدا تعالیٰ ان کو نہ بخشیں گے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے مجھ کو استغفار سے منع نہیں فرمایا، اور اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ ستر دفعہ سے زیادہ استغفار کرنے سے ان کی مغفرت ہو جائے گی تو میں زیادہ استغفار کرلوں گا، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ خاموش ہو گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنازہ کی نماز پڑھا دی۔

واقعی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بھی کیا عجیب شفقت ورحمت تھی کہ دشمنوں سے بھی رحمت میں آپ کو دریغ نہ تھا، صاحبو! ہم بڑے خوش قسمت ہیں کہ ہم کو ایسے رحیم وکریم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نصیب ہوئے، ہمیں تو اپ سے بہت کچھ امیدیں ہیں۔

نمانند بعصیاں کسے درگرو
کہ دارد بعصیاں سید پیشرو

جب دشمنوں پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ رحمت ہے تو اپنے غلاموں پر تو کیا کچھ ہوگی۔

غرض آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز پڑھ چکے، اور دفن میں بھی شریک ہوئے، اور اس منافق کی قبر میں رکھے جانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا، اس کے بعد آیت نازل ہوئی۔

وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمۡ عَلٰى قَبۡرِهٖ ؕ اِنَّهُمۡ كَفَرُوۡا بِاللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَمَاتُوۡا وَهُمۡ فٰسِقُوۡنَ ۔ (سورہ توبہ)

جس میں منافقین پر نماز جنازہ پڑھنے اور ان کے دفن وغیرہ میں شرکت کرنے کی صاف صاف ممانعت ہے، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے بعد میں بڑی ندامت وشرمندگی ہوئی کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کیسی جرأت کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک کام سے روکنے لگا، میرا کیا منصب تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو سب سے زیادہ ہر ایک بات کو جاننے والے ہیں۔

ہمیں تو اپنے استاد علیہ الرحمہ کی بات پسند آئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس منافق کے ساتھ یہ معاملہ اس لیے فرمایا تا کہ امت کو یہ ضروری مسئلہ بتلا دیں کہ اگر کسی میں ایمان نہ ہو تو پھر چاہے اس کے پاس لاکھ تبرکات ہوں اور چاہے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسا شخص اس کے جنازہ کی نماز بھی پڑھ دے اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہی کا قمیص اس کا کفن ہو جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں پڑ جائے جب بھی نجات نہیں ہو سکتی، اس لیے تنہا ان تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے۔

چنانچہ عبداللہ بن ابی کے پاس اصل سرمایہ ایمان کا نہ تھا، اس لیے اس کے بارے میں کہا گیا۔

إِنَّ الْمُنَافِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۔(سورۃ النساء)

کہ منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں ہیں، جس کا عذاب سب سے زیادہ سخت ہے۔

تو اب معلوم ہو گیا کہ بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ ہم فلاں بزرگ کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں، اور ہمارے بزرگوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کر لیا تھا کہ ہماری اولاد

میں سے یا اتباع میں سے کوئی دوزخ میں نہ جائے، کیا کارآمد ہوسکتا ہے، جب تک اپنے پاس کچھ سرمایہ نہ ہو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب یہ آیت نازل ہوئی۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سب خاندان کو جمع کیا، اور سب کے ساتھ صاحبزادی صاحبہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خطاب کر کے فرمایا: یَا فَاطِمَۃُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ! أُنقِذِيْ نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ عَنْکِ مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا۔

اور اپنی پھوپی صاحبہ کو خطاب کر کے فرمایا: یاصفیة عمة رسول اللہ ﷺ أنقِذي نفسَكِ من النَّارِ ، فإنِّي لا أملِكُ لكِ من اللّٰهِ شيئًا۔

اسی طرح سب اعزہ سے فرمایا کہ اپنے آپ کو جہنم سے بچالو، میں تمہارے کام نہ آسکوں گا، یعنی اگر نرے میرے بھروسہ پر رہو گے تو اس صورت میں میں کچھ کام نہ آؤں گا، ہاں خود بھی کچھ سرمایہ جمع کرلو تو بے شک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کام آئیں گے۔

بس یہ درجہ ہے انتساب اور تبرکات کا، کہ وہ بدون اپنے عمل کے تنہا کافی نہیں ہوتے، باقی اپنے پاس بھی کچھ عمل ہو تو پھر وہ ضرور نافع ہے، ان کی برکت کا انکار نہیں ہوسکتا، اگر تبرکات نافع نہ ہوتے تو سلف صالحین اس کا اہتمام نہ کرتے، حالانکہ سلف سے اس کا اہتمام منقول ہے، خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تبرکات دئے ہیں، ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا چادرہ مبارک ایک صحابی کو عطا فرمایا، اور حج کے موقع پر اپنے بال تقسیم فرمائے، اور بعض واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تبرکات واقعی کام بھی آتے ہیں، مگر نرے تبرکات کام نہیں آتے، بلکہ اصل سرمایہ کے ساتھ یہ بھی مل جائے تو نفع بڑھ جاتا ہے۔

اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کھانے کے ساتھ چٹنی اور مربّا کو اس سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا ہے، اب اگر کوئی شخص دوستوں کی دعوت کرے اور سارا دستر خوان چٹنی اور مربوں ہی سے بھر دے تو کیا یہ دعوت ہوگی یہ تو مسخرا پن ہوگا۔

اسی طرح جو چیز زوائد میں سے ہیں وہ سب ایسی ہی ہیں کہ ان پر حصول مقصود موقوف نہیں ہوتا، اور وہ تنہا مقصود سے مغنی نہیں ہوتیں، ہاں ضروریات کے ساتھ جمع ہو جائے تو مفید ہوتی ہیں، دیکھو اگر دستر خوان پر چٹنی مربے نہ ہو تو وہ دعوت ضرور ہے، اور اگر چٹنی مربّا ہی ہو کھانا نہ ہو تو اسے دعوت نہیں کہہ سکتے، اور دونوں جمع ہو جائیں تو اعلیٰ درجہ کی اور لذیذ دعوت ہوگی، اسی طرح تبرکات نافع ضرور ہیں، مگر ان کی نافعیت کے لیے کچھ شرطیں ہیں، یعنی ایمان وعمل صالح، جیسے گورنمنٹ اپنے وفاداروں کی رعایت کرتی ہے، بشرطیکہ وہ بغاوت واقدام جرائم نہ کریں، بلکہ تعلیم و تہذیب سے آراستہ ہو کر گورنمنٹ کی اطاعت بھی کریں، تو ان کا خیال دوسروں سے زیادہ کیا جاتا ہے، اسی لیے سلف نے بزرگوں کی نیک اولاد کا ہمیشہ احترام کیا ہے، اور واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بزرگ بھی اپنی اولاد کا خیال رکھتے ہیں۔

میری ایک رشتہ کی پھوپھی تھی جو بچیوں کو پڑھایا کرتی تھیں، ہمارے یہاں یہ رسم ہے کہ لڑکیاں گھروں ہی میں تعلیم پاتی ہیں، ان کے لیے کوئی زنانہ اسکول نہیں، اور نہ یہ مناسب ہے، اس میں بہت مفاسد ہیں، جن کا تجربہ رات دن ہوتا جاتا ہے، تو اسی طرح میری پھوپھی صاحبہ اپنے گھر پر لڑکیوں کو پڑھاتی تھیں، اور کسی سے معاوضہ وغیرہ کچھ نہ لیتی تھیں، ایک مرتبہ ان کے ہاں ایک سید کی لڑکی

پڑھنے آئی وہ فرماتی تھیں کہ اسی روز رات کو میں نے حضرت فاطمہ زہراء رضی اللہ عنہا کو خواب میں دیکھا فرماتی تھیں کہ عمدۃ النساء، دیکھو ذرا میری بچی کو محبت سے پڑھانا۔

اسی طرح اور بہت سی بشارتیں اور منامات ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل اللہ کو اپنی اولاد کا خیال رہتا ہے، اور آخرت میں اس نسبت سے یہ نفع ہوگا کہ حق تعالیٰ بزرگوں کی اولاد کو انہیں بزرگوں کے درجوں میں پہنچا دیں گے۔

(دین ودنیا، خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۹۷ تا ۱۰۳)

چنانچہ ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ ءَامَنُوا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُم بِإِيمَٰنٍ أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ أَلَتْنَٰهُم مِّنْ عَمَلِهِم مِّن شَىْءٍ ۔(سورہ (طور: آیت ۲۱)

اس میں افراد وتفریط دونوں کا علاج کر دیا گیا ہے، فرماتے ہیں کہ جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد ایمان کے ساتھ ان کی پیروی کرتی رہے یعنی کافر وشریر نہ ہوتو ہم ان کو بھی انہی کے ساتھ ملا دیں گے، یعنی گو عمل میں دونوں برابر نہ ہوں، مگر پھر بھی سب کو برابر کر دیا جائے گا، جیسے کوئی بادشاہ کہیں مہمان بن کر جائے اور اس کا بیٹا بھی اس کے ہمراہ ہوتو وہ بھی اسی جگہ ٹھہرے گا جہاں بادشاہ ٹھہرے گا۔

اب یہاں کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ شاید اس برابری کی صورت یہ ہو کہ اوپر کے درجہ والوں کو نیچے کر دیا جائے، یا کچھ ان کو گھٹا یا جائے، اور کچھ ان کو بڑھا یا جائے، اور اوسط پورا کر کے درمیانی درجہ دے دیا جائے، تو اس کا جواب دیتے ہیں :وماالتناھم من عملھم من شئ۔ کہ ہم بلند درجہ والوں کے اعمال میں سے کچھ بھی کم نہ کریں گے، بس معلوم ہو گیا کہ برابری کی صورت یہ ہوگی کہ ناقص

الاعمال کو کامل الاعمال کے درجہ میں بھیج دیا جائے گا، کاملین کے درجات میں کمی نہ کی جائے گی۔

اب اس کو سن کر شاید کسی کو ہوس ہوتی کہ پھر ہم کو عمل کی کیا ضرورت ہے، تو آگے ایسا فیصلہ فرمایا ہے جس سے اس خیال کا استیصال ہو گیا فرماتے ہیں۔ کل نفس بماکسبت رهينة۔ کہ ہر شخص اپنے کئے ہوئے اعمال کے ساتھ مقید ہوگا ،معلوم ہوا کہ عمل کی پھر بھی ضرورت ہے بدون عمل کے یہ دولت نصیب نہیں ہوسکتی۔

یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو گیا کہ شریف نسب نافع ہے یا نہیں، اس وقت اس بارے میں غلو ہو رہا ہے، بعض تو اسی کو اصل قرار دیتے ہیں، اور بعض اس کو مٹاتے ہیں کہ یہ کوئی چیز نہیں، اور دیکھا یہ گیا ہے کہ جو لوگ ذی نسب نہیں ہیں وہی زیادہ تر اس کو مٹاتے ہیں، اور دونوں کا منشاء تکبر ہے، جو لوگ نسبت کو حاصل قرار دیتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہمارے پاس اتنی بڑی چیز ہے، ہم کو بڑا سمجھو، اور جو اس کو مٹاتے ہیں وہ بھی بڑا بننا چاہتے ہیں کہ ہم شرفاء سے کسی بات میں کم نہیں ہیں، کیونکہ شرافت نسب کوئی چیز نہیں، بعض نے تو یہ کیا کہ نسبت ہی کا استیصال کر دیا اور بعض نے یہ کیا کہ اپنے کو کھینچ تان کر شرفاء میں داخل کر دیا۔

میں ایک مقام پر گیا، وہاں کی چھوٹی قوموں نے اپنی چار قسمیں کر لیں، شیخ، سید، مغل، پٹھان اور اپنے محلہ کا نام بھی بدل دیا، میں اس جگہ کا نام نہیں لینا چاہتا تھا، جب میں وہاں گیا تو مجھ سے بیان کی درخواست کی گئی، تو اتفاقاً میں نے نسب ہی کا بیان کیا، حالانکہ مجھے اس واقعہ کی اطلاع نہ تھی، نہ کسی

نے مجھ سے کچھ کہا تھا، تو وہ لوگ بہت ناراض ہوئے، جنہوں نے اپنے کو شرفاء میں داخل کیا تھا، اور کہنے لگے کہ بھائی بھلا یہی مضمون بیان کے لیے رہ گئے تھے، وہ یہ سمجھے کہ وہاں کے شیخ زادوں نے یہ مضمون فرمائش کر کے بیان کرایا ہے، اس لیے وہ شیخ زادوں سے بھی بہت خفاء ہوئے، حالانکہ میری یہ بالکل عادت نہیں کہ فرمائشی مضمون بیان کروں، بس وقت پر جو بات دل میں آجاتی ہے بیان کر دیتا ہوں۔

غرض نسبت کے بارے میں یہ غلو ہو رہا ہے اور منشاء اس کا محض تکبر ہے، جنہیں قدرت ہوتی ہے ان کا تکبر زیادہ ظاہر ہوتا ہے، اور جن کو قدرت نہیں ان کے بھی برتاؤ سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ اپنے کو بڑا بننا چاہتے ہیں۔

چنانچہ میں ایک قصبہ میں جس کا نام کاندھلہ ہے گیا ہوا تھا، وہاں ایک نائی نے مجھ سے مسئلہ پوچھا کہ جو شخص السلام علیکم کہنے سے چڑے وہ کیسا ہے؟ یہ سوال اس نے بھرے مجمع میں کیا تھا، جہاں وہ رؤساء بھی موجود تھے، جو اس شخص کے زعم میں السلام علیکم سے چڑتے تھے، وہ بڑے متفکر ہوئے کہ دیکھئے کیا فتویٰ لگتا ہے ، میں نے کہا جو السلام علیکم سے چڑے وہ بہت بُرا، اور جو السلام علیکم مساوات اور برابری جتلانے کے لیے تان کر اور لٹھ سا مار دے وہ اس سے بھی بُرا، چھوٹا آدمی بڑوں کو سلام کرے، تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ چھوٹا بن کر نرمی سے السلام علیکم کہے، لٹھ سا نہ مار دے، بس اس طرح کہے جیسے بیٹا باپ کو السلام علیکم کہا کرتا ہے، اس سے کوئی نہ چڑے گا، نہ کسی کو ناگواری ہوگی پس کہو السلام علیکم ہی مگر اس طرح کہو۔

جب سائل چلا گیا تو سارے رؤساء ہنسنے لگے، اور کہا کہ صاحب بس تم نے

اس مرض کو سمجھا، واقعی یہ جب سلام کرتا ہے لٹھ سا مارتا ہے جیسے کوئی برابری جتلاتا ہو، اسی سے ہم کو ناگواری ہوتی ہے، ورنہ آدمیت سے سلام کرے تو کون چڑتا ہے، غرض شرفاء کو تو متکبر کہا ہی جاتا ہے مگر یہ غریب بھی کچھ کم نہیں ہوتے۔

ایک قصہ اس کے مقابل مجھ کو یاد آ گیا کہ ایک نائی کسی کا خط لے کر ایک قصبہ میں گیا، وہاں جا کر اس نے السلام علیکم کہا تو شیخ زادوں نے اسے خوب پیٹا ،اس نے پوچھا کہ حضور پھر کیا کہوں ،لوگوں نے کہا کہ حضرت سلامت کہا کرو، اس کے بعد نماز جمعہ کا وقت آیا تو جب امام نے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اس نائی نے پکار کر کہا حضرت سلامت ورحمۃ اللہ، حضرت سلامت ورحمۃ اللہ۔

امام نے اس کو بلا کر پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے، اس نے کہا حضرت میرا قصہ سن لیجئے، بات یہ ہے کہ میں نے یہاں کے رئیسوں کو السلام علیکم کہہ کر سلام کیا تو انہوں نے مجھے بہت مارا، اور یہ کہا کہ حضرت سلامت کہنا چاہئے، مجھے ڈر ہوا کہ اگر کہیں فرشتے بھی السلام علیکم سے خفاء ہو گئے تو ان میں ایک فرشتہ ملک الموت بھی ہے وہ تو میری جان ہی نکال لیں گے، اس لیے میں نے نماز میں بھی حضرت سلامت ہی کہا اس پر امام صاحب نے وعظ میں ان رئیسوں کی خبر لی کہ یہ کیا واہیات ہے، تم لوگوں کو طریق سنت سے منع کرتے ہو، سو کچھ لوگ ایسے بھی ہیں۔

ایک اور قصہ یاد آیا، کانپور میں ایک دفعہ میرے پاس دیہات کے ایک قاضی صاحب تشریف لائے، اور السلام علیکم کہ کر بیٹھ گئے، تھوڑی دیر میں کہنے لگے کہ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، میں نے کہا فرمائیے، کہنے لگے کہ اس عملداری میں

شرفاء اور غرباء میں بالکل مساوات ہوگئی، البتہ صرف ایک فرق السلام علیکم کا رہ گیا تھا، ہمارے مولویوں نے یہ بھی اٹھا دیا، سب کے لیے وہی السلام علیکم، میں نے کہا قاضی صاحب شرفاء اور غرباء میں جو فرق ہے تو یہ دینی امور میں سے ہے یا دنیاوی امور میں، اگر دینی امور میں سے ہے تو جا کر اپنے شہر میں غرباء سے کہہ دیجئے کہ ظہر وعصر وعشاء کی تین رکعت پڑھا کرو، اور مغرب کی دو، اور صبح کی ایک، اور اگر وہ نہ مانے تو تم چار کی پانچ، اور تین کی چار، اور دو کے تین پڑھا کرو، تا کہ برابری نہ ہو جاوے، وہ بہت ہی چپ ہوئے۔

پھر میں نے کہا اب بتلائیے کہ السلام علیکم دین کا کام ہے یا دنیا کا، ظاہر ہے کہ دین کا کام ہے، پھر اس میں امیر وہ غریب کا فرق کیوں ہو، باقی دنیوی امور میں فرق کرنے سے ہم منع نہیں کرتے، یہی فرق بہت ہے کہ تم سرہانے بیٹھتے ہو اور غرباء پائینتی پر بیٹھتے ہیں، اگر کوئی غریب آدمی امیر کے برابر سرہانے پر چڑھ کر بیٹھے گا تو ہم اس کو ضرور منا کر دیں گے۔

غرض نسبت کے باب میں جانبین سے یہ غلو ہو رہا ہے کہ بعض نے اسی کو اصل قرار دے لیا ہے، اور بعض کہتے ہیں کہ یہ بالکل کوئی چیز نہیں، اس لیے میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں جو اسی آیت کے مضمون سے اور اسی مقام سے مستنبط ہوتا ہے ، میں پوچھتا ہوں کہ اس وقت جو لوگ شریک ہیں اور اپنے کچھ صدیقی یا فاروقی یا سید کہتے ہیں تو وہ بتلائیں کہ ان کے اسلاف میں شرف کہاں سے آیا، ظاہر ہے کہ یہ حضرات منتسب الیہم چونکہ دین میں کامل تھے اس لیے ان کی طرف انتساب سبب

شرف ہو گیا،تو اصل وجہ شرف دین و ایمان ٹھہرا، یہی سبب ہے ہمارے اسلاف کے شرف کا، اور اسی وجہ سے ان کی طرف انتساب بھی سبب شرف ہو گیا ہے، یہ ضرور ہے کہ اس کے ساتھ وہ حضرات عالی خاندان بھی تھے،مگر تنہا یہی سبب شرف نہیں، کیونکہ عالی خاندان تو ابوجہل وابولہب بھی تھے،مگر ان کی طرف انتساب کسی کو بھی گوارا نہیں بلکہ اس کے ساتھ چونکہ ان حضرات کا کمال دین بھی مل گیا ہے، اس لیے انتساب میں شرف آ گیا تو یہ بالکل بے اصل چیز نہیں ہے، بلکہ شریعت نے اس کا شرف کا اعتبار کیا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

چنانچہ دنیا میں تو اس طرح اعتبار کیا گیا ہے کہ حدیث میں حکم ہے کہ نکاح اکفاء میں کیا کرو، اور شریعت نے کسی شریف زادی کا کفو غیر شریف کو نہیں مانا، اور آخرت میں بھی اتنا نفع ہے کہ جو شخص ان شرفاء کی اولاد میں ہوگا وہ اگر ایمان و عمل صالح کو اختیار کرے تو اس کو دوسروں سے کچھ زیادہ ملے گا، اور جنت میں وہ اپنے اسلاف کے درجہ میں ہوگا، گو اعمال اس درجہ کے نہ ہوں،لیکن یہ نفع کچھ عرفی شرفاء ہی کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اگر کوئی جولاہا بھی ولی ہو تو اس کے بیٹے کو بھی وہی نفع حاصل ہوگا، جو ان شرفاء کے بیٹوں کو ہوگا،غرض شرافت میں آخرت کا بھی نفع ہے، مگر اصطلاحی شریف کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جو بھی مقبول عنداللہ ہوگا اس کی طرف انتساب نافع ہوگا۔

پس یہ کہنا غلط ہے کہ شرف نسب نافع نہیں، نافع ضرور ہے،مگر وہ شرف انتسابی کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ جو شریف عنداللہ ہو اس کی طرف انتساب نافع

ہے، خواہ وہ تمہاری اصطلاح کے موافق شریف ہوں یا نہ ہوں، پس آخرت میں تو شریف اور غیر شریف میں اس طرح تفاوت ہوگا باقی دنیا میں تو تفاوت ہے ہی کہ غیر شریف کو شریف زادی کا کفو نہیں مانا گیا، نیز عقل وفہم تہذیب واخلاق وغیرہ میں بھی شریف وغیر شریف کا تفاوت ظاہر ہوجاتا ہے۔

مگر اس کا یہ اثر نہ ہونا چاہئے کہ تم دوسروں کو ذلیل سمجھو، بس ایسا تفاوت سمجھنا چاہئے جیسے چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی، یا باپ اور بیٹے میں اور حاکم ومحکوم میں ہوا کرتا ہے، اس تفاوت کا یہ اثر نہیں ہوا کرتا کہ بڑا بھائی چھوٹے کو یا باپ بیٹے کو حقیر سمجھنے لگے، یہ فیصلہ ہوا اس اختلاف کا۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا، اصل میں، میں یہ ذکر کر رہا تھا کہ نرا انتساب کافی نہیں، بلکہ اس کے ساتھ ایمان وعمل صالح بھی ضروری ہے، چنانچہ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ اتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ۔ یہ مضمون صاف طور سے نکل آیا پس اب کسی کو اس پر قناعت نہ کرنا چاہئے، کہ ہم بزرگوں کی اولاد یا سلسلہ میں ہیں، یا ہمارے پاس ان کی تبرکات ہیں، بلکہ ایمان وعمل کا اہتمام کرنا چاہئے، اس کے ساتھ اس انتساب کی برکت بھی کام دے گی ورنہ بے کار ہے۔

یہی مضمون اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا، بھی مستفاد ہوتا ہے، کیونکہ اس میں مقبولیت کا مدار ایمان وعمل صالح ہی کو ٹھہرایا گیا ہے، معلوم ہوا کہ ان کے سوا اور کوئی شیٔ مدار کار نہیں، بلکہ زوائد کی قبیل سے ہیں۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۱۰۴ تا ۱۱۰)

# دیندار بننے کیلئے دین کی محبت اور علماء کی صحبت ضروری ہے

فرمایا: ہمارے بزرگوں میں گو علم دین تو عام طور پر کامل نہ ہوتا تھا، عالم دو چار دس پانچ ہی ہوتے تھے، مگر یہ دو چیزیں ان کے پاس بڑی کام کی تھیں، یعنی دین کی محبت اور علماء کی صحبت، مگر اس وقت ہمارے بھائیوں نے علم دین کو چھوڑا ہی تھا، ساتھ میں ان دونوں کو بھی چھوڑ دیا، اور یہی وجہ ہے ہماری خرابیوں کی، کیونکہ جو شخص طبیب کے پاس نہ جائے گا اس کو صحت نہیں ہوسکتی، اور طبیب کے پاس وہ جائے گا جس کو صحت مطلوب ہو، تو آج کل ہمارے بھائیوں کو دراصل دین ہی سے محبت نہیں، اسی لیے اطباء دین کے پاس بھی نہیں جاتے، اسی لیے ان کے ایمان و دین کو قسم قسم کے روگ لگ جاتے ہیں، جن کی ان کو خبر بھی نہیں ہوتی، اور سب سے بڑی بیماری یہ ہے کہ بیمار کو بیماری کی اطلاع بھی نہ ہو، اور اس سے سخت یہ ہے کہ وہ تندرستوں کو بیمار سمجھنے لگے، جیسے ایک نکٹا ناک والوں کو نا کو کہتا تھا، یہی حالت ہمارے بھائیوں کی ہے، کہ وہ پرانے لوگوں کو جو ایمان میں کامل ہیں تندرست تو کیا سمجھتے، ان کے لیے ایسے ایسے لقب تجویز کرتے ہیں کہ وہ اپنے جواب ہی کی فکر میں پڑ جاویں، عجیب الٹا زمانہ آ گیا ہے۔

صاحبو! پرانے لوگوں میں بھی گنہگار تو ہیں فاسق بھی ہیں، مگر ان کی حالت یہ ہے کہ اہل علم کے سامنے جھک جاتے ہیں، اگر ان کو عذاب آخرت سے ڈرایا جائے

توڑ جاتے ہیں، وہ اپنے کو اہل الرائے نہیں سمجھتے، اسی لیے ان کا ایمان سلامت ہے، باقی جہاں نئ تعلیم ہے اور نری تعلیم ہی تعلیم ہے وہاں تو ایمان کی خیر صلاّ ہے، نہ ان میں دین کی محبت ہے نہ اہل دین کی عظمت ہے، ہر شخص اپنے کو صاحب رائے سمجھتا ہے اور علماء سے مسائل دینیہ میں مزاحمت کرتا ہے، باقی جہاں نئ تعلیم کے ساتھ یہ دونوں دولتیں بھی ہوں یعنی دین کی محبت اور اہل اللہ کی صحبت تو وہاں اس سے دین کا کچھ ضرر نہیں ہوتا، بلکہ وہاں دنیا کے ساتھ دین بھی جمع ہو جاتا ہے، اسی محبت وعلم دین کی نسبت کہتے ہیں۔

دریں زمانہ رفیق کے خالی از خلل است
صراحی مے ناب و سفینہ غزل است

صراحی میں ناب سے محبت مراد ہے، یہ ان کی خاص اصطلاح ہے، اور سفینہ غزل سے علم دین مراد ہے، جس کا ایک طریق تو تعلم ہے، اگر یہ میسر نہ ہو تو صحبت اہل اللہ ہے، اگر یہ بھی نہ ہو تو دین کی کتابوں کا مطالعہ ہے، مگر کتاب کے لیے بھی صحبت کی ضرورت ہے، نری کتب بینی سے دین کا صحیح علم حاصل نہیں ہو سکتا، جب تک کسی عالم سے سبقاً سبقاً نہ پڑھا جاوے، خواہ وہ کتاب اردو زبان ہی میں کیوں نہ ہو، جیسے اردو میں طب کی کتابیں دیکھ کر کوئی شخص طبیب نہیں بن سکتا، جب تک کسی طبیب کے پاس رہ کر نہ پڑھے۔

پھر اس زمانہ میں تو لوگ کتابیں بھی ایسی مختلف دیکھتے ہیں کہ خدا کی پناہ بس جو کتاب سامنے آئی دیکھنے لگے، چاہے اس کا مصنف محقق ہو یا غیر محقق، پھر مختلف

لوگوں کی کتابیں دیکھ کر خود ہی فیصلہ بھی کرتے ہیں کہ فلاں شخص نے اس مسئلہ کو دوسرے سے اچھا لکھا ہے، اور غضب یہ کہ اپنے فیصلے کو معتبر بھی سمجھتے ہیں، بھلا اگر کوئی ایسا شخص جو قانون گورنمنٹ سے ناواقف ہو کر کسی مقدمہ کا فیصلہ کرنے لگے تو کیا اس کا فیصلہ معتبر ہوگا؟ ہرگز نہیں، پھر حیرت ہے کہ جو شخص خدا کے قانون سے ناواقف ہے اس کے فیصلہ کو معتبر مانا جائے، اگر ایسا ہے تو پھر وکلاء اور بیرسٹروں کو کیا کیا حاجت ہے، بس ہر شخص قانون کو دیکھ کر فیصلہ کرلیا کرے، مگر یہاں سب اس پر متفق ہیں کہ قانون سلطنت کا سمجھنا ہر ایک کا کام نہیں، بلکہ جس نے اس کو باقاعدہ پڑھا ہو اور اس میں امتحان دے کر پاس ہو گیا ہو اسی کی رائے معتبر ہے، مگر حیرت ہے کہ قانون الٰہی کے سمجھنے کے لیے کسی امتحان اور پاس کی ضرورت نہیں، بلکہ ہر شخص اس میں رائے زنی کرنے کے لیے تیار ہے، اور دو چار اردو کی کتابیں دیکھ کر فیصلہ کرنے کو آمادہ ہے، اور فیصلہ بھی کیسے صحیح اصول پر مبنی کہ جو سمجھ میں نہیں آیا اس کی نفی کردی، بس ہمارے بھائیوں نے یہی ایک سبق یاد کرلیا ہے، جیسے ایک استاد نے اپنے ایک بے وقوف شاگرد کو سکھلا دیا تھا کہ جو مسئلہ تجھ سے پوچھا جاوے اگر معلوم ہوا تو بتلا دیا اور جو معلوم نہ ہوا تو یہ کہہ دیا کہ اس میں اختلاف ہے، اس سے جہالت کا عیب چھپا رہے گا، لوگ سمجھیں گے کہ ان کو معلوم تو ہے مگر اختلاف کی وجہ سے ایک شق کو معین نہیں کرتے، اور مختلف فی مسائل بکثرت ہیں، اس لیے اکثر مواقع میں یہ جواب صحیح ہوگا، مگر وہ بیوقوف تو تھا ہی اس نے بعض متفق علیہ مسائل میں بھی کہہ دیا کہ اس میں اختلاف ہے بالآخر اس کی حماقت ظاہر ہو کر رہی۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۱۱۲ تا ۱۱۵)

اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعے سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے، حالانکہ پہلے حکماء ان کو مقولہ کیف سے سمجھتے تھے، جس کے لیے وزن و مقدار نہیں ہوسکتی، مگر اس زمانہ میں ان کے لیے وزن ہونا ثابت ہوگیا ہے۔

اسی لیے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کے لیے معین وممد ہیں، چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے، چونکہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں، اور کلام کرتا ہے، تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے، جن میں حیات کا تلبس ہے۔

اسی طرح ایک حدیث میں ہے جو نسائی میں موجود ہے کہ، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت وہ دوزخ کو دیکھا، بعض لوگ اس پر ہنستے ہیں کہ جنت و دوزخ تو آسمان زمین سے بھی بڑی بتلائی جاتی ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دیوار پر کیوں کر دیکھ لیا، اور اصلی حالت پر کیسے دیکھ لیا، مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کر دیا۔

فوٹو میں بڑی سے بڑی شئ کو چھوٹا کر کے دیکھا یا جا سکتا ہے، اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جا سکتی ہے، تو کیا خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد کے دیوار پر آتار دیا ہو، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو، جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اصلی حالت پر نظر آ گئیں ہوں، اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے، مثلت الی الجنۃ والنار، یہ نہیں فرمایا کہ جنت وہ دوزخ زمین میں آئی تھیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ میرے لیے ممثل ہو گئیں۔

اسی لیے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے تو میں خوش ہوتا ہوں، کیونکہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے، چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانے میں یہ ہے کہ آج کل حرارت وبرودت کا بھی وزن ہونے لگا، کہ اس مکان میں کس وزن کی حرارت ہے، اور کس درجہ کی برودت ہے، اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے، اب اگر کسی گنوار سے کہئے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا تو جب دنیا ہی میں بعض اغراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے کہ مابہ الوزن انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہوجانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جو ہر سے ہے، تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جو ہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔

اور لیجئے اگر ایک برتن میں ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا، اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا، آخر کمی بیشی کیوں ہے، پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یک ساں تھی، معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا بھی کچھ وزن ہے، اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا، مگر بشرط برودت وحرارت کے، مگر آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا، تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہوجاوے کہ یہ عرض جو ہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے۔

اور سنئے اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو اور خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے، دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی، جو کہ جو ہر ہے، پس اس عالم میں عرض کا جو ہر بن جانا کچھ بعید نہیں۔

# پلصراط کی حقیقت

فرمایا: اب پلصراط کی حقیقت سمجھئے! گو اس کے بیان کی ضرورت نہیں کیونکہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہئے۔

حدیث مطرب و مے گو درازِ دہر کم تر جو
کہ کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمہ اس کا بیان کرنا لازم نہیں۔

میرے ذمہ تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں، مگر اس میں حظ آیا تھا، اس لیے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس طرح بھی کام چلے اچھا ہے، تو سنئے! پلصراط کی حقیقت شریعت ہے، کمال قال اصحاب الکشف من العرفاء۔ پس دنیا میں پلصراط کی نظیر شریعت موجود ہے اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے، اور وہاں جا کر جوہر بن جائے گی، باقی اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے، جیسے وہ بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے، جس پر چلنا دشوار ہے۔

اسی طرح طریق شریعت نہایت باریک اور نازک ہے، جس پر استقامت سے چل لینا ہر اک کا کام نہیں، کیونکہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے تو اس پر چلنے کے لیے دو قوتوں کی ضرورت ہے، ایک قوت علمیہ کی، دوسرے قوت عملیہ کی ،قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے، اور قوت عملیہ کا ارادہ سے، پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر، تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے، اور کہیں دفع مضرت کی،

اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں، اور جو دفعہ مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں، تو شریعت پر چلنے کے لیے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی۔

(۱) قوت عقلیہ۔ (۲) قوت شہویہ۔ (۳) قوت غضبیہ۔

یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں، پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں، افرا، تفریط، توسط، اور شریعت نام ہے توسط کا، شریعت میں افراط عقل سے بھی کام نہیں چلتا، نہ تفریط سے کام چلتا ہے، بلکہ توسط کی ضرورت ہے، جس کا نام حکمت ہے، اور قوت عقلیہ کے افراد کا نام جز برا ہے، یہ نہایت مضر ہے، جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے۔

جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ لا ادریہ مشہور ہے، وہ کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے، اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہمیں ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں، اور وہ گدھا نکلتا ہے، بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بدصورۃ سمجھتے ہیں بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اسے کڑوی بتلاتا ہے، اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے کوئی غلط، تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں، اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں، ممکن ہے

ہماری نظر نے غلطی کی ہو، اور جس بات کو ہم حق سمجھتے ہیں ممکن ہے وہاں ہماری فہم نے غلطی کی ہو، بس اب ان کا حال یہ ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے، اور شک میں بھی شک ہے۔ فھو شاک وشاک فی انہ شاک۔

تو حضرت یہ عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے، اور یہی وجہ ہے بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا، اور ہر چیز کا اپنی حد سے نکل جانا مضر ہے۔

میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لیے، اب تین قسم کے لوگ ہیں، ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے، اور پھر پہاڑ پر بھی اسی پر سوار ہو کر چڑھنے لگے، یہ غلطی پر ہیں، ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے، اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے، وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے، نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ پر پہنچ کر تھک گئے، یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی، پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا بیکار سمجھا کہ آخر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا، اور دوسرے نے ایسا بیکار سمجھا کہ پہاڑ تک بھی اس سے کام نہ لیا، صحیح بات تو یہ ہے کہ گھوڑا پہاڑ تک تو کارآمد ہے اور پہاڑ پر چڑھنے کے لیے بے کار، اس کے لیے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔

یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام نہ لینا بھی حماقت ہے، اور آخر تک کام لینا بھی غلطی ہے، بس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو، اور

کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کرلو، اس سے آگے فرع میں عقل سے کام نہ لینا چاہئے، بلکہ اب خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے گردن جھکا دینی چاہئے، چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔

دیکھیے! قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہے، اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں، اس لیے ماننا پڑے گا، تو یہ صورت آسان ہے، اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں، دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفع کو نہیں مانتا، تو بتلایئے اس شخص کا کیا حال ہوگا، ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا، اور عقلاء کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلّم اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ ہے؟ ضرور ماننا پڑے گا، چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت کے پہچاننے کے لیے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں، پھر کیا وجہ ہے کہ آپ دین کے معاملہ میں آخر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں، یہ سخت غلطی ہے، جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا، جب خدا کا ہونا مسلّم تو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا رسولؐ ہونا مسلّم، کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم، پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے، اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائے گا، اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے۔

عزیز یکہ از در گہش سر بتافت
بہر در کہ شد ہیچ عزت نیافت

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جو تک وہ کام دے سکے، اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑو، اور حکم کا اتباع کرو، تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی، اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے، جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے، اس سے آگے دوربین لگانے کی ضرورت ہے، ایسے ہی شریعت کے معاملہ میں اصول تک تو عقل کام دیتی ہے اور فروع میں یہ تنہا بیکار ہے، دوربین وحی سے کام لینا ضروری ہے ایسے ہی کان کی ایک قوت ہے، جس کے لیے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلی فون سے مدد لینے کی ضرورت ہے، پیروں کی ایک قوت ہے جس کے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے، تو جب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی ضرور ہوگی، اس سے آگے وحی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر راستہ نہ ملے گا، کیونکہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں وہاں تو اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ضرورت ہے اور ؂

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہر گز بمنزل نخواہد رسید

(خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۱۲۹ تا ۱۳۲)

## تقدیر کی ضرورت

فرمایا: صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں، جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ موجود دین

میں سے کون زیادہ حاذق وتجربہ کار ہے اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے، پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دواء کیوں لکھی، اور فلاں کیوں نہیں لکھی، اوراس دواء کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا، چھ ماشہ کیوں نہ لکھا، ہم نے کسی کو طبیب سے ان باتوں میں الجھتا ہوا نہیں دیکھا، اور اگر کوئی اس سے الجھنے لگے تو سب عقلاء اس کو بے وقوف بناتے ہیں، اور طبیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کردوں اس میں تم کو چوں وچرا کا کوئی حق نہیں، اور اگر چوں وچرا کرتے ہو تو اس کے معنٰی یہ ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے ، پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اس کے جواب کو تمام عقلاء صحیح کہتے ہیں۔

پھر حیرت ہے کہ رسول کو رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جاوے، اور بات بات میں الجھا جائے کہ یہ تو خلاف عقل ہے، ہم اسے کیوں کر مان لیں، صاحب اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو پھر ہر بات کو بلا چوں وچرا ماننا پڑے گا، اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی، ورنہ اس کے معنٰی یہ ہیں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول نہیں سمجھا، اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا، افسوس! دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو، اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز نے عقل کو دخل نہ دیا جاوے، اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

صاحبو! جب نیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر

چھوڑ دیا جائے، اور بلا چوں و چرا دوسرے کا اتباع کیا جائے تو آخرت کا کام بدون اس کے کیوں کر چلے گا، کیونکہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں، ان میں سے کسی قدر عقل چل سکتی ہے، پھر بھی اس کو چھوڑ کر کاملین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے، اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں، وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا، اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی، جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔

شانِ ورود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لیے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا، حافظ جی نے پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے، کہا سفید ہوتی ہے، حافظ جی نے سفید سیاہ میں کیوں فرق کیا تھا، ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ، کیونکہ آنکھیں ہی نہ تھیں، تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے، اس نے کہا جیسے بگلاء، حافظ جی نے پوچھا کہ بوگلاء، کیسے ہوتا ہے، لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح موڑ کر کہا ایسا ہوتا ہے، حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے کہ بھائی یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے، میرے گلے سے کیوں کر اترے گی۔

تو دیکھئے! جو چیز آنکھ سے دیکھی نہ ہو اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے کیا بن گیا، جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی، اب وہ گلے میں پھنسنے لگی، تو واقعی اندھے کو کوئی کیوں کر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے، اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق میں رہے تب بھی نہیں سمجھ سکتے، بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوآنکھے کی تقلید کر لی جائے۔

اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے آم کبھی نہ کھایا ہو آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو

کیا وہ سمجھ جائے گا، ہرگز نہیں، تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں، بس آم ایسا ہی ہے ہوتا ہے ہوگا، صاحب اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایک آم لاکر اسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہئے، اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۱۳۲ تا ۱۳۵)

اسی طرح امور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو، مرنے کے بعد صراط اور وزن اعمال وغیرہ سب کی حقیقت سامنے آجائے گی، اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا ہے چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کہہ دیا ہے ان کی تقلید کرو، اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپئے نہ ہو، سالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ جی نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا، پس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے، جس سے بڑھ جانا مضر ہے۔

اطباء نے بھی تو اس کو مضر لکھا ہے، اور امراض میں سے شمار کیا ہے، کیونکہ افراط عقل کا نتیجہ اوہام وشکوک میں ابتلاء ہے جس سے قلب ودماغ دونوں ضعیف ہوجاتے ہیں۔

فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوہ بیچتا پھرتا تھا، اس سے پوچھا، کیف تبیع الحلواء، توحلوہ کس طرح بیچتا ہے؟ اس نے جواب دیا: کذابدانق، کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں تو آپ کہتے ہیں، اسئلک میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے اپ حلوائی سے الجھ گئے۔عن الکیفیۃ

و تجیبنی عن الکمیة، میں تو کیفیت سے سوال کرتا ہوں اور تو کمیت سے جواب دیتا ہے، آپ حلوائی سے الجھ گئے۔

اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہے، چنانچہ افراط عقل ہی کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہ السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہو گئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے نبی ہیں، ہم کو نبی کی ضرورت نہیں، نحن قوم قد هذا بنا نفوسنا بالحكمة، ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مہذب بنا لیا ہے، حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں: فرحوابماعندهم من العلم۔ یہ لوگ اپنے علم پر نازہ ہو گئے، اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں، چنانچہ الہیّات میں فلاسفہ نے جو تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمان کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے، یہ تو افراط فی القل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی اس کو حماقت کہتے ہیں، شریعت میں یہ دونوں درجے بے کار اور مذموم ہیں۔

(خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۱۳۵ تا ۱۳۶)

## شریعت کی روح یہ ہے

بلکہ مطلوب توسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں، دوسری قوت شہو یہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں، ایک افراط جس کا نام فجور ہے، شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں، کیونکہ اس کا انجام فسق ہے، اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ

ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو یہ بھی مطلوب نہیں، کیونکہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے، اور الوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتا ہے، جو بڑا نقص ہے، اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے۔

تیسری چیز قوت غضبیہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں، ایک افراط جس کو تہوّر کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھے اندھا دھن جوش دکھلانے لگے، جیسا آج کل ہو رہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بن کر چلتے ہیں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان، یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں، اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جائے، جیسے بعض لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجت ظاہر نہیں کر سکتے، یہ بھی مطلوب نہیں، اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے، یہ مطلوب ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے، جہاں نفع کا ظن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے، جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے۔

غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں۔

(۱) حکمت۔ (۲) عفت۔ (۳) شجاعت۔

اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے اور یہی شریعت کا حاصل ہے، اور قرآن میں جو فرمایا ہے: وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا، اس سے بھی عدل مراد ہے، مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایک ایسی شریعت دے کر جو کہ سراپا عدل ہے، امت

وسط یعنی امت عادلہ بنایا۔

ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے، ایک وسط حقیقی، ایک وسط عرفی، وسط حقیقی وہ خط ہے جو بالکل بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا، اور ایک وسط عری ہے جسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے، تو وہ وسط حقیقی نہیں، کیونکہ وہ تو منقسم ہے، اس کے اندر بھی ایک جز دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے، پھر وہ وسط حقیقی کہاں سے ہوا، حقیقی وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے سوا ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا، پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو، بلکہ عین توسط ہو یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے، اور یہی کمال ہے، اور اوپر معلوم ہو چکا کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوگا، تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے، چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراد کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا، اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔

پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی، کیونکہ بال بھی منقسم ہیں، اور وسط حقیقی غیر منقسم ہیں، پس قیامت میں یہی روح شریعت یعنی وسط حقیقی جو ہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا، جس پر سے مسلمانوں کو چلایا جائے گا، پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی وسہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا، کیونکہ وہ یہی شریعت تو ہوگی، جس پر دنیا میں چل چکا ہے، اور جو یہاں

نہیں چلا یا کم چلا ہے وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکے گا، یا سستی کے ساتھ چلے گا۔

لیجئے میں نے اپ کو پلصراط کی نظیر بھی دکھلا دی، اب تو کوئی اشکال نہیں رہا ،اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کے لیے عقلی نظائر موجود ہیں، یہ نہ سمجھئے کہ یہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے ،لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ۔ (دین ودنیا، خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۱۳۶ تا ۱۳۹)

ماقصۂ سکندر ودارا نخوانده ایم

ازما بجز حکایت مہروفا مپرس

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لیے بیان کردی تا کہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں، اور سمجھ میں آجائے کہ علوم شرعیہ کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی وقعت نہیں، جس میں سے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے تا کہ آپ علماء اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں، بحمد للہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے لیکن۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتدراز

ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

مصلحت اس واسطے نہیں کہ ہر شخص اس قسم کی تحقیقات بتلانے کے قابل نہیں، اور جو قابل ہوں ان کو بھی ہم نہیں بتلاتے، کیونکہ ان کا بتلانا ہمارے ذمہ نہیں، کیونکہ طبیب کے ذمہ صرف نسخہ بتلانا ہے اس کی رعایت اور ترکیب کے اسرار اور وزن کی علت بتلانا اس کے ذمہ نہیں ہے، ہاں بعض قابلوں کو بتلا بھی دیتے ہیں،

جو ہمارے پاس آ کر رہیں اور ہمارے کہنے کے موافق عمل کریں، اطاعت میں پختگی ظاہر کریں ایسے شخص کو کبھی نشاط میں آکر خود ہی بتلا دیتے ہیں، اور پوچھنے پر اسے بھی نہیں بتلاتے کیونکہ یہ اسرار ہیں، جن کو نشاط کے وقت خود ہی بیان کر دیا جاتا ہے، اور ان کا از خود کسی کا پوچھنا ناگوار گزرتا ہے، جیسے طبیب بعض دفعہ خوشی میں آکر مریض سے خود اپنے نسخہ کی تعریف اور حقیقت بیان کر دیتا ہے، اور اگر مریض پوچھے تو اسے ناگوار ہوتا ہے۔

جیسے کوئی شخص بادشاہ کا مطیع ومحبوب ہو تو بادشاہ اسے کبھی اپنے محل کی سیر بھی کرا دیتا ہے کہ دیکھو! یہ خزانہ ہے اور یہ چور دروازہ ہے اور یہ ہماری بیگمات کے رہنے کی جگہ ہے، یہ آرام گاہ ہے، لیکن اگر وہ از خود پوچھنے لگے حضور کی بیگم کہاں رہتی ہے اور خزانہ کہاں ہے تو ایسے بے نقط سنائی جائیں گی کہ حواس باختہ ہو جائیں گے، پس اسرار کے دریافت کرنے کی درخواست بھی ایسی ہی درخواست کی مشابہ ہت تو میں نے اسرار کی حقیقت بھی بتلا دی ان کے معلوم کرنے کا طریقہ بھی بتلا دیا، اگر کسی کو شوق ہو تو اس طریقے سے عمل شروع کر دے، یعنی اطاعت میں لگ جائے ، میں سچ کہتا ہوں کہ تم ہمارے اس کہنے پر عمل کرنے لگو تو پھر تم کو دریافت کی بھی ضرورت نہ ہوگی، خود ہی سب حقائق منکشف ہو جائیں گے اور یہ حال ہوگا۔

بینی اندر خود علوم انبیاء
بے کتاب وہ بے معید واستاد

اور جن کو یہ حقائق حاصل ہوئے ہیں، محض عمل اور اطاعت ہی سے

حاصل ہوئے ہیں۔

فہم وخاطر تیز کر دن نیست راہ
جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

یہ اسرار عقل پرستی اور فہم کے تیز کرنے سے معلوم نہیں ہوتے، بلکہ شکستگی اور انقیاد سے خدا کا فضل متوجہ ہو جاتا ہے آگے بتلاتے ہیں کہ اس شکستگی پر فضل کس طرح ہو جاتا ہے۔

ہر کجا پستی ست آب آنجارود
ہر کجا مشکل جو اب آنجارود
ہرکجا دردے دواء آنجارود
ہرکجا رنجے شفاء آنجارود

پس فضل اطاعت وعبدیت سے ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو فنا کر دے، اپنی عقل وفہم کو ناقص سمجھ کر چھوڑ دے فرماتے ہیں۔

سال ہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں رایک زمانے خاک باش

یعنی عقل کی اطاعت میں سنگ دل بنے ہوئے تو بہت دن ہو گئے اس نے کچھ بھی حقیقت نہ بتلائی، اب ذرا کچھ دنوں خاک ہو کر دیکھو پھر کیا ہوگا فرماتے ہیں۔

در بہاراں کہ شود سر سبز رنگ

خاک شوتا گل بروید رنگ رنگ

پھر تمہارے اندر عجیب عجیب علوم القا ہوں گے، صاحب یہ ہے طریقہ علوم عالیہ حاصل کرنے کا خوب سمجھ لیجئے۔

مگر اس وقت مذاق ایسا فاسد ہوا ہے کہ ہر شخص علوم عالیہ کے درپے ہے، اور اپنی عقل سے ان کو دریافت کرنا چاہتا ہے، حالانکہ عقل سے تو یہ بھی معلوم نہیں ہوسکتا کہ میں کس کا بیٹا ہوں اور میرا باپ کون ہے۔

کانپور میں ایک جنٹلمین نے اپنے باپ کولکھا تھا کہ یہ کاہے سے معلوم ہوا کہ آپ میرے باپ ہیں، اس کی عقلی دلیل کیا ہے، اس نے واقعی درایت پر عمل کیا، عقل کا تو مقتضا یہ ہے کہ جاہل کی اولاد بھی جاہل ہی ہو، یہ عقل میں کیوں کر آسکتا ہے کہ باپ تو جاہل لٹھ ہو اور بیٹا انٹرس پاس کر کے فلسفی بن جائے، دلیل عقلی تو اس کو ثابت کر نہیں سکتی، اسی لیے اس نے کہا کہ بتلاؤ کاہے سے معلوم ہوا کہ تم میرے باپ ہو، اس کا جواب اگر ہے تو یہی ہے کہ دایہ سے پوچھ لے جس نے تجھے ماں کے پیٹ سے جنایا تھا اور ماں سے پوچھ لے کہ وہ کیوں کر حاملہ ہوئی تھی تو یہ عقل تو بڑی نکمی چیز نکلی، جس سے باپ کا باپ ہونا بھی ثابت نہیں ہوسکتا، یہ ہے خرابی عقل کی اتباع میں اسی لیے کہتے ہیں۔ (دین ودنیا، خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۱۳۹ تا ۱۴۲)

آزمودم عقل دور اندیش را

بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

دیوانگی سے مراد اطاعت کاملہ ہے، جس میں بلا چوں وچرا اتباع ہو، گر کوئی

اس حالت پر ہنسے تو اس کے جواب میں فرماتے ہیں۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم
مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

یعنی جو کوئی ہنسے اس سے کہہ دو کہ ہماری دیوانگی ہی تمہاری عقل سے اچھی ہے، ہمارے نزدیک تو جو ایسا دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/۹ ۱۳ تا ۱۴۲)

## اسلامی معاشرت اور تہذیب اس کو کہتے ہیں

فرمایا: واللہ اسلام میں تو معاشرت ایسی ہے کہ کہیں بھی اس کی نظیر نہیں، مگر معاشرت اس کو نہیں کہتے کہ باجا بھی ہو، اور تکلفات ہوں، اور تکبر کا سامان بھی ہو، کیونکہ تکبر اور تکلف تو معاشرت کی جڑیں اکھاڑتا ہے، اس لیے کہ متکبر دوسروں سے بڑا بن کر رہتا ہے، پھر دوسروں کے ساتھ مساوات اور ہمدردی کہاں رہی، اسلام میں معاشرت کی تعلیم اس طرح دی گئی ہے جس سے انسان میں تواضع پیدا ہو اور تجربہ کر لیا جائے کہ بدون تواضع کے ہمدردی اور اتفاق پیدا نہیں ہوسکتا، اور یہی معاشرت کی جڑ ہے، پس اصل معاشرت اسلام ہی میں ہے۔

مثلاً کھانے پینے میں اسلامی معاشرت، سنئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے زبان سے بھی فرمایا ہے اور کر کے بھی دکھلایا ہے اکل کما یاکل العبد، کہ میں تو اس طرح کھاتا ہوں جیسے غلام کھایا کرتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی کہ جھک

کراکڑوں بیٹھ کر کھانا کھایا کرتے تھے، اب ہمارے بھائیوں کی نشست ملاحظہ ہو، جو سراسر متکبرانہ ہے اس کے بعد یہ دیکھئے کہ عقل کے قریب کون سا طریقہ ہے۔

اس کو ایک مثال میں سمجھئے، میں پوچھتا ہوں کہ اگر آپ جارج پنجم کے دربار میں جاویں اور وہاں آپ کو کوئی چیز کھانے کے لیے دی جائے اور حکم ہو کہ ہمارے سامنے کھاؤ تو بتلائے اس وقت آپ کس طرح کھائیں گے، کیا وہاں بھی آپ میز کے منتظر ہوں گے، اور پالتی مار کر بیٹھیں گے یا غلاموں کی طرح جھک کر کھائیں گے۔

اور لیجئے کہ اس وقت جو چیزیں آپ کو دی جائیں اگر ان میں سے کوئی شئ مرغوب نہ ہو تو انصاف سے کہئے کہ آپ اس کو بے رغبتی ظاہر کر کے کھائیں گے یا رغبت سے کھائیں گے، یقیناً آپ رغبت ظاہر کر کے کھائیں گے، بے رغبتی ہرگز ظاہر نہ ہونے دیں گے۔

بس یہی اسلامی تہذیب ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ: کان یا کل اکلا ذریعاً، آپ رغبت ظاہر کر کے جلدی جلدی کھاتے تھے، مگر ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ نہایت ہی ناز و انداز سے کھاتے ہیں، حضرت یہ ساری باتیں اس وقت تک ہیں جب تک حقیقت منکشف نہیں ہوئی، اور اگر حقیقت کھل جائے اور معلوم ہو جائے کہ احکم الحاکمین کے دربار سے ہم کو یہ چیز کھانے کے لیے ملی ہے اور وہ ہم کو دیکھ رہے ہیں تو پھر خود بخود وہی طرز اختیار کرنا پڑے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلایا ہے، چنانچہ اسی مثال میں غور کر لیجئے کہ آپ جارج پنجم کے عطیہ کو اس کے سامنے بے رغبتی اور بے پرواہی سے کھائیں گے یا نہایت رغبت سے۔

اور لیجئے حدیث میں ہے کہ اگر لقمہ گر پڑے تو اس کو صاف کر کے کھالو، اس

کو بعض متکبر تہذیب کے خلاص سمجھتے ہیں، مگر میں اسی مثال میں پوچھتا ہوں کہ اگر جارج پنجم کی دی ہوئی چیز میں سے کچھ گر پڑے تو آپ کیا کریں گے، کیا اس کو ویسے ہی چھوڑ دیں گے یا اٹھا کر سر پر دھریں گے، حضرت سارے مرحلے یہیں طے ہوجاتے ہیں، جبکہ قلب میں کسی کی عظمت ہو، بس فرق یہ ہے کہ ہم لوگ یہ بات نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو دیکھتے تھے، اگر ہماری بھی آنکھیں کھل جائیں تو وہی کرنے لگیں جو حضورؐ نے کیا ہے، اور جہاں جا کر یہ آنکھیں کھلتی ہیں اور کسی کی عظمت دل میں مستحضر ہوتی ہے وہاں اب بھی آپ کا یہی برتاؤ ہے۔

اب جدید معاشرت کو دیکھئے! میں ایک مرتبہ اپنے بھائی کے یہاں کھانا کھا رہا تھا تو ہم لوگ فرش پر بیٹھے ہوئے کھا رہے تھے، اس وقت ایک جنٹلمین بھی مہمان تھے وہ کھانے کے لیے اس حلیہ سے آئے کہ کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تھے، بے چارے آ کر کھڑے ہو گئے اور اس کے منتظر رہے کہ شاید میرے واسطے کرسی لائی جاوے، مگر بھائی نے میری وجہ سے کرسی وغیرہ کا انتظام نہ کیا، دیر تک وہ کھڑے رہے مجھے شرم بھی آئی کہ ایسے کھڑے ہیں جیسے کوئی مانگنے آیا ہو، بالآخر وہ بہ تکلف اس طرح بیٹھے کہ دونوں پیر ایک طرف لمبے کر دئے اور دھم سے گر پڑے اور کہنے لگے کہ معاف فرمائیے گا میں پیر لمبے کرنے پر مجبور ہوں، میں نے کہا کہ معاف فرمائیے گا میں کرسی پر کھانے سے معذور ہوں، ان کو پیر لمبے کرنے سے شرم آتی تھی اور مجھے کرسی پر کھانے سے شرم آتی تھی، میری شرم ایسی تھی جیسے علامہ

تفتازانی کی شرم تھی، اوران کی شرم تیمورلنگ جیسی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ تیمورلنگ دربار میں پیر پھیلا کر بیٹھا تھا، کیونکہ اس کا ایک پیر بوجہ لنگ کے سیدھا رہتا تھا، علامہ تفتازانی اس کے زمانہ میں بہت بڑے عالم تھے، تیمور ان کی اتنی وقعت کرتا تھا کہ دربار میں ان کو اپنے پاس تخت پر بٹھاتا تھا، جب پہلی مرتبہ علامہ تفتازانی دربار میں بلائے گئے اور تیمور نے ان کو تخت پر بٹھلایا تو یہ بھی تیمور کی طرح ایک پیر لمبا کر کے بیٹھے، تیمور نے ناگواری سے کہا معذورم دار کہ مرا لنگ است۔

یعنی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ میرے پیر میں لنگ ہے، میں نے قصداً پیر لمبا نہیں کیا ،جس کا آپ نے مقابلہ کیا ہے، علامہ نے جواب دیا معذور رم دار کہ مرا لنگ است، یعنی آپ بھی مجھے معذور سمجھئے کیونکہ مجھے لنگ وعار آتا ہے کہ ظاہر میں بادشاہ کی وضع سے کم تر وضع اختیار کروں، کیونکہ اس میں دیکھنے والوں کی نظر میں علم کی تحقیر ہے، تیمور خاموش ہوگیا، پھر ہمیشہ یہی دستور رہا کہ علامہ پاؤں پھیلا کر ہی تخت پر بیٹھتے تھے۔

اسی لیے میں نے بھی ان حضرت کے لیے کرسی نہ منگوائی، کیونکہ اس میں اسلامی معاشرت کی توہین تھی، میں نے کہا اچھا ہے، ذرا آج یہ اپنی معاشرت کا مزہ تو چکھیں کہ اس میں کتنی مصیبت ہے،تو یہ کیا آزادی ہے کہ انسان بدون کرسی اور میز کے بیٹھ ہی نہ سکے۔

ایک دفعہ میں کانپور کی مسجد میں حدیث شریف پڑھا رہا تھا کہ ایک انسپیکٹر پولیس جو کہ جنٹلمین تھے اسی طرح کوٹ پتلون میں جکڑے ہوئے تشریف لائے

اور لب فرش میرے منتظر کھڑے رہے کہ یہ اٹھ کر میرے پاس آئے اور میں باتیں کروں، مگر میں حدیث کو ان کے لیے کیوں چھوڑتا بالآخر تھوڑی دیر کھڑے رہ کر چل دئے، واللہ اس لباس سے زیادہ کیا جیل خانہ ہوگا جس میں کرسی کے آنے تک انسان کو مجرموں کی طرح کھڑا رہنا پڑے۔

تو میں اس وقت جائز و ناجائز سے بحث نہیں کرتا یہ تو دوسری بات ہے، ان سب سے قطع نظر کر کے میں کہتا ہوں کہ دوسری قوموں کی معاشرت اختیار کر کے وہ امتیاز قومی کہاں رہا، جس کے یہ لوگ بڑے مدعی ہیں، اور اسلام کی وقعت کہاں رہی جس کے حامی اور خادم ہونے کا ان کو دعویٰ ہے، کیا اسلام کی یہی وقعت ہے کہ تم دوسروں کی معاشرت اختیار کر کے زبان حال سے اسلامی معاشرت کا ناکافی ہونا ظاہر کرو نیز اس میں یہ خرابی الگ ہے کہ جس معاشرت کو آپ لے رہے ہیں اس میں تنگی اور قید بہت زیادہ ہے کہ ایک چیز کو دوسری لازم اور اس کو تیسری چیز لازم ان قیود کی پابندی میں وہ آزادی کہاں رہی جس کا آپ سبق پڑھا کرتے ہیں۔

آج کل ہمارے نوجوان آزادی کا سبق پڑھ کر شادی بیاہ کی رسموں کو منع کرنے لگے ہیں، مگر میں نے ایک موقع پر کہا تھا کہ یہ ہمارے لیے خوش کن بات تو نہیں، کیونکہ آپ ان رسموں کو اپنی رسموں کے پورا کرنے کے لیے منع کرتے ہیں خدا اور رسولؐ کی ممانعت کی وجہ سے منع نہیں کرتے، البتہ رسوم کو روکنا علماء کا حق ہے جن کا مذہب ہے، ترکت اللات والعزیٰ جمیعاً۔

اور لیجئے سلام وکلام میں بھی ہمارے بھائیوں نے دوسروں کا طریقہ اختیار کر

لیا ہے، گویا شریعت کی معاشرت کو بالکل چھوڑ دیا، کوئی ٹوپی اتار کر سلام کرتا ہے، کوئی انگریزی لفظوں میں سلام کرتا ہے، کوئی آداب وتسلیمات کہتا ہے وغیرہ وغیرہ، معاشرت کے بعض اجزاء کے متعلق تو بعض لوگوں کو یہ بھی خبر نہیں رہی کہ یہ شریعت کا حکم ہے بھی یا نہیں بلکہ اکثر لوگ اس کو اسلام سے خارج سمجھتے ہیں، جیسے استیذان کا مسئلہ اس کو بہت لوگ نئی بات سمجھتے ہیں، اور اگر کوئی شخص یہ قانون مقرر کردے کہ جب کوئی ملنے آئے تو پہلے اطلاع کردے تو اس کو بدنام کرتے ہیں کہ اس نے انگریزوں کا طریقہ اختیار کرلیا، حالانکہ استیذان کا مسئلہ اسلام ہی سے سب نے سیکھا ہے، چنانچہ یہ حکم قرآن میں موجود ہے حدیث میں موجود ہے، اور سلف کا طرز عمل بھی یہی تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس پر عمل کرکے دکھلایا ہے، البتہ اس کی حقیقت سمجھ لیجئے کیونکہ جس طرح آج کل نوجوانوں نے طرز اختیار کیا ہے یہ انھوں نے حکم اسلامی کی اتباع کے لیے نہیں کیا، بلکہ اس میں بھی وہ دوسری قوموں کا اتباع کرتے ہیں۔

## کسی کے گھر جائیں تو اجازت اس طرح حاصل کریں

تو سن لیجئے کہ اسلام میں استیذان کے لیے کارڈ بھیجنے کی ضرورت نہیں، اور وہ نہ ہر جگہ اور ہر مکان کے لیے اجازت مانگنے کی ضرورت ہے، بلکہ جب قرائن سے یہ معلوم ہو جائے کہ کوئی شخص خلوت میں بیٹھا ہے، مثلاً بیٹھک کے کیواڑ بند کر رکھے ہیں یا پردے چھوڑ رکھے ہیں یا زنانہ مکان ہے تو اس وقت استیذان کی ضرورت

ہے، اور اگر مردانہ مکان ہے اور کیواڑ بند نہیں نہ پردے چھوڑے ہوئے ہیں تو بلا استیذان کے جانا جائز ہے ،مگر یہ کہ قرائن سے معلوم ہو جائے کہ اس وقت کسی ضروری کام میں مشغول ہے، جس میں دوسروں کے آنے سے خلل واقع ہوگا ، اور جہاں استیذان کی ضرورت ہے وہاں یہ طریقہ ہے کہ پہلے جا کر سلام کرو، السلام علیکم ، پھر اپنا نام بتلا کر کہو کہ میں اندر آ سکتا ہوں ، اگر وہ اجازت دے، چلے جاؤ، ورنہ تین دفعہ اس طرح کر کے لوٹ آؤ۔

چنانچہ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور تین دفعہ اسی طرح کر کے واپس ہو گئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خادم سے فرمایا کہ میں نے ابوموسیٰؓ کی آواز سنی تھی، ان کو بلا لاؤ، اس نے باہر آکر دیکھا تو وہ واپس ہو چکے تھے آکر عرض کیا تو فرمایا کہ جہاں ہوں وہیں سے بلا لاؤ، جب وہ تشریف لائے تو پوچھا کہ آپ واپس کیوں ہو گئے تھے، فرمایا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حکم فرمایا ہے کہ تین دفعہ سلام واستیذان کے بعد جواب نہ آئے تو واپس ہو جایا کرو، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ مسئلہ معلوم نہ تھا اس لیے فرمایا کہ تمہارے پاس کوئی گواہ ہے ، جو تمہارے موافق حضورؐ کے ارشاد کو بیان کر سکے ،حضرت ابوموسیٰؓ گواہ کی تلاش میں مسجد نبویؐ میں آئے جہاں انصار کا مجمع موجود تھا انہوں نے کہا کہ ہم سب اس مسئلہ پر گواہ ہیں ،مگر تمہارے ساتھ ہم اپنے میں سب سے چھوٹے کو بھیجیں گے ،تاکہ حضرت عمرؓ کو معلوم ہو جائے کہ انصار کے بچے بھی اس مسئلہ کو جانتے ہیں، چنانچہ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اس مجمع میں سب سے چھوٹے

تھے، وہ گواہی کے لیے حاضر ہوئے، اورآ کر بیان کیا کہ واقعی حضورؐ نے تین دفعہ کے بعد لوٹ جانے کا حکم دیا ہے۔

یہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم ارشادی تھا، حضورؐ نے اپنے عمل سے بھی اس حکم کو ظاہر فرمایا ہے، چنانچہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت سعد بن عبادہؓ کے گھر تشریف لے گئے اور تین مرتبہ فرمایا: السلام علیکم، حضرت سعدؓ تینوں دفعہ اس خیال سے خاموش رہے کہ اچھا ہے حضورؐ بار بار سلام فرمائیں تو ہم کو حضورؐ کی دعا کی برکت زیادہ نصیب ہو، جب تیسری دفعہ کے بعد پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سلام نہ کیا تو وہ گھر سے نکل کر دوڑے اور دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لے جا رہے ہیں، جا کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تو مزید برکت حاصل کرنے کے لیے خاموش ہو رہا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس کیوں چلے، فرمایا کہ مجھ کو یہی حکم ہے کہ تین دفعہ سے زیادہ استیذان نہ کروں، غرض پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس تشریف لے آئے۔

اگر آج کوئی ایسا قانون مقرر کر دے کہ اجازت لے کر اؤ اور تین دفعہ میں جواب نہ ملے تو واپس ہو جاؤ تو لوگ اس کو فرعون اور مغرور سمجھیں گے، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اور حضرات سلف کا یہی طریقہ تھا اور تین دفعہ اجازت مانگنے پر اگر اجازت نہ ملے تو وہ بخوشی واپس ہو جاتے تھے، گرانی مطلق نہ ہوتی تھی، تو دیکھئے یہ صورت کیسی آسان ہے، اور اس میں کس قدر مصالح ہیں، پس ہماری معاشرت ہر طرح سے مکمل ہے، کھانے پینے میں بھی اور ملنے ملانے میں بھی، مگر افسوس ہم لوگ

اس کی قدر نہیں کرتے اور خواہ مخواہ دوسروں کے دروازوں پر دریوزہ گری کرتے ہیں۔

## تصوف دین کا اہم شعبہ ہے

پانچواں جز و دین کا تصوف ہے اس کو تو لوگوں نے بالکل ہی چھوڑ رکھا ہے، اکثر لوگوں نے تو تصوف کے متعلق یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ بہت ہی مشکل ہے، کیونکہ اس میں بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑتا ہے، یہ بالکل غلط ہے، صاحبو! تصوف کی حقیقت ہے خدا تعالیٰ سے تعلق بڑھانا سو اس میں تعلقات ناجائز تو بے شک چھوڑنا پڑتے ہیں، باقی تعلقات جائزہ ضرور یہ تو پہلے سے بھی بڑھ جاتے ہیں، صوفیاء کے تعلقات اور معاملات بیوی بچوں کے ساتھ ایسے خوشگوار ہوتے ہیں کہ اہل تمدن کے بھی ویسے نہیں ہوتے، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ تصوف والے سنگ دل ہو جاتے ہیں، حالانکہ وہ ایسے رحم دل ہوتے ہیں کہ انسان تو انسان جانوروں تک رحم کرتے ہیں، چنانچہ ان حضرات کے پاس رہ کر معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ ہر شخص کی راحت کا کس قدر خیال کرتے ہیں، لہذا اس سے متوحش ہونا نادانی ہے، جس کی وجہ سے اسلام کا ایک ضروری جز لوگوں سے فوت ہو رہا ہے، یہ جز ایسا ضروری ہے کہ قرآن شریف میں اس کی تحصیل کا جابجا امر ہے، حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ۔

یعنی اے ایمان والو حق تعالیٰ سے ڈرو، جیسا کہ حق ڈرنے کا ہے، اس میں تکمیل تقوی کا امر ہے، یہی تصوف کا حاصل ہے، اور مشاہدہ ہے کہ ایسا ڈرنا سوائے

صوفیائے کرام اہل اللہ کے کسی کو بھی نصیب نہیں ہے، ان کی بات بات میں خشیت ہوتی ہے، بے باکی اور آزادی کہیں نام کو بھی نہیں ہوتی، اب حدیث میں اس کی تاکید لیجئے، تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

ان فی جسدابن آدم مضغۃ اذاصلحت صلح الجسد کلہ واذافسدت فسدالجسد کلہ الا وھی القلب۔

یعنی انسان کے بدن میں ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو جاتا ہے تمام بدن درست ہو جاتا ہے، اور جب وہ بگڑتا ہے تو تمام بدن بگڑ جاتا ہے، سن لو وہ دل ہے، اس میں اصلاح قلب کی کتنی تاکید ہے کہ اسی کو مدار اصلاح قرار دیا گیا ہے، اور یہی تصوف کا حاصل ہے، اس میں بھی اصلاح قلب ہی کا اہتمام ہوتا ہے۔

ایک اور حدیث میں ہے جو حدیث جبرئیلؑ نے کے نام سے مشہور ہے کہ ایک دفعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام بصورت انسان حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت مبارک میں حاضر ہوئے اور صحابہؓ کی تعلیم کے لیے انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے چند سوالات کئے جن میں پہلا سوال یہ تھا۔

یا محمد اخبرنی عن الاسلام، اے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! مجھے بتلائے کہ اسلام کی حقیقت کیا ہے؟

قال الاسلام ان تشھد ان لا الہ الا اللہ و ان محمد الرسول اللہ و تقیم الصلوٰۃ و توتی الزکوٰۃ و تصوم رمضان والحج البیت ان تستطعت الیہ سبیلاً۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کے لاشریک لہ ہونے کی اور

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول اللہ ہونے کی گواہی دو، اور نماز کی پابندی کرو، اور زکوٰۃ ادا کرو، اور رمضان کے روزے رکھو، اور بیت اللہ کا حج کرو اگر وہاں تک پہنچنے کی استطاعت ہو۔

قال: فأخبرني عن الإيمان، قال: أن تُؤمن بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر ولقدر خيره وشره۔

حضرت جبرئیلؑ نے پھر پوچھا کہ مجھے ایمان کی حقیقت بتلایئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ تم اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور سب رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر ایمان لاؤ اور ان سب کی تصدیق کرو، اس سے معلوم ہوگیا کہ اسلام کے لیے تصدیق رسالت اور ایمان کے لیے قیامت اور تقدیر اور ملائکہ کی تصدیق بھی ضرورت ہے، اس کے بدون آدمی مومن نہیں ہوسکتا، اور ظاہر ہے کہ قیامت کا ماننا اس کا نام نہیں جس طرح جی چاہے مان لے، بلکہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتلایا ہے اس طرح مانے تو اس میں حساب کتاب اور وزن اعمال اور پل صراط وغیرہ سب کا ماننا داخل ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اسلام کا ایک جز و اعمال بھی ہے، پس اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جنہوں نے اجزاء دین میں انتخاب کر رکھا ہے، جیسا کہ اوپر مفصل ذکر ہو چکا۔

قال فاخبرنی عن الاحسان قال ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔

پھر حضرت جبرائیلؑ نے پوچھا کہ بتلایئے احسان واخلاص کیا چیز ہے،

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا احسان یہ ہے کہ تم خدا تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم اسے نہیں دیکھتے تو وہ یقیناً تم کو دیکھ رہا ہے، اور اس کا بھی مقتضاء یہی ہے کہ جیسی عبادت خود ان کو دیکھ کر کرتے ویسے ہی اب بھی کرو، کیونکہ نوکر کو اگر یہ معلوم ہو جائے کہ حاکم مجھے دیکھ رہا ہے گو اسے نظر نہ آتا ہو جب بھی وہ ایسا ہی کام کرتا ہے جیسا کہ خود اسے آنکھوں سے دیکھ کر کرتا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اسلام وہ ایمان کی تکمیل کرنے والی ایک تیسری چیز اور ہے جس سے عبادت بدرجۂ کمال ادا ہوتی ہے وہ احسان ہے، اور اس کی تحصیل تصوف میں مطلوب ہے۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/ ۱۵۸ تا ۱۶۹)

# روزی بدون سعی کے بھی مل جاتی ہے مگر دین

## کو حاصل کرنے لئے سعی لازم ہے

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔

ہر جاندار کی روزی خدا تعالی کے ذمہ ہے جو بدون سعی کے بھی اس کو مل سکتی ہے مگر اس پر بھی لوگ دنیوی مقاصد میں سعی کو ضروری سمجھتے ہیں اور آخرت کے ثمرات کا وعدہ تو بدون سعی کے ہے ہی نہیں چنانچہ صاف ارشاد ہے۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا۔

یعنی ہر شخص کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا جیسا کرے گا ویسا بھرے گا پھر تعجب ہے کہ لوگ دین میں سعی کو کس لیے ضروری نہیں سمجھتے جبکہ بدون سعی کے اس کے حصول کا وعدہ نہیں اہل اللہ نے اس فرق پر نظر کر کے دنیوی مقاصد کے لیے سعی کو ترک کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ روزی کا ذمہ تو حق تعالیٰ نے لے لیا ہے، اس کے لیے سعی کی کیا ضرورت ہے، اور دین کے کاموں کو ہمارے اوپر چھوڑ دیا ہے ہم کو اس کے لیے سعی کرنا چاہیے۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ انہوں نے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھی نماز کا سلام پھیر کر امام صاحب نے ان بزرگ سے ملاقات کی اور یہ سوال کیا کہ آپ کھاتے پیتے کہاں سے ہیں؟ کیونکہ آپ کوئی کام کسب وغیرہ کا نہیں کرتے، بزرگ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرئے! میں آپ کے سوال کا جواب ابھی دیتا ہوں، یہ کہہ کر نماز

کی نیت باندھ لی، سلام پھیر کر فرمایا کہ اب پوچھئے آپ کیا پوچھتے ہیں؟ امام نے کہا کہ اب تو مجھے ایک سوال اور پیدا ہوگیا اور یہ اور یہ کہ آپ نے یہ نماز دوبارہ کیسی پڑھی ہے؟ آپ تو ابھی نماز سے فارغ ہو چکے تھے، فرمایا کہ میں نے اس نماز کا اعادہ کیا ہے کیونکہ مجھے آپ کے سوال سے یہ شبہ ہوگیا تھا کہ شاید آپ کو خدا تعالیٰ کے اس ارشاد پر یقین نہیں: وَ مَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ تو مجھے آپ کے ایمان ہی میں شک ہوگیا، یہ غلبہ ہے حال کا اس لیے میں نے جلدی سے اپنی نماز کا اعادہ کیا کہ مبادا کہیں موت نہ آجائے اور یہ نماز میرے ذمہ ہی رہے۔

اس کے بعد فرمایا کہ بندۂ خدا کیا روزی کا ملنا کمانے ہی پر موقوف ہے حالانکہ خدا تعالیٰ نے فرما دیا ہے کہ روزی میرے ذمہ ہے پھر تمہارے قلب میں یہ سوال کیوں پیدا ہوا، کیا تم کو خدا کے اس ارشاد پر اعتماد نہیں وہ امام بہت شرمندہ ہوئے۔

ایک دوسرے بزرگ کا ارشاد ہے کہ دنیا خدا کا ایک گھر ہے اور ہم یہاں مہمان ہیں اور حدیث میں وارد ہے: الضیافة ثلاثة ایام کہ مہمان تین دن تک کرنی چاہیے جب ہم دنیا میں آئے تو تین دن تک تو ہم خدا تعالیٰ کے مہمان ہیں اور خدا تعالیٰ کے ہاں ایک دن ہزار سال کا ہوتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَاِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔

تو ہم کو تین ہزار سال کے لیے تو بالکل بے فکری ہے، اگر اس سے زیادہ عمر ہوئی تو پھر کچھ انتظام سوچ لیا جائے گا، ظاہر میں یہ ایک لطیفہ معلوم ہوتا ہے، مگر اس سے اہل اللہ کے مذاق کا پتہ چلتا ہے کہ دنیوی کاموں میں وہ سعی اور اہتمام کو ضروری

نہیں سمجھتے ، کیونکہ روزی کا ذمہ حق تعالیٰ نے خود لے لیا ہے، لیکن اعمال آخرت کا انہوں نے ذمہ نہیں لیا، اگر تم آخرت کے لیے ارادہ وسعی نہ کرو جب بھی وہ تم کو جنت میں دے دیں گے یا کہ از خود تم سے جنت کے کام لے لیں گے، بلکہ اس کے متعلق تو یہ ارشاد ہے۔

أَنُلْزِمُكُمُوهَا وَأَنتُمْ لَهَا كَارِهُونَ۔

اور رزق کے بارے میں حدیث نبوی وارد ہے۔

ومن كان له رزق فی راس جبل اوحضيض يات به الله۔

گر نہ ستانی بستم میرسد

پھر حیرت ہے کہ اتنے فروق کے ہوتے ہوئے ہم کو اعمال آخرت کے فکر نہیں، اور دنیا کی فکر ہے، حالانکہ ان فروق کے ہوتے ہوئے دنیا کسی درجہ میں بھی توجہ کے قابل نہیں، اور ان کا تو مقتضی یہ تھا کہ دنیا کے لیے سعی اور عمل کو ناجائز ہی کر دیا جاتا، مگر خدا تعالیٰ کی شفقت ورحمت ہے کہ انہوں نے ہمارے ضعف پر نظر فرما کر دنیا کے لیے بھی اسباب اختیار کرنے کی اجازت دے دی ہے۔

صرف اجازت بھی نہیں بلکہ بعض مواقع میں دنیا کے لیے سعی کو فرض کر دیا ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

طَلَبُ الْحَلَالِ فَرِيضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيضَةِ۔

کہ حلال روزی کا طلب کرنا بھی فریضہ شرعی کے بعد ایک فرض ہے بلکہ حکماء امت تو یہاں تک ان اسباب کی رعایت فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حرام ملازمت

میں بھی گرفتار رہو اور فراست سے ان کو اس کا ضعیف الہمت ہونا معلوم ہو تو اس کو فوراً حرام ملازمت چھوڑنے کا امر نہیں فرماتے، بلکہ یہ فرماتے ہیں کہ پہلے کوئی حلال ملازمت تلاش کرلو، اس کے بعد اس کو چھوڑنا، اور جب تک حلال ملازمت نہ ملے اسی میں گرفتار رہو، اپنے کو گنہگار سمجھتے رہو اور خدا تعالیٰ سے استغفار کرتے رہو۔

کیونکہ بعض لوگ تنگی معاش سے گھبرا کر عیسائی یا آریہ قادیانی ہو گئے ہیں اہل باطل اپنے گروہ میں بلانے کے لیے لوگوں کو طرح طرح کے طمع دلاتے ہیں جن کے سامنے فقر وفاقہ کے ساتھ اپنے دین پر جمع رہنا ہمت والوں کا کام ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۲۰۴ تا ۲۰۷)

اگر یہ شخص کسی حرام ملازمت میں مبتلا رہا بشرط کہ اس ملازمت کا فرض منصبی کسی کا اضرار نہ ہو تو اپنا ہی نقصان کرے گا، مخلوق کو تو پریشان نہ کرے گا، لیکن اگر اس نے بدون حلال روزی تلاش کی حرام ملازمت کو بھی چھوڑ دیا تو پھر دوسروں کو نقصان پہنچائے گا، اس لیے حکماء امت ان اسباب معیشت کی اتنی رعایت کرتے ہیں کہ حرام سبب کو بھی حکمت سے چھوڑواتے ہیں تو حلال سبب کو تو وہ کیوں چھڑانے لگے۔

بعض کم فہم لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں کہ حرام ملازمت کی اجازت دے دی، حالانکہ وہ حرام ملازمت کی اجازت نہیں دیتے، بلکہ وہ اس کے ایمان کو محفوظ کرنا چاہتے ہیں کہ اس وقت تو گناہ ہی میں مبتلا ہے پھر کہیں ایمان سے بھی نہ ہاتھ دھولے، نیز اس وقت تو وہ اپنا ہی نقصان کر رہا ہے اس کو چھوڑ کر کہیں مخلوق کو نہ پریشانی میں نہ ڈال دے، اور قاعدہ فقہیہ ہے کہ مفسدہ یسیرہ کو مفسدہ عظیمہ سے

بچنے کے لیے گوارا کیا جاتا ہے، لیکن اس قاعدہ سے کام لینے کا ہر ایک کو حق نہیں اس کا موقع ومحل محقق ہی سمجھ سکتا ہے خوب یاد رکھو۔

غرض میں یہ کہہ رہا تھا کہ اسباب دنیا اسباب دین کے مقابلے میں تو اس قابل بھی نہیں کہ ان کے لیے سعی کی جائے، نہ کہ ایسی سعی کریں کہ آخرت کی سعی چھوڑ دیں ،مگر افسوس ہے کہ اکثر مسلمان اسباب دنیا کے اختیار کرنے کو تو ضروری سمجھتے ہیں اور دین کے بارے میں اسباب کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، پھر بعض لوگ جو دین ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے وہ تو قابل خطاب ہی نہیں، شکایت تو ان لوگوں کی ہے جو دین کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، اور پھر اس کے اسباب اختیار نہیں کرتے، بزرگوں کے پاس آتے جاتے ہیں لیکن ان سے دین کا راستہ نہیں پوچھتے بڑی دوڑ ان کی یہ ہے کہ بزرگوں سے جا کر عرض کرتے ہیں کہ ہم کو ایک توجہ سے کامیاب کر دیجئے گویا وہ بھی اسی طرح کامیاب ہو گئے تھے، میں کہتا ہوں اسی پر فیصلہ ہے اگر محل توجہ سے دین کامل ہوسکتا ہے تو ان بزرگ ہی سے پوچھ لو کہ حضور آپ بھی توجہ ہی سے کامیاب ہوئے تھے یا آپ کو کچھ کرنا بھی پڑا تھا اگر وہ محض توجہ سے کامیاب نہیں ہوئے تو پھر آپ کو ان سے ایسی درخواست کرنے کا کیا حق ہے۔

صاحبو! یہ سب نفس کے بہانے ہیں وہ آپ کو ان دھوکوں سے گمراہ کرنا چاہتا ہے اور منشا اس کا محض کم ہمتی اور قلت مبالاۃ بالدین ہیں کہ ہم کو خدا کی اطاعت میں وہ اہتمام نہیں جو دنیا کے کاموں میں ہے۔

بعض لوگ دھوپ کی وجہ سے جماعت کی نماز ترک کر دیتے ہیں لیکن اگر

اس وقت حاکم بلاوے تو دھوپ کبھی مانع نہ ہو عین دو پہر کے وقت حاکم کے پاس جاویں گے پھر وہاں سے آ کر دھوپ کی کچھ شکایت نہ کریں گے بلکہ حاکم سے ملاقات کرنے پر فخر کریں گے کہ ہم سے آج خوب باتیں ہوئیں، حاکم نے فلاں مقدمہ کی بابت یوں سوالات کیے، ہمارا فلاں معاملہ کے متعلق یوں کہا، حالانکہ یہ کوئی فخر کی بات نہ تھی، آخر حاکم کون ہے تمہارے لیے تمہارے ہی جیسا ایک آدمی ہے، فخر کی بات تو یہ ہے کہ نماز میں حق تعالیٰ سے باتیں ہوتی ہیں ہم اس قابل تو کہاں تھے کہ خدا تعالیٰ ہم سے باتیں کریں واللہ ہم تو اس قابل بھی نہیں ہیں کہ ہم ان کا نام ہی لے لیں۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب
ہنوز نامِ توگفتن کمال بےادبی ست

مگر یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ انہوں نے ہم کو اجازت دے دی کہ نماز میں جب چاہا ان سے بات کرلو، پھر وہ ہماری باتوں پر توجہ بھی فرماتے ہیں، ہماری عرض ومعروض کا جواب بھی دیتے ہیں، پھر نماز میں ہم کو قرآن پڑھنے کی اجازت دی، بلکہ اس کو فرض کر دیا کہ جو کہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے گویا اس طرح حق تعالیٰ بھی ہم سے باتیں کرتے ہیں، پھر یہ کہ کس قدر رحمت ہے کہ ہم کو اسم علم سے پکارنے کی یعنی یا اللہ کہنے کی اجازت دی کہ ان کا نام لے کر پکار سکتے ہیں، ذرا کسی حاکم کو تو نام لے کر پکارو، فوراً جرم قائم ہو جاوے گا، پھر نام بھی اتنا آسان کہ بچہ سب سے پہلے اللہ کا نام یاد کر لیتا ہے، افسوس ایسے رحیم وکریم خدا سے باتیں کرنے کے لیے لوگوں کو دھوپ مانع ہوتی ہے اور بلا وجہ جماعت کی نماز چھوڑ دیتے ہیں۔

# اہتمام سے جب اخلاص کے ساتھ عمل کیا جائے تو ناقص عبادت کامل ہونے لگتی ہے

پھر ایک رحمت یہ ہے کہ وہ ہماری اطاعت ناقصہ کو بھی قبول کر لیتے ہیں، باقی یہ بات کہ کیسے معلوم ہوا کہ ہماری یہ اطاعت ناقصہ قبول ہوتی ہے سو حضرت حاجی صاحبؒ نے قبول اطاعت کی ایک علامت عجیب بیان فرمائی۔

فرمایا کہ قاعدہ ہے کہ جس شخص کے آنے سے کسی کو ناگواری ہوا کرتی ہے تو اگر وہ قادر ہو تو وہ دوسرے وقت اس کو اپنے گھر میں گھسنے نہیں دیا کرتا، تو یاد رکھو اگر حق تعالیٰ کو تمہاری پہلی عبادت ناگوار ہوئی ہوتی تو وہ دوسرے وقت تم کو مسجد میں نہ گھسنے دیتے، نہ نماز کی توفیق دیتے بس جب ایک نماز کے بعد دوسرے وقت تم کو پھر اسی نماز کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلے وقت کی نماز قبول ہو چکی، اسی طرح تمام اطاعت میں سمجھ لو۔

واقعی عجیب بات بیان فرمائی، گو یا حجت قطعیہ نہ ہو مگر، انا عندظن عبدی بی، کے ساتھ ملا کر امید ہے کہ گر ہم حق تعالیٰ کے ساتھ یہی گمان رکھیں تو قبولیت کا اچھا قرینہ ہے، آخر کوئی تو وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے تم کو تو پانچوں وقت مسجد میں آنے کی توفیق دے دی اور بہت سی مخلوق ایسی ہے جن کو سال میں ایک وقت آنے کی بھی توفیق نہیں دی، معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کو ان کا مسجد میں آنا گوارا نہیں۔

ایک گنوار کا قصہ ہے کہ اس کا بچھڑا مسجد میں گھس گیا تھا، ملّا خفا ہونے لگا کہ

لوگ نہ نماز پڑھتے ہیں نہ کچھ کرتے ہیں اور جانوروں کو مسجد میں گھسا دیتے ہیں گنوار نے ملّا سے کہا کہ کیوں بڑبڑ کرتا ہے، جانور تھا مسجد میں گھس آیا کبھی ہم کو بھی آتے ہوئے دیکھا ہے، دیکھئے توفیق نہ ہونا اس کا نام ہے۔

اسی طرح ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ آقا اور غلام بازار میں کسی کام کو گئے تھے راستہ میں نماز کا وقت آ گیا غلام نمازی تھا اس نے آقا سے نماز کی اجازت مانگی اس نے اجازت دے دی کہ اچھا جلدی نماز پڑھ کے چلے آؤ مسجد کے باہر بیٹھا ہوا ہوں، اب خدا کی قدرت دیکھئے! کہ غلام کو تو مسجد میں آنے کی اجازت دی گئی اور آقا کو باہر ہی سے روک دیا گیا، غلام نے آکر نماز پڑھی اور نہایت اطمینان سے فرض ونوافل کو پورا کیا حتیٰ کہ سب نمازی فارغ ہو کر چلے گئے، اس کا آقا انتظار کرتے کرتے تھک گیا، اس نے ایک شخص سے جو سب سے آخر میں مسجد سے نکلا تھا پوچھا کہ اب مسجد میں کتنے آدمی ہیں، کہا صرف ایک آدمی ہے وہ سمجھا کہ شاید اب جلدی آجائے گا مگر غلام نے وہاں تنہائی میں کوئی وظیفہ شروع کر دیا پھر بھی نہ آیا آخر آقا نے تنگ ہو کر آواز دی کہ میاں کہاں رہ گئے باہر کیوں نہیں آتے، غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا، آقا نے پوچھا کون نہیں آنے دیتا؟ کہا جو تم کو باہر سے اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو اندر سے باہر نہیں جانے نہیں دیتا، سبحان اللہ خوب جواب دیا۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۲۱۲ تا ۲۱۶)

تو سمجھ لیجئے کہ مقاصد میں ہمیشہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے ناقص حالت پر کوئی قناعت نہیں کرتا، تجارت کرتے ہیں تو اس میں بھی کمال مطلوب ہوتا ہے، لاکھ

دولاکھ پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ جس قدر ترقی ہواس سے آگے کے طالب رہتے ہیں ایسا کوئی نہیں کرتا کہ جب ضرورت سے زیادہ آمدنی ہوجائے تو آئندہ کے لیے سعی اورکوشش چھوڑ دے، نہیں بلکہ کئی قسم کی تجارتیں نئی نئی شروع کردیتے ہیں، اگر ایک شخص کے یہاں بساط خانہ کی تجارت ہے اور اس سے معقول آمدنی ہو ہی ہے تو سرمایہ زیادہ ہوجانے کے بعد وہ کپڑے کی بھی ایک دکان کھول دیتا ہے اور ترقی ہو ئی تو جوتوں کی دوکان بھی کرلیتا ہے، یہاں تک کہ پہلے اگر باپ بیٹے سب مل کر ایک دوکان کررہے تھے تو اب ہر بیٹے کی الگ دوکان کھول دی جاتی ہے، چنانچہ مشاہدہ ہے پھر بہت سے مکان خرید کر کے کرائے پر دئے جاتے ہیں غرض ہر وقت ترقی کی دھن لگی رہتی ہے، کسی حد پر بس نہیں کرتے وہ حال ہوجاتا ہے۔

لاینتہی ارب الاالیٰ ارب۔

اگر کسی کے پاس ضرورت کے موافق زمین موجود ہوتو وہ اس پر قناعت نہیں کرتا، بلکہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ آج ایک گاؤں پورا خرید لوں، ایک گاؤں خریدنے کے بعد دوسرے گاؤں کی تمنا رہتی ہے۔

غرض انسان دنیوی ترقی میں ہمیشہ زیادت کا طالب رہتا ہے یہاں تک کہ موت ہی سے یہ سلسلہ منقطع ہوتا ہے، اس سے پہلے منقطع نہیں ہوتا شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

ہفت اقلیم ار بگیرد پادشاہ
ہمچناں در بند اقلیمے دگر

دنیا دار کو قناعت تو ہوتی نہیں، ہاں خاک گور ہی سے اس کی حرص منقطع ہوتی ہے۔

شاید آپ مجھ کو کوئی ایسا آدمی دکھلائیں کہ جس نے دس ہزار روپیہ یا دس گاؤں حاصل کر کے بس کر دیا ہو، اور آئندہ کے لیے سعی کو ختم کر دیا ہو، لیکن اول تو یہ بہت ہی شاذ ہے، لاکھوں میں ایک آدمی ایسا ہوگا اگر لاکھوں میں ایک آدمی آپ نے ایسا دکھلا بھی دیا تو اس سے میرے بیان پر نقص وارد نہیں ہوتا، کیونکہ قواعد میں اکثر کا لحاظ ہوا کرتا ہے اور اکثر کی حالت وہی ہے جو میں نے بیان کی پھر میں کہتا ہوں کہ جو شخص ایسا آپ دکھلائیں گے وہ دیندار ہوگا دنیا دار نہ ہوگا، اور گفتگو اہل دنیا کی حالت میں ہے اور اگر وہ دین دار بھی نہ ہو دنیا دار ہی ہو تو اس کا ایک سرسری جواب تو یہ ہے کہ اس کے نزدیک غالباً یہی کمال ہوگا جب وہ مال حاصل ہو گیا تو مقصود تک وصال ہو گیا، اس سے آگے کوئی کمال اس کی نظر میں ہے ہی نہیں، بس وہ بھی طالب کمال نکلا ناقص حالت پر اس نے بھی قناعت ہرگز نہیں کی۔

معناً وہ اب بھی ترقی کر رہا ہے کیونکہ یہ شخص عاقل دنیا دار ہے نادان نہیں، وہ دنیا کی روح کو سمجھ گیا ہے کہ اسباب معاش سے مقصود سکون قلب و راحت قلب ہے اور ہر وقت اسباب معاش میں لگے رہنے سے راحت و سکون قلب میسر نہیں ہوتا ، دل پریشان اور مشغول رہتا ہے اس لیے اس نے ایک معقول سرمایہ حاصل کر کے آئندہ کے لیے صورت ترقی کو بند کر دیا، لیکن اب بھی حقیقت میں وہ ترقی کر رہا ہے پہلے اسباب میں ترقی کر رہا تھا اب مسبب اور مقصود میں ترقی کر رہا ہے، یعنی راحت و آرام کے بڑھانے میں مشغول ہے۔

غرض یہ بات ثابت ہوگئی کہ دنیاوی اسباب میں ہر شخص کمال کا طالب ہے کسی قدر حاصل پر کوئی بس نہیں کرتا بلکہ اس سے بھی آگے کا طالب رہتا ہے اور اگر کوئی شخص کسی خاص حد پر بس بھی کرتا ہے تو ناقص حالت پر ہرگز بس نہیں کرتا بلکہ کوشش اور سعی کو ہمیشہ درجہ کمال پر پہنچا کر ختم کیا جاتا ہے مثلاً اگر کسی کو تجارت میں نقصان ہورہا ہوتو اس حالت پر کوئی بھی سعی کو ختم نہ کرے گا، بلکہ جب اتنا سرمایہ اکٹھا ہوجائے کہ وہ سب ساری عمر کو کافی ہوجاوے بلکہ بچ بھی جاوے اس وقت بعض لوگ سائی کو ختم کر سکتے ہیں پس یہ بات یقیناً معلوم ہوگئی کہ ناقص حالت پر کوئی بھی قناعت نہیں کرتا قناعت ہمیشہ حصول کمال ہی کے بعد ہوتی ہے وہ بھی قناعت صوری ہے ورنہ حقیقت میں اب بھی ترقی ختم نہیں ہوئی۔

## دین اور عبادت کے سلسلہ میں ناقص

### حالت پر ہرگز قناعت نہیں کرنی چاہئے

پھر حیرت ہے کہ دین میں لوگوں کو ناقص حالت پر قناعت کیوں ہے چنانچہ بڑی دینداری آج کل یہ ہے کہ نماز پانچوں وقت کی پڑھ لی جب نماز پڑھنا شروع کردی تو اب وہ اپنے کو دین دار سمجھنے لگتے ہیں اور اسی پر قناعت کر لیتے ہیں پھر افسوس یہ ہے کہ جس نماز پر قناعت کی جاتی ہے وہ بھی کامل نہیں ہوتی ،یعنی اول تو محض نماز کے کامل کر لینے سے بھی دین کامل نہیں ہوتا، چہ جائیکہ وہ نماز بھی کامل نہ ہو، ناقص ورناقص ہی ہواس پر قناعت کر لینا تو بہت ہی کوتاہی ہے، بعضے نماز کے

بعد زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں، زکوٰۃ دے دی تو گویا جنت خرید لیا اگر حج بھی کر لیا تو پھر کیا تھا جنید وقت ہو گئے، اب انہیں آگے ترقی کی کچھ ضرورت نہیں رہتی وہ اسی پر دین کو کامل سمجھ کر سعی اور ترقی بند کر دیتے ہیں عوام کی کیا شکایت کی جائے افسوس یہ ہے کہ بعض اہل علم بھی اس بلا میں گرفتار ہیں۔

ایک عالم نے مجھے لکھا کہ آپ نے جو وظیفہ وغیرہ مجھ کو بتلایا تھا وہ تو کر لیا اب آگے کچھ اور سبق بھی ہے یا بس ختم ہو گیا، افسوس دنیا مردار تو ایسی چیز ہے کہ اس میں کسی حد پر بھی قناعت نہیں کی جاتی اور دین کو ایسا حقیر سمجھ لیا ہے کہ چار دن کام کر کے اپنے کو کامل اور منتہی ہونے کا احتمال سوجھنے لگا، مجھے ان عالم کا یہ خط سخت ناگوار ہوا، اور میں سمجھا کہ ان کو دین کا ادب بھی بالکل نہیں، کیونکہ ان کے الفاظ سے تمسخر ٹپکتا تھا میں نے ان کو لکھ دیا کہ میرا تم سے نباہ نہ ہوگا میں تم کو قابل خطاب بھی نہیں سمجھتا، تم کو نہ دین کی طلب ہے نہ اس کا ادب دل میں ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۲۲۰ تا ۲۲۳)

## ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے

اگرچہ لوگ فقط مال کو حق العباد سمجھتے ہیں مگر ایک حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق العباد مال ہی میں منحصر نہیں بلکہ حقوق العباد کے اقسام اور بھی ہیں۔

وہ حدیث یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں جو خطبہ پڑھا اس میں آپؐ نے صحابہؓ سے دریا فرمایا: ای ھذا، یہ کونسا دن ہے، قال اللہ ورسولہ اعلم، صحابہ نے عرض کیا خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سے زیادہ

جانتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اَلَیْسَ یَوْمُ النَّحْرِ، کیا یہ قربانی کا دن نہیں ہے؟ قالوا بلیٰ، صحابہؓ نے عرض کیا بے شک اس سے صحابہؓ کا غایت ادب معلوم ہوا کہ جس بات کو جانتے بھی تھے اس کو بھی اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حوالے کر دیتے تھے، اپنی شان علم ظاہر نہ کرتے تھے اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ یہ مقام کون سا ہے؟ پھر اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے، صحابہؓ نے عرض کیا بے شک پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہینہ کی بابت سوال کیا اور اسی طرح خود ہی فرمایا کیا یہ ذی الحجہ کا مہینہ نہیں ہے، صحابہؓ نے عرض کیا بے شک پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ إنَّ دِماءَكُم، وأمْوالَكم وأعْراضَكُم حرامٌ عَلَيْكُم كَحُرْمَة يومِكُم هَذَا، في شهرِكُمْ هَذَا، في بلَدِكُم هَذَا، ألا هَلْ بلَّغْت۔ (متفق علیہ)

کہ تمہارے اموال اور جانیں اور آبروئیں آپس میں تم پر ہمیشہ کے لیے ایسی ہی حرام ہے جیسے اس مہینے میں، اس مقام میں، اس دن میں حرام ہے، پس معلوم ہوا کہ ایک قسم حقوق العباد کی جان کو تکلیف پہنچانا ہے، مثلاً ناحق مارنا جس میں اہل حکومت اور معلمین بکثرت مبتلا ہیں اور ایک قسم حقوق العباد کی کسی کی آبرو کو صدمہ پہنچانا بھی ہے، یعنی کسی پر لعن طعن کرنا، کسی کی تحقیر کرنا، کسی پر بے وجہ بدگمانی کرنا، یہ سب حرام ہے، سی طرح کسی کی غیبت کرنا بھی ناجائز ہے بلکہ بعض حقوق آبرو کا درجہ زنا وغیرہ سے بھی بڑھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہماری حالت یہ ہے کہ بالخصوص آبرو کے حقوق کی ذرا پرواہ نہیں ایسے لوگ بکثرت ہیں جو کسی کا ایک پیسہ بھی نہیں رکھتے حقوق مالیہ میں فروگزاشت نہیں کرتے اور اپنے آپ کو بڑا متقی سمجھتے ہیں کہ ہم کسی کا حق نہیں رکھتے مگر آبرو کے حقوق میں وہ

بھی مبتلا ہیں، ہماری کوئی مجلس غیبت سے خالی نہیں ہوتی، عوام کی تو کیا شکایت علماء کی مجالس غیبت سے خالی نہیں، اور سب سے بڑھ کر غضب یہ ہے کہ مشائخ کی مجالس بھی اس سے خالی نہ رہیں، عوام تو عوام ہی کی غیبت کرتے ہیں جن میں اکثر فساق بھی ہوتے ہیں جن کی آبرو کا زیادہ حق بھی نہیں، لیکن علماء جب غیبت کریں گے تو وہ عوام کی نہ کریں گے بلکہ علماء کی غیبت کریں گے اور مشائخ ہمیشہ مشائخ کی غیبت کریں گے تاکہ یہ ہم سے بڑھ نہ جائیں، لوگ ہم سے زیادہ ان کے معتقد نہ ہو جائیں، اس لیے اکثر علماء ومشائخ کی مجلسیں علماء ومشائخ کی غیبت سے بھری ہوئی ہے ہوتی ہیں، یہ لوگ مقبولانِ الٰہی واولیاء اللہ کی غیبت کرتے ہیں تو اس بارے میں یہ عوام سے بڑھے ہوئے ہیں، یادرکھو! یہ بات معمولی نہیں ہے لوگ اس کو معمولی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ باتیں سارے نماز روزہ کو بھی لے ڈوبیں گی جس کی تم نے آبرو ریزی کی ہوگی قیامت میں اس کو تمہاری نیکیاں دلوائی جائیں گی اس لیے نماز روزہ سے زیادہ حقوق آبرو کا اہتمام کرنا چاہیے۔

## مال اور جان کا حق تو مرنے پر ختم ہو جاتا ہے

### اور آبرو کا حق بعد موت کے بھی باقی رہتا ہے

اگر بعد مرنے کے کسی کو مارو تو اس کو اس کا احساس نہیں ہوتا اس لیے ضرب کا قصاص بھی نہ ہوگا، اسی طرح مرنے کے بعد کسی کا مال چراؤ تو وہ مال اس کا نہیں رہا ورثاء کا ہو گیا، لیکن مرنے کے بعد کسی کو متہم کرو اور اس کو بُرا بھلا کہو تو غیبت کا گناہ اس وقت بھی ہوگا اور اب اس کا کفارہ یہ ہے کہ میت کے لیے بکثرت دعاء واستغفار کرو، امید ہے کہ رب تعالیٰ اس کو تم سے راضی کر دیں گے۔

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ مرنے کے بعد ضرب کا احساس نہیں ہوتا، شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو ،کسرعظم المؤمن میتا ککسرہ حیا،مسلمان کی ہڈی کو مرنے کے بعد توڑنا ایسا ہے جیسا زندہ کی ہڈی توڑنا، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تشبیہ ہے جس سے میت کے بعد موت کی زندہ کے برابر احساس ہونے کا شبہ کیا جاوے۔

اگر ایسا ہوتا تو شرعاً اس شخص سے قصاص لیا جاتا بلکہ یہ تشبیہ بعض وجوہ میں ہے۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ بعد موت کے بھی روح کو کسی قدر تعلق جسم سے رہتا ہے اور وہ ایسا تعلق ہے جیسا کہ اس وقت ہمارے جسم کو لباس سے تعلق ہے پس اگر کوئی ہمارا اترا ہوا کُرتہ پھاڑ دے تو ہم کو کلفت ہوتی ہے، نیز اس تعلق کا یہ اثر بھی ہے کہ قبر کے پاس جا کر سلام و دعا جو کچھ کی جاتی ہے مردہ اس کو سنتا ہے، اور شہداء میں یہ تعلق عام مومنین سے زیادہ ہوتا ہے،جس کا اثر یہ ہے کہ ان کا جسم بعد موت کے سالم رہتا ہے زمین اس کو کھا نہیں سکتی، نیز اس تعلق سے بعض اولیاء کو مرنے کے بعد قوت تصرف بھی عطا ہوتی ہے،لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم ان کے مزاروں پر جا کر ان سے مرادیں مانگا کریں کہ شرعاً یہ بالکل ناجائز ہے، ہاں اس کا مضائقہ نہیں کی ان کے وسیلہ سے حق تعالیٰ سے دعا مانگی جائے ،باقی ان سے یہ بھی نہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کرو کیونکہ شریعت میں اس کا کہیں ثبوت نہیں کہ وہ ایسی دعاؤں کے ماذون ہیں۔

اس حدیث سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں جا کر مردوں کے لیے دعا کی جائے یہ بھی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مردوں کو احیا کی دعا سے نفع

ہوتا ہے اوراس کے منتظر رہتے ہیں ،مگراس کا کہیں ثبوت نہیں کہ اگر ان سے یہ کہا جائے کہ تم ہمارے واسطے دعا کروتو وہ دعا کر دیتے ہیں اوراولیاء سے زیادہ انبیاء علیہم السلام کی ارواح کو اپنے اجسام سے تعلق رہتا ہے،جس کے بعض آثار یہ ہیں کہ ان کی میراث تقسیم نہیں ہوتی ،ایک اثر یہ ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا ان کے بعد بھی حرام ہے گویا حکم آیات واحادیث میں صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے بیان کیا گیا ہے مگر بعض علماء نے تمام انبیاء کے لیے یہ حکم عام مانا ہے واللہ اعلم۔

توکسر عظم سے جسمانی ایذاء تونہیں ہوتی ،ہاں روحانی ایذاء ہوسکتی ہے ،اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مردہ کی ہڈی توڑنا ایسا ہی ہے جیسا کہ زندہ کی ہڈی توڑنا۔

حضرت استاد علیہ الرحمہ مولانا محمد یعقوب صاحب فرماتے تھے کہ مردہ کے جسم کو جلانے سے اس کی ایسی ایذاء ہوتی ہے جیسے تمہارے چادرہ کو اتار کر کوئی تمہارے سامنے جلا دے ،تو اس سے تم کو رنج اور غم ہوتا ہے اسی طرح روح کو بھی رنج ہوتا ہے ،ظاہر ہے کہ چادرہ کے جلانے سے ہمارے جسم کو ایذاء نہیں ہوتی صرف روحانی ایذاء ہوتی ہے،یہی حال بعد موت کے بدن جلانے کا ہے ایک وجہ تشبیہ تو یہ ہوئی۔

دوسرے یہ بھی احتمال ہے کہ تشبیہ گناہ میں ہو کہ جب گناہ زندہ کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے ایسا ہی میت کی ہڈی توڑنے میں ہوتا ہے اور وجہ شبہ ترک احترام ہے کیونکہ ہڈی توڑنے اور بدن جلانے سے میت کی بے حرمتی ہوتی ہے غرض احترام میت کا اب بھی باقی ہے۔

اس تقدیر پر اس حدیث کا مآل بھی حقوق آبرو کی طرف ہو جائے گا حاصل یہ ہوا کہ چونکہ مردہ کا احترام بعد موت کے بھی باقی ہے اور کسر عظم میں اس کی بے حرمتی اور بے عزتی اس لیے یہ فعل حرام ہے اور ظاہر ہے کہ اقوال کی تاثیر بے حرمتی میں کسر عظم سے زیادہ ہے پس مردوں کو برا بھلا کہنا بھی حرام ہے۔

## کسی مردہ کو بُرا کہنے کی اجازت ہے یا نہیں؟

حدیث میں وارد ہے کہ اپنے مردوں کو بُرا نہ کہو کیونکہ وہ اعمال کے جزا کو پہنچ چکے ہیں، اگر واقعی میں وہ بُرے ہیں تو اپنے افعال کی سزا بھگت رہے ہیں، پھر تمہارا ان کو بُرا بھلا کہنا بے سود ہے، اور اگر واقعی میں وہ اچھے ہیں تو ان کو بُرا کہنے سے تم کو گناہ ہوگا، اس لیے یہ حرکت قابل ترک ہے، البتہ جو لوگ اپنی زندگی میں کوئی بُرا طریقہ رائج کر گئے ہوں اور ان کی موت کے بعد بھی لوگ اس کا اتباع کرتے ہوں ان کو بُرا بھلا کہنا کا مضائقہ نہیں، تاکہ لوگ اس کے اتباع سے باز آجائیں، پس مسلمان مردوں کی بے حرمتی کرنا خواہ فعل سے ہو یا قول سے ہر طرح ناجائز ہے اور اس بے حرمتی کے بہت سے شعبے ہیں جن میں سے ایک شعبہ وہ بھی ہیں جس کی ضرورت کی طرف مجھ کو میرے ایک عنایت فرمانے توجہ دلائی۔

وہ یہ کہ سنا گیا ہے کہ بعض لوگ قبرستانوں میں پیشاب کرتے ہیں اور قبرستانوں میں زمین میں گھر بناتے ہیں تو اس میں ایک تفصیل ہے جس کو غور سے سن لینا چاہیے وہ یہ کہ اگر قبرستان کی زمین کسی کی ملک ہو تب تو اس کو قبروں کے

نشانات مٹا کر اس جگہ مکان بنانا جائز ہے، مگر جس جگہ قبر کا نشان ہو وہاں پاخانہ بنانا ٹٹی پیشاب کرنا اس وقت بھی حرام ہے اور جو قبرستان وقف ہے ان کا استعمال بالکل حرام ہے، ان میں کسی کو مکان بنانا جائز نہیں، اور اکثر قبرستان وقف ہی ہیں، اس لیے اس سے بچنا چاہیے اور اس میں آخرت کا ضرر تو ہے ہی کہ گناہ ہوتا ہے لیکن بعض دفعہ دنیوی ضرر بھی ہوتا ہے کہ بعض مردے پٹک بھی دیتے ہیں، چنانچہ ایسے واقعات اکثر سنے گئے ہیں، میں یہ نہیں دعویٰ کرتا کہ سب حکایات صحیح ہیں مگر بہت سی سند صحیح سے ثابت بھی ہے پھر اس سے قطع نظر اس میں تو کچھ شک ہی نہیں کہ قبروں پر ٹٹی پیشاب کرنے سے مردوں کو ایذاء ہوتی ہے۔

ان میں بعض اولیاء بھی ہیں جن کی نسبت حدیث صحیح میں وارد ہے۔

مَنْ اٰذٰى لِي وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ۔

یعنی جو کوئی میرے کسی ولی کو ایذاء پہنچاوے اس کو خدا تعالیٰ کی طرف سے اعلان جنگ دیا جاتا ہے، اللہ اکبر یہ وعید کتنی سخت ہے، خدائی الٹی میٹم کا کون مخالفت کرسکتا ہے، پھر اس وعید کا ظہور کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ خود اولیاء کو تصرف کی اجازت دیتے ہیں اور وہ اپنے تصرف سے اس شخص کو ضرر پہنچا دیتے ہیں اور بعض دفعہ اولیاء کوئی تصرف نہیں کرتے لیکن حق تعالیٰ کو اپنے محبوب کی بے حرمتی پر غیرت آتی ہے کہ ہمارے محبوب کے ساتھ یہ معاملہ کیوں کیا گیا اس لیے حق تعالیٰ خود اس شخص کو کسی بلا میں گرفتار کردیتے ہیں غرض اولیاء کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی کرنا بڑا سنگین جرم ہے اگر وہ حضرات اپنی شفقت سے کچھ بھی نہ کہیں تو غیرت حق نہیں چھوڑتی اس لیے اس سے بہت بچنا چاہیے عارف شیرازی فرماتے ہیں ؎

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
بادردکشاں ہرکہ درافتاد برافتاد

مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہیچ قومے راخدا رسوا نہ کرد
تادلِ صاحب دلے نامد بدرد

یادرکھو جب کوئی قوم کسی ولی کا دل دکھاتی ہے تو ان کا صبر ضائع نہیں ہوتا، حق تعالیٰ بعض دفعہ ان کی طرف سے اس طرح انتقام لیتے ہیں کہ خود ان کو بھی اس کی خبر نہیں ہوتی یہ مت سمجھو کہ حقوق العباد صرف جان و مال ہی کے متعلق ہیں، بلکہ آبرو بھی حقوق العباد میں داخل ہے اور اس کے حقوق جان و مال سے بھی زیادہ ہیں کہ بعد موت کے بھی اس کے حقوق باقی رہتے ہیں جن میں سے ایک حق یہ بھی ہے جس کو ابھی ذکر کیا کہ بعد مرنے کے مسلمانوں کی قبروں کا احترام کیا جائے ان کی بے حرمتی نہ کی جائے، جس کو میں نے ضروری تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے یہ مضمون میرے دوست نے کئی مرتبہ مجھ کو یاد دلایا مگر ہر بیان کے وقت میں اس کو بھول جاتا تھا، کیونکہ فرمائشی مضمون بہت کم یاد رہتے ہیں لیکن اس مرتبہ یاد رہا اور بحمد للہ اس کا بیان کافی ہوگیا۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بعض مخلصین قبرستانوں کی حفاظت کے لیے خاص اہتمام کر رہے ہیں سب مسلمانوں کو ان کا ساتھ دینا چاہیے اور ان کی اعانت کرنی چاہیے۔

اس تقریر پر شاید کوئی یہ اشکال کرے کہ تم نے بیان کیا ہے کہ اولیاء اللہ کی بے حرمتی سے وبال آتا ہے لیکن ہم تو اب تک قبرستان میں ٹٹی پیشاب کرتے رہے ہم کو تو کچھ ضرر نہیں ہوا ہم تو ویسے ہی ہٹے کٹے صحیح وسالم موجود ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ یہ اعتراض ویسا ہی ہے جیسا کہ کفار نے انبیاء سے کہا تھا کہ تم روز روز ہم کو عذاب سے ڈراتے ہو کہ اگر کفر کروگے تو یوں وبال آئے گا، یوں بلائیں نازل ہوں گی، مگر ہم تو مدت سے کفر کر رہے ہیں اور اب بھی کفر میں مبتلا ہیں ہم پر تو کچھ بھی عذاب نہ آیا پس جو انجام کفار کے اس اعتراض کا ہوا تھا وہی انجام یہ حضرات سوچ لیں، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ اگر اب تک کوئی وبال تم پر نہیں آیا تو کیا آئندہ کی کے لیے بھی تمہارے پاس وحی آگئی ہے کہ تم کبھی وبال میں مبتلا نہ ہوگے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا اعتراض کر رہے ہیں وہ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہے، لیکن وبال کی دو قسمیں ہیں، ایک ظاہری ایک باطنی، ظاہری وبال تو یہ ہے کہ جان و مال کا نقصان ہو جاوے صحت برباد ہو جاوے اور یہ وبال اہون ہے اور باطنی وبال یہ ہے کہ دل سیاہ ہو جاوے اس میں اعمال صالحہ کی صلاحیت باقی نہ رہے، نیک کاموں سے دل گھبرانے لگے، یہ وبال بہت سخت ہے، کیونکہ جب دل سیاہ ہو جاتا ہے تو بعض دفعہ ایمان بھی سلب ہو جاتا ہے، جس کا انجام ابداً لآباد کے لیے عذاب جہنم ہے، پس میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ اس وقت بھی وبال سے خالی نہیں ہے، باطنی وبال میں گرفتار ہیں کہ ان کے دلوں سے قہر اور خداوندی کا خوف نکل گیا ہے جبھی تو اتنی جرأت ہے کہ قہر خداوندی کا نام سن کر اپنی حرکتوں سے

باز آنے کا قصد نہیں کرتے، بلکہ الٹا اس کے ساتھ تمسخر کرتے ہیں اگر ان کے دلوں میں قہر الٰہی کا خوف ہوتا تو جس کام میں اس کا وہم بھی ہوتا اس سے فوراً الگ ہو جاتے، اسی مضمون کو مولانا ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔

آتشی گرنامدست ایں دود چیست
جان سیہ گشت وروان مردود چیست

یعنی تم جو کہتے ہو کہ ہم پر گناہوں کا وبال نہیں آیا مولانا فرماتے ہیں کہ تمہارے اندر قہر کی آگ تو جل رہی ہے اگر تمہارے اندر آگ نہیں ہے تو یہ دھواں کہاں سے آیا یعنی یہ کلمات جرأت وبیبا کی کے تمہارے ذہن سے کیوں نکل رہے ہیں جن سے دل کے سیاہ ہو جانے کا پتہ چل رہا ہے اور یہ بہت بڑا قہر ہے جو ظاہری قہر سے بھی بڑھا ہوا ہے یہاں تک حقوق العباد کا ذکر ہو گیا۔

## صبر کی حقیقت اور اس کے اقسام

صبر کے معنی لغت میں حبس کے ہیں یعنی روکنا اور یہی معنی شریعت میں بھی ہے صرف ایک قید زیادہ ہے یعنی حبس النفس علی ماتکرہ انسان کا اپنے نفس کو اس کی ناگوار بات پر روکنا اور ناگواری کے اقسام پر شرعاً صبر کی تین قسمیں ہیں۔

(۱) صبر علی العمل۔ (۲) صبر عن العمل۔ (۳) صبر فی العمل۔

صبر فی العمل یہ ہے کہ نفس کو کسی کام پر روک لینا یعنی اس پر جم جانا اور قائم رہنا مثلاً نماز زکوۃ وغیرہ کی پابندی کرنا اور بلا ناغہ ان کو ادا کرتے رہنا۔

صبر فی عمل یہ ہے کہ عمل کے وقت نفس کو دوسری طرف التفات کرنے سے روکنا اور ہمہ تن متوجہ ہو کر کام کو بجالانا مثلاً نماز پڑھنے کھڑے ہوئے یا ذکر میں مشغول ہوئے تو نفس کو یہ سمجھا دیا کہ بچہ جی اتنی دیر تک تم سوائے نماز یا ذکر کے اور کوئی کام نہیں کر سکتے پھر دوسرے کاموں کی طرف توجہ کرنا فضول ہے، اتنی دیر تک تجھ کو نماز یا ذکر ہی طرف متوجہ رہنا چاہیے، جب یہ ملکہ راسخ ہو جاتا ہے تو سب اعمال ٹھیک ٹھیک ادا ہوتے ہیں بعض لوگوں کو فرائض شرعیہ کی پابندی تو نصیب نہیں اس لیے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کو صبر علی العمل کا درجہ حاصل ہے، لیکن اعمال کو بجا لاتے وقت وہ ان کے آداب وحقوق کی رعایت نہیں کرتے، گڑبڑ کر دیتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو صبر فی العمل حاصل نہیں ہوا۔

تیسری قسم ہے صبر عن العمل یعنی نفس کو ما نہی اللہ عنہ سے روکنا شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا ہے ان سے رکنا جن میں سب سے اہم صبر فی الشہوت ہے کہ نفس کے تقاضائے شہوت کو روکا جاوے اور یہ سب سے اہم اس لیے ہے کہ نفس کے دوسرے تقاضے تو ایسے ہیں کہ ان سے نہ روکا جاوے تو بعد میں ان کو خود ہی بہت کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت کا خیال کر کے نفس ان تقاضوں سے خود ہی رک جاتا ہے۔

مثلاً صبر عن الغضب بہت آسان ہے، کیونکہ غصہ کے وقت گو نفس کو لذت آتی ہے مگر بعد میں کوفت ہوتی ہے، مشاہدہ ہے کہ غصہ کر کے بعد میں ایک ندامت سی طاری ہوتی ہے کہ ہم نے خواہ مخواہ غصہ کیا، بات کو ٹال کیوں نہ دیا غصہ کر کے کبھی جی بہلانا نہیں ہوتا، نیز بعض دفعہ کسی پر غصہ کرنے سے اس کو دشمنی ہو جاتی ہے پھر وہ ایذاء رسانی کے در پے ہو جاتا ہے، ان مضرتوں پر نظر کر کے غصہ کو انسان خود ہی دبانے لگتا ہے۔

لیکن صبر عن الشہوت بہت مشکل ہے، کیونکہ شہوت رانی میں وقت قضاء شہوت کے بھی لذت آتی ہے، اور بعد میں بھی اس کی لذت رہتی ہے، قضا شہوت کے بعد کچھ کوفت نہیں ہوتی، اگر کسی کو روحانی کوفت ہوتی ہے تو ممکن ہے لیکن ایسے بہت کم ہے عام حالت یہی ہے کہ شہوت رانی کے بعد اس کا مزہ پڑ جاتا ہے پہلے سے زیادہ آگ بھڑک جاتی ہے گو تھوڑی دیر کے لیے سکون ہو جاتا ہے۔

شہوت بالنساء سے بھی اشد شہوت بالا مارا ہے آج کل مردوں کے ساتھ ابتلا عام ہو رہا ہے جس کے چند وجوہ ہیں۔

اول تو عورتوں میں قدرتی حیا کا مادہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ان سے اظہار شہوت کی جرأت ذرا وقت سے ہوتی ہے اور لڑکوں میں حیا کا مادہ کم ہوتا ہے۔

دوسرے عورتوں کی حفاظت بہت کی جاتی ہے ان کے پاس پہنچنا آسان نہیں، اور جو کوئی پہنچ بھی جاتا ہے اس کی رسوائی جلد ہو جاتی ہے اور بچوں کی کچھ بھی حفاظت نہیں کی جاتی ان کا کسی سے پردہ نہیں ہوتا۔

تیسرے اس میں اتہام کم ہوتا ہے بچوں کے سر پر شفقت سے بھی ہاتھ پھیرا جاتا ہے اور شہوت سے بھی، اب اگر کسی کے بچوں کو پیار کریں تو سب لوگ یہ سمجھیں گے کہ ان کو بچوں پر شفقت زیادہ ہے شہوت کی کسی کو کیا خبر۔

ان وجوہ سے آج کل امارد کے ساتھ ابتلا بہت زیادہ ہے اور شہوت بالنساء سے یہ شہوت بالرجال اشد ہے، کیونکہ عورتوں میں محارم کے ساتھ ابتلا کم ہوتا ہے، اکثر غیر محرم سے ہوتا ہے، بیوہ کسی نہ کسی وقت تمہارے لیے حلال بھی ہو سکتی ہے اگر

وہ کنواری ہے تو اسی وقت نکاح کا پیغام دیا جا سکتا ہے، اور اگر شوہر والی ہے تو ممکن ہے شوہر مر جاوے یا طلاق دے دے تو پھر تم اس سے نکاح کر سکتے ہو بہر حال اس میں حلت کی توقع تو ہے گو کسی وقت ہو، اور اگر گو قع ضعیف ہی ہو مگر مردوں کا حلال ہونا تو کسی وقت بھی متوقع نہیں، بلکہ بعض گناہ تو ایسے ہیں جو جنت میں جا کر گناہ نہ رہیں گے، مثلاً شراب پینا دنیا میں گناہ ہے لیکن جنت میں شراب ملے گی، اور یہ شہوت بالرجال ایسا خبیث فعل ہے کہ جنت میں بھی اس کا وقوع نہ ہوگا پس یہ زنا اور شراب خوری سے بھی بدتر ہے، بلکہ شراب میں تو جو کچھ حرمت ہے سُکر کی وجہ سے ہے اگر کسی تدبیر سے شراب کا سُکر رزائل ہو جائے مثلاً سرکہ بن جائے تو بعینہ اس کا پینا حلال ہو جاتا ہے، لیکن شہوت بالامرد کی خباثت لذاتہ ہے یہ کسی طرح بھی زائل نہیں ہو سکتی، پس یہ فعل حرمت میں سب سے بڑھا ہوا ہے کہ اس میں کسی طرح بھی حلت کی گنجائش نہیں۔

یہ ناپاک فعل سب سے پہلے قوم لوط میں رائج ہوا ان سے پہلے آدمیوں میں اس کا وقوع نہ ہوا تھا، چنانچہ لوط علیہ السلام نے ان سے فرمایا۔ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ۔

گو حیوانات میں بعض کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان میں پہلے سے اس کا وقوع تھا، حق تعالیٰ نے قوم لوط پر جو سنگین عذاب نازل کیا ہے وہ سب کو معلوم ہے کہ اس کی نظیر نہیں ملتی، اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ یہ فعل کیسا سنگین ہے، کیونکہ کفر تو تمام کفار میں مشترک تھا لیکن انواع عذاب کا مختلف ہونا بظاہر خصوصیت افعال ہی کی

وجہ سے ہے، اور سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فعل بد قوم لوط نے بھی خود نہیں ایجاد کیا بلکہ شیطان نے ان کو سکھایا، یہ فعل ایسا خبیث ہے کہ انسان کا نفس باوجود امارۃٌ بالسوء ہونے کے اس کی طرف از خود منتقل نہیں ہوا بلکہ شیطان خبیث نے اس کی طرف قوم لوط کو متوجہ کیا۔

## لواطت کا عمل کس نے اور کب شروع کیا

کتابوں میں لکھا ہے کہ شیطان خوبصورت لڑکے کی صورت میں متشکل ہو کر ایک شخص کے باغ میں سے انگور توڑ توڑ کر کھایا کرتا تھا، باغ والا اس کو دھمکاتا مارتا تھا مگر یہ باز نہ آتا تھا، ایک دن اس نے تنگ آ کر اس سے کہا کہ کمبخت تو نے میرے باغ کا پیچھا کیوں لے لیا ہے، سارے درخت برباد کر دیے، تو مجھ سے کچھ روپے لے لے اور میرے باغ کا پیچھا چھوڑ دے، شیطان بصورت مرد نے کہا کہ میں اس طرح باز نہ آؤں گا، اگر تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہارے درختوں کا ناس نہ کروں تو جو بات میں کہوں اس پر عمل کرو، اس نے کہا وہ کیا بات ہے؟ ابلیس نے اس کو یہ فعل تعلیم کیا کہ میرے ساتھ تو یہ فعل کیا کر پھر میں تیرے باغ کو چھوڑ دوں گا۔

چنانچہ پہلی بار تو اس نے جبراً وقہراً اپنے باغ کے بچاؤ کے لیے یہ فعل کیا، پھر خود اس کو مزہ پڑ گیا وہ اس کو خوشامدیں کرنے لگا کہ تو روز آیا کر اور جتنے انگور چاہے کھا لیا کر، پھر اس نے دوسرے آدمیوں کو اس کی اطلاع دی اور وہ لوگ بھی یہ فعل کرنے لگے، پھر کیا تھا عام رواج ہو گیا اس کے بعد شیطان تو غائب ہو گیا لوگوں

نے لڑکوں کے ساتھ یہ فعل کرنا شروع کر دیا، خدا تعالیٰ کو یہ فعل بہت ہی نا گوار ہے ، چنانچہ لوط علیہ السلام کو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو اس فعل سے روکو ورنہ سخت عذاب آئے گا، انہوں نے بہت سمجھایا مگر وہ باز نہ آئے، آخر عذاب نازل ہوا اور سب کے سب تباہ ہو گئے۔ (خطباتِ حکیم الامتؒ ص ر ۲۵۵ تا ۲۷۰)

پس شہوت سے صبر کرنا صبر عن الغضب سے بھی دشوار ہے یہی وجہ ہے کہ اس مرض میں عام ابتلا ہے لیکن یہ دشواری اس وقت تک ہے جب تک آپ اس سے بچنے کا ارادہ نہ کریں اور جس دن آپ اس سے بچنے کا اہتمام کریں گے اسی دن سے آسانی شروع ہو جائے گی، کیونکہ یہ مشکل آپ کے لحاظ سے ہے خدا تعالیٰ کے لحاظ سے تو مشکل نہیں، آپ ارادہ کر کے دیکھیں وہ اس مشکل کو بہت جلد آسان کر دیں گے۔

خلاصہ یہ کہ تمہاری سعی سے تو پہنچنا مشکل تھا ،مگر سعی کے بعد وہ امداد فرماتے ہیں، تم طلب اور ارادہ کرو وہ خود تم کو پہنچا دیں گے، اور تمام دشواریوں کو آسان کر دیں گے۔

اس پر شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ صاحب ہماری تو طلب اور سعی بھی ناتمام ہے، پس یہ مانا کہ سعی کے بعد حق تعالیٰ خود پہنچا دیتے ہیں مگر پہلے سعی تو ہو، اور یہاں تو سعی بھی ناتمام ہے اس کے جواب میں مولانا فرماتے ہیں ؂

ہم بایں دلہا نماید خویش را
ہم بدوز د خرقۂ درویش را

خرقۂ درویش سے مراد سالک کی ناتمام سعی ہے، یعنی وہ ایسے کریم ہیں کہ

تمہاری ناتمام سعی کوبھی خود ہی کامل کردیتے ہیں، اور تمہارے پھٹے ہوئے خرقہ کوبھی خود ہی سی دیتے ہیں، اور سالکین کے قلوب میں جلوہ گری فرماتے ہیں، ورنہ ہمارے قلوب اس قابل کہاں تھے کہ حضرت حق ان میں تجلی فرمائیں، لیکن تم جس حال میں بھی اپنی طلب اور ارادہ ظاہر کرو وہ ناتمام ہی طلب صحیح پھر وہ اپنی رحمت سے طلب کوبھی کامل کردیتے ہیں اور تمہارے دلوں کوبھی اپنی تجلی کے قابل کردیتے ہیں، پھراس میں تجلی بھی فرماتے ہیں، تم کوآئینہ تلاش کرنے کی بھی ضرورت نہیں، وہ تم کو بلا کرآئینہ بھی خود ہی عطا کردیتے ہیں کہ لواس کے اندر سے ہمارے جمال کا مشاہدہ کرو، سبحان اللہ! کیا رحمت ہے!!

بس اب توکوئی اشکال نہیں رہا، اب آپ کوسعی اور طلب سے کون مانع ہے، آپ اس کا بھی خیال نہ کیجئے کہ آپ کی طلب کامل ہے یا ناقص، تم طلب میں لگو سب کامل ہوجائے گی، حدیث قدسی میں وارد ہے۔

مَنْ تَقَرَّبَ إليَّ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ إليه ذِرَاعًا، وإذا تَقَرَّبَ إليَّ ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا، وإذا أتاني يمشي أَتَيْتُهُ هَرُوْلَةً اَوْ كَمَاقَالَ۔

جوشخص میری طرف ایک بالش چل کرآتا ہے میں اس کی طرف ایک ہاتھ جاتا ہوں، اور جومیری طرف ایک ہاتھ چلتا ہے میں اس کی طرف کھلے ہوئے دو ہاتھ آتا ہوں، اور جومیری طرف آہستہ چل کرآتا ہے میں اس کی طرف دوڑ کر جاتا ہوں، اس حدیث میں بالش اور گز وغیرہ اور دوڑ کرآنا سمجھانے کے لیے ایک مثال ہے، مقصود یہ ہے کہ جومیری طرف ذرا بھی توجہ کرتا ہے میں اس کی طرف دو چندا ورسہ چند توجہ کرتا ہوں۔

واقعی سچ ہے اگر حق تعالیٰ اتنی توجہ اور رحمت نازل نہ فرمائے تو انسان کی کیا مجال تھی کہ جوان تک پہنچ سکے، آخر انسان کو خدا سے نسبت ہی کیا ہے وہ وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں، اس کا وہم وگمان بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتا، جو ذات اس قدر بالا و برتر ہو، اس کی معرفت اور محبت اور مشاہدہ انسان خود کیوں کر سکتا ہے، پس یہ انہی کی عنایت ہے جو کچھ حصہ معرفت وغیرہ کا انسان کو عطا ہو جاتا ہے، ورنہ واقعی وہ مسافت تو ایسی ہے ؎

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

غیر متناہی مسافت ہے جس کا قطع کرنا انسان کی طاقت سے باہر ہے لیکن وہ کیوں کر قطع ہوتی ہے سنئے ؎

خود بخود آن شرابرار ببرمی آید
نہ بزور نہ بزاری نہ بزرمی آید

## اللہ کو پالینے کی صورت یہ ہے

یعنی صورت وصول کی یہ ہوتی ہے کہ ابتداء میں تو سالک میں اور محبوب حقیقی میں غیر متناہی مسافت ہوتی ہے جس کو سالک طے نہیں کر سکتا، مگر جب یہ چلنا شروع کرتا ہے تو حق تعالیٰ اس کے ضعف پر رحم فرماتے ہیں کہ اتنی لمبی مسافت اس سے قطع نہ ہوگی اب وہ خود بھی چلنا شروع کرتے ہیں، اور ان کو اس مسافت کا طے کرنا کچھ بھی

مشکل نہیں تو وہ خود اس کے نزدیک آجاتے ہیں، اس طرح وصول ہو جاتا ہے، پس حقیقت میں بندہ واصل نہیں ہوتا، بلکہ حق تعالیٰ اس کے پاس پہنچ جاتے ہیں، مگر کیا ٹھکانہ ہے رحمت کا کی پھر بھی بندہ کو واصل کا خطاب دے دیا گیا۔

اس کی مثال میں نے ایک تجویز کی ہے جس سے وصول عبد کی حقیقت واضح ہوتی ہے وہ یہ کہ مثلاً آپ کا ایک شیر خوار بچہ ہو جو آپ سے دور کھڑا ہو، آپ اس سے کہتے ہیں کہ دوڑ کر چلے آؤ، حالانکہ آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ اتنی مسافت یہ نہیں طے کر سکتا، لیکن پھر بھی اس کو بلاتے ہیں، اب بچہ ہمت کر کے ایک دو قدم چلتا ہے اور گر پڑتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ اس وقت باپ کو خود جوش آئے گا اور وہ دوڑ کر خود آوے گا اور اس کو گود میں اٹھالے گا، تو دیکھئے یہ مسافت بعید جو لقاء سے معنی تھی کیوں کر طے ہوئی کہ بچہ تو دو قدم چل کر گر پڑا اور رونے لگا پھر باپ خود اس کے پاس آگیا اور اس کو گلے سے لگا لیا۔

یہی صورت سلوک باطل کی ہے کہ اول تم اپنی ناتمام طلب اور سعی ظاہر کرتے ہو تمہاری وہ سعی ہرگز وصول کے لیے کافی نہیں تھی، مگر جب تم دو قدم چل کر گر پڑے ہو اس وقت حق تعالیٰ کی رحمت کو جوش ہوتا ہے وہ خود آکر تم کو گلے سے لگا لیتے ہیں، مگر ہاں اس کی ضرورت بے شک ہے کہ تم بچہ کی طرح ایک دو قدم چل کر رونا تو شروع کرو مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

ہر کجا پستی سست آب انجارود
ہر کجا مشکل جواب آنجارود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود
ہر کجا رنجے شفا آنجا رود
گر نہ گرید طفل کے جوشد لبن
گر نہ گرید ابر کے خندد چمن

اور رونے اور گر پڑنے سے میری مراد یہ نہیں کہ چلانا چیخنا شروع کرو، بلکہ سالک کا رونا اور گرنا یہ ہے کہ اپنی عاجزی اور ناتوانائی کا مشاہدہ کرے، حق تعالیٰ کے سامنے الحاح والتجاء کرے، تواضع اور خاکساری پیدا کرے، تکبر اور فرعونیت کو دماغ سے نکال پھینکے، اس کے بعد وصول میں دیر نہیں لگتی ذرا تم خاکساری اختیار کر کے تو دیکھو، مولانا رومی فرماتے ہیں ؎

سالہا تو سنگ بودی دلخراش
آزموں رایک زمانے خاک باش
در بہاراں کے شود سرسبز سنگ
خاک شو تا گل بروید رنگ رنگ

میں نے وصول الی اللہ کی مثال جو بچہ کی حالت سے بیان کی ہے اس پر ایک بادشاہ کی حکایت یاد آئی، میں نے کسی بزرگ سے یہ حکایت سنی ہے کہ ایک بادشاہ اپنے بالا خانے پر بیٹھا ہوا تھا کہ نیچے سے ایک درویش کا گزر ہوا، بادشاہ نے درویش کو آواز دی کہ ذرا میرے پاس آؤ، مجھے تم سے کچھ پوچھنا ہے، اس نے کہا میں تمہارے پاس کیوں کر آؤں، تم بالا خانے پر، میں زمین پر، اور محل کا دروازہ دور

، کیونکہ شاہی محلات کا بڑا دروازہ وہاں سے دور تھا، اور جس بالا خانے پر بادشاہ تھا وہاں بہت سے دروازے اور درجے طے کر کے پہنچنا ہوتا تھا، بادشاہ نے فوراً ایک کمند لٹکا دی کہ اس کو پکڑ لو، درویش نے اس کو پکڑ لیا، بادشاہ نے کھینچ لیا، دومنٹ میں اوپر آ گیا جب وہ اوپر پہنچ گیا تو بادشاہ نے ان سے سوال کیا کہ تم خدا تک کیوں کر پہنچے، انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ جیسے تم تک پہنچا، خدا تک پہنچنا تو بہت مشکل تھا، مگر میں نے خدائی کمند کو مضبوط پکڑ لیا تھا انہوں نے خود ہی کھینچ لیا، سبحان اللہ خوب ہی جواب دیا۔

الغرض صبر شہوت گو فی نفسہ دشوار ہے مگر جب آدمی اس کا ارادہ کرتا ہے تو آسانی شروع ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ پھر کبھی دشواری نہیں رہتی۔

ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ شہوت عورتوں اور لڑکوں ہی کے تعلق میں منحصر نہیں، بلکہ لذیذ غذاؤں کی فکر میں رہنا بھی شہوت ہے، عمدہ لباس کی دھن میں رہنا بھی شہوت ہے، ہر وقت بات بگھاڑنے کی عادت ہونا بھی شہوت ہے، اور ان سب شہوتوں سے نفس کو روکنا یہ بھی شہوت میں داخل ہے۔

آج کل لوگوں کو باتیں بنانے کا بہت مرض ہے، بس جہاں کام سے فارغ ہوئے مجلس آرائی کر کے فضول باتیں کرنے لگے، میں صرف عوام کی شکایت نہیں کرتا، بلکہ میں علماء و مشائخ کو بھی مجلس آرائی سے منع کرتا ہوں، کیونکہ یہ مرض ان میں بھی بہت ہے، بعض مشائخ کے ہاں عشاء کے بعد بھی مجلس آرائی ہوتی ہے جس سے خواہ مخواہ نیند برباد ہوتی ہے، اگر شیخ کے معمولات میں اس سے فرق بھی نہ آتا

ہوتا ہم سب اہل مجلس یکساں نہیں ہوتے، ان میں سے بعض صبح کی نماز بھی غائب کر دیتے ہیں، پھر یہ بھی نہ ہوتو بلاضرورت باتیں بنانا ظلمت قلب کا سبب ہے، یہی بڑا کافی نقصان ہے گو اور کوئی بھی نقصان نہ ہو۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۲۷۴ تا ۲۸۲)

# ولایت کی دو قسمیں ہیں

## ایک ولایت عامہ، دوسری ولایت خاصہ

**ولایت عامہ:** ہر مسلمان کو حاصل ہے اس لیے عام مومنین کی صحبت میں بھی ضرور اثر ہوتا ہے، بشرطیکہ وہ کیفما اتفق جمع ہو گئے ہوں، چھانٹ چھانٹ کر بدمعاش جمع نہ کیے گئے ہوں، لیکن یہ بات سن کر کوئی صاحب ناز نہ کریں کہ جب عام مسلمان بھی ولی ہیں تو پھر ہم کو کسی اور ولی کی کیا ضرورت ہے، ہم کیوں کسی کے پاس جائیں، کیونکہ ولایت عامہ سے جو مقبولیت حاصل ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے باغیوں اور دشمنوں کے مقابلہ میں عام رعایا کو، بادشاہ کا دوست اور وفادار کہہ دیا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ باغی اور دشمن نہیں، مگر کیا اتنی بات پر کوئی اکتفا کیا کرتا ہے اور کیا اس سے عام رعایا بادشاہ کے مقربین میں داخل ہو گئی ہرگز نہیں، کیونکہ رعایا میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو چوری اور بدمعاشی کرنے کی سزا میں قید خانہ بھیج دیا جاتا ہے جہاں روزانہ سو بیدیں ان کی کمر پر لگائی جاتی ہیں، مگر اس حالت میں بھی یہ شخص بہ نسبت باغی کے بادشاہ کا وفادار اور اس کی رعایا ضرور کہلاتا ہے جس کا اتنا اثر ہوتا ہے کہ کبھی مراحم خسروانہ سے اس کو رہا

بھی کر دیا جاتا ہے، اور باغی مراحم خسروانہ کا اہل نہیں رہتا، تو ولایت عامہ بدون ولایت خاصہ کے ایسی ہے جیسے جیل خانہ کے مجرموں کو باغیوں کے مقابلے میں بادشاہ سے تعلق ہوا کرتا ہے، مگر عاقل محض اتنے تعلق پر کبھی کفایت نہیں کیا کرتا، وہ خاص تعلق کے لیے کوشش کیا کرتا ہے، چنانچہ میں اسی کو پہلے بیان کر چکا ہوں کہ مقاصد میں درجہ کمال ہی مطلوب ہوتا ہے لیکن عام مومنین کی صحبت کا اثر بیان کرنے سے میرا مقصود یہ تھا کہ جب ناقصین کی صحبت میں یہ اثر ہے تو خود سمجھ جاؤ کہ کاملین کی صحبت کا کیا کچھ اثر ہوگا ؎

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند

صاف گر باشد ندانم چوں کند

جب خاک آمیز گھونٹ میں اتنی تاثیر ہے تو صاف اور مقطر میں تو نہ معلوم کیسی مستی ہوگی، تجربہ کر کے دیکھ لیجئے کہ جس شخص کی رات کو آنکھ نہ کھلتی ہو وہ چند دنوں ایسے لوگوں میں جا کر رہے جو رات کو اٹھتے ہیں، ان شاء اللہ اس شخص کو بھی تہجد کی عادت ہو جائے گی، اسی طرح جس شخص کو ذکر اللہ سے مناسبت نہ ہوتی ہو وہ کچھ دنوں ذاکرین کی جماعت میں رہے، بہت جلد ذکر سے مناسبت ہو جائے گی، کیونکہ ذاکرین کے حلقہ میں رہ کر خود بخود اندر سے دل تقاضا کرے گا کہ میں بھی ذکر کروں گویا آج ہی سے اس کا وہ تقاضا جو ذکر کے خلاف تھا وہ مضمحل ہو گیا، پھر جو لوگ کاملین کی صحبت میں تو کیا کچھ نفع ہوگا اس کو خود ہی سمجھ لینا چاہیے، بس ان کی صحبت کا نفع یہ ہے ؎

آہن کہ بپارس آشنا شد

فی الحال بصورت طلا شد

جیسے ایک پتھر مشہور ہے جس کا نام پارس ہے اس کی یہ تاثیر سنی گئی ہے کہ لوہے کو اس سے مس کر دیا جائے تو وہ خالص سونا ہو جاوے، یہ خاصیت قابلین کی صحبت میں ہوتی ہے۔

مگر کاملین کی صحبت کے مؤثر ہونے کی ایک شرط ہے، اور اس کے لیے ایک پرہیز بھی ہے، پرہیز تو یہ ہے کہ اعمال وافعال وغیرہ میں اس کی مخالفت نہ کرو، اور شرط یہ ہے کہ اپنے حالات سے اس کو اطلاع دیتے رہو، تمہارے نفس میں جو مرض ہو اس سے صاف صاف کہہ دو، حیا نہ کرو، کیونکہ طبیب اور ڈاکٹر کے سامنے بضرورت علاج بدن مستور کا کھولنا جائز ہے، اسی طرح طبیب روحانی سے نفس کے امراض بیان کر دینا جائز ہے، تو ایک مرتبہ اپنا سارا کچا چٹھا اس کے سامنے کھول کر رکھ دو اور اس سے مت ڈرو کہ ان کی نظر میں ذلیل ہو جاؤ گے، بخدا اہل اللہ کی نظر میں خود ان سے زیادہ کوئی ذلیل نہیں، وہ اپنے کو اتنا ذلیل سمجھتے ہیں کہ فساق وفجار بھی اپنے کو اتنا ذلیل نہیں سمجھتے، اس سے بالکل مطمئن رہو، پھر جب تم اپنا حال بیان کر چکو تو اس پر وہ جو کچھ بتلا دے اس کا اتباع کرو، یہی طریقہ علاج ظاہری میں بھی آپ کرتے ہیں کہ پہلے اپنا حال طبیب سے ظاہر کرتے ہیں، پھر وہ نسخہ تجویز کرتا ہے، آپ اس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ پرہیز بتلاتا ہے اس سے آپ بچتے ہیں یہی طریقہ حضرات کاملین کی صحبت میں اختیار کرنا چاہیے۔

بھلا اگر کوئی شخص طبیب کے پاس روزانہ محض ملاقات کے طور پر چلا جایا کرے، نہ اُس سے اپنا حال کہے، نہ نسخہ پوچھے، تو کیا اس طرح وہ مرض شفا پا سکتا ہے، ہر گز نہیں، اسی طرح اولیاء کی صحبت میں محض زیارت وملاقات کی نیت سے جانا امراض باطنیہ سے شفا ہونے میں کافی نہیں، گو ان کی زیارت بھی موجب ثواب ہے، یہ الگ بات ہے، مگر اس وقت محض ثواب حاصل کرنے سے گفتگو نہیں، ثواب کے لیے تو اور بھی بہت سے کام ہیں یہاں تو کمال دین حاصل کرنے سے بحث ہو رہی ہے، تو اولیاء کاملین سے کمال دین اسی طرح حاصل ہوگا جیسا کہ میں نے بیان کیا، اس کا ہمیشہ لحاظ رکھو، اور جب ان کے پاس جاؤ، یا خط لکھو تو اس کا قصد کرو کہ ان کے سامنے نفس کے امراض بیان کریں گے، اور جو وہ بتلا دیں گے اس پر عمل کریں گے، پس اولیاء کاملین کے پاس رہنے کی صورت میں بھی عمل کرنا آپ ہی کو پڑے گا، یہ نہیں ہو سکتا کہ تم کچھ نہ کرو اور کامل بن جاؤ۔

مگر اتنا فرق ہوگا کہ پہلے تم عمل کا قصد کرتے تھے اور اس کے خلاف تقاضا پیدا ہوتا تھا اور ان کے پاس رہنے سے اعمال صالحہ کا تقاضا پیدا ہوگا، اور دوسرا تقاضا مضمحل ہو جائے گا، تو یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ جس کا کام کا کرنا پہلے مشکل تھا آج آسان ہو گیا، اور صرف آسان ہی نہیں بلکہ اس کی طرف دل کو از خود تقاضا ہونے لگا کہ اس کے بغیر تم کو چین نہیں ملتا۔

صاحبو! یہ بہت بڑا نفع ہے اس کو کم مت سمجھو، کاملین کی صحبت میں جا کر بس یہ بات پیدا ہوتی ہے، جو ان سے دور رہ کر نہیں پیدا ہوتی جن لوگوں کو کاملین سے

تعلق نہیں وہ متقی ہو سکتے ہیں مگر بڑی مصیبت کے ساتھ ان کو تقویٰ حاصل ہوگا، اور جن کو ان سے تعلق ہے ان کو بہت آسانی اور راحت سے تقوی حاصل ہو جاتا ہے، یہ تو ان کی صحبت کا ادنیٰ اثر ہے کہ اعمال میں سہولت ہو جاتی ہے اس کے بعد نور فہم اور معرفت اور احوال و کیفیات کی سلامتی مقامات باطنیہ کی ترقی حاصل ہوتی ہے اس کی تو کچھ انتہا نہیں۔

## صدق کے معنیٰ اور اس کی قسمیں

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا: اس آیت میں صدق سے مراد محض زبان سے سچ بولنا نہیں ہے، کہیں لوگ یہ نہ سمجھیں کہ جس صدق کو کمال دین بتلایا ہے وہ تو ہم کو حاصل ہے، کیونکہ ہم سچ بولتے ہیں، پس سمجھ لیجئے کہ صدق کے معنیٰ پختگی کے ہیں اور اسی سے ولی کامل کو صدیق کہا جاتا ہے، کیونکہ وہ تمام احوال وافعال واقوال میں مرتبہ رسوخ حاصل کر چکتا ہے، صدق کے معنیٰ جو اصطلاح لغات و بلغاء میں بیان کیے گئے ہیں، مطابقة الخبر للمحكے عنه، یہ معنی اصطلاح شرعی سے خاص ہے، شریعت میں صدق عام ہے ا، فعال کو بھی اقوال کو بھی احوال کو بھی۔

اقوال کا صدق تو یہی ہے کہ بات پکی ہو، یعنی واقع کے مطابق ہو، کچی بات نہ ہو، جو کہ واقع کے خلاف ہو، جو شخص اس صفت سے موصوف ہو اس کو صادق الاقوال کہتے ہیں۔

افعال کا صدق یہ ہے کہ ہر فعل مطابق امر ہو، حکم شرعی کے خلاف نہ ہو، پس جس شخص کے افعال ہمیشہ شریعت کے موافق ہوں اس کو صادق الافعال کہا جاتا ہے۔

احوال کا صدق یہ ہے کہ وہ سنت کے موافق ہوں، پس جو احوال خلاف سنت ہوں وہ احوال کاذبہ ہیں، اور جس شخص کے احوال و کیفیات سنت کے موافق نہ ہوتے ہوں اس کو صادق الاحوال کہتے ہیں۔

صدق احوال کے یہ معنی بھی ہے کہ وہ احوال ایسے ہوں جن کا اثر صاحب حال پر باقی رہے، یہ نہ ہو کہ آج ایک حالت پیدا ہوئی پھر زائل ہوگئی، اور اس کا کچھ بھی اثر باقی نہ رہا، جیسا کہ بعض لوگوں کو کسی وقت خوف کا یا توکل کا غلبہ اپنے اوپر معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا اس کو صادق الاحوال نہ کہیں گے، یہ مطلب نہیں کہ احوال کا غلبہ ہمیشہ رہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس کا اثر ہمیشہ رہنا چاہئے کہ جو حالت طاری ہو وہ بعد میں مقام ہو جائے، اس میں سالکین کو بہت دھوکہ ہوتا ہے، بعض دفعہ وہ محض وہم سے یہ سمجھ لیتے ہیں کہ ہم کو تسلیم و رضا یا توکل و رجا کا حال حاصل ہے، مگر تھوڑے عرصے کے بعد اس کا کچھ بھی اثر نہیں رہتا، جس سے اس حالت کا ان کا وہم ہونا ظاہر ہو جاتا ہے، غرض صدق شریعت میں صرف اقوال کے ساتھ خاص نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے اور اس سمجھنے سے بہت سے اغلاط میں ابتلا ہو جاتا ہے۔

# فقیہ کی صحیح تعریف

اسی کو امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ من جملہ احداثات کے ایک یہ بھی احداث ہے کہ لوگوں نے اصطلاحات شرعیہ کو بدل دیا ہے جیسے فقہ نام رکھا ہے کنز وہدایہ کے پڑھ لینے کا حالانکہ فقہ شریعت میں محض کتاب پڑھ لینے کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک خاص فہم ہے جس سے ملکہ راسخہ پیدا ہوجاتا ہے، احکام کے سمجھنے کا، نیز سلف صالحین فقیہ ایسے کو کہتے ہیں تھے جس کو احکام کی فہم کے ساتھ عمل کامل بھی حاصل ہو، مگر آج کل فقہ کے لیے عمل کو ضروری نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح بہت سے الفاظ شرعیہ کو شرعی اصطلاح سے بدل دیا گیا ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۲۸۸ تا ۲۹۴)

# تقویٰ کے مختلف درجات

اور اسی سے تکرار تقویٰ کا جواب بھی نکل آیا وہ یہ کہ تقویٰ کے بھی مدارج مختلف ہیں، ایک تقویٰ تو یہ ہے کہ کفر وشرک سے بچے، دوسرا درجہ یہ ہے کہ اعمال صالحہ کو ترک نہ کرے، اور محرمات کا ارتکاب نہ کرے، پھر جیسے جیسے اعمال ہوں گے ویسا ہی تقویٰ پیدا ہوتا رہے گا، اور اس تقویٰ کے کمال سے ایمان بھی کامل ہوتا رہے گا، حتیٰ کہ درجہ احسان جو کہ ایمان کا اعلیٰ درجہ ہے وہی تقویٰ کا بھی اعلیٰ درجہ ہے، اور یہی درجہ مطلوب ہے، پس اس آیت سے تقوی کے مراتب کا چند در چند ہونا معلوم ہوگیا۔

درجات تقویٰ کا مختلف ہونا آیت:

فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ، کے شان نزول سے بھی واضح ہو جاتا ہے، حدیث میں آیا ہے کہ اول فَاتَّقُوا اللّٰهَ کا نزول ہوا تھا، صحابہؓ اس سے ڈر گئے، کیونکہ وہ یہ سمجھے کہ آج ہی سے حق تقویٰ لازم ہو گیا، حالانکہ شروع ہی سے حق تقویٰ کا حصول دشوار ہے۔

حق تقویٰ کے ایک معنی تو یہ ہیں کہ جیسا تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے وہ اختیار کرو، اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهِ، میں یہ مراد نہیں کیونکہ یہ تو بشر کی طاقت سے خارج ہے اور اس کی تکلیف تکلیف مالا یطاق ہے۔

دوسرے معنی یہ ہیں کہ انسان کی وسعت کے موافق جو تقویٰ خدا کی شان کے لائق ہے اس کو بجالاؤ، آیت میں یہی معنی مراد ہیں اور گو یہ تقویٰ طاقت سے خارج نہیں، کیونکہ اس کا مکلف کیا جانا دلیل ہے اس کے تحت الاختیار ہونے کی لیکن ابتدا ہی سے انسان کا اس درجہ میں پہنچ جانا دشوار ضرور ہے گو ممتنع نہیں۔

صحابہؓ کے خوف کا یہی سبب تھا پس وہ اس لیے خائف ہوئے کہ یہ درجہ گو اختیار سے باہر نہیں مگر عادۃً پہلے ہی دن اس کا حاصل ہو جانا دشوار ہے، اور وہ صیغہ امر فَاتَّقُوا اللّٰهَ سے یہ سمجھے کہ ہم کو اس وقت اس درجہ کی تحصیل کا امر ہو رہا ہے نہ اس لیے کہ صیغہ امر فور کو مقتضی ہے بلکہ اس لیے کہ محاورات میں بسا اوقات امر فور کے لیے بھی مستعمل ہوتا ہے، اور صحابہؓ کی نظر ہمیشہ اسی جانب جاتی تھی جس میں احتیاط ہو اس لیے انہوں نے امر فور پر محمول کیا۔

اگر یہ خطاب ہم لوگوں کو ہوتا تو ہم کو کچھ بھی اندیشہ نہ ہوتا کیونکہ ہم تاویل کر لیتے ہیں کہ امر فور کو مقتضی تھوڑا ہی ہے پس حق تقویٰ کا عمل اسی وقت دفعتاً نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تدریجاً حاصل کرتے رہنا یہ مطلب، صحابہؓ کے ذہن میں بھی ضرور آیا ہوگا، مگر انہوں نے غایت خشیت واحتیاط کی وجہ سے اس کو فور پر محمول کیا، کیونکہ احتمال تو یہ بھی تھا، چنانچہ محاورات میں کثرت سے امر کا استعمال فور کے لیے ہوتا ہے جس کا پتہ قرینہ مقام سے چل جاتا ہے۔

آپ اگر اپنے نوکر سے پانی مانگیں اور وہ اگلے دن لا کر پلا دے تو کیا آپ خفا نہ ہوں گے، ضرور خفا ہوں گے، اور اس کے جواب میں نوکر یہ نہیں کہہ سکتا کہ حضور نے تو اتنا فرمایا تھا کہ پانی لاؤ، یہ تو نہیں فرمایا تھا کہ ابھی لاؤ، کیونکہ قرینہ مقام سے اس امر کا فور کے لیے ہونا متعین ہو چکا تھا اور اسی طرح اکثر صیغہ امر کا استعمال فور ہی میں ہوتا ہے وہ کبھی عدم فور کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہمارے یہاں ایک حافظ صاحب تھے جن کا لقب حافظ جنازہ تھا وہ ایک گاؤں میں مسجد کے امام تھے وہاں کوئی مر گیا تو لوگ اس کا جنازہ مسجد میں لائے اور حافظ جی سے کہا کہ اس کی نماز پڑھا دو، تو آپ نے یہ عذر کیا کہ مجھے اس وقت ایک دعا میں شبہ ہے اس کو یاد کرلوں پھر پڑھاؤں گا ،لوگ جنازہ لے گئے اور کسی دوسرے سے نماز پڑھوا کر دفن کر دئے، اگلے دن حافظ جنازہ صاحب نے گاؤں والوں سے کہا کہ بھائی مجھے اب دعا یاد ہوگئی ہے، لاؤ اب جنازہ لے آؤ، لوگ ہنسنے لگے کہ سبحان اللہ آپ کی دعا کے بھروسہ اب تک ہم اس کا اچار ڈالے رکھتے، ہم نے اس کو دفن بھی کر دیا۔

تو دیکھئے وہ عدم فور میں فرق نہ کرنے سے لوگوں نے ان کو بیوقوف بنایا ، یہاں تک کہ ان کا لقب ساری عمر کے لیے حافظ جنازہ ہی پڑ گیا تو صحابہ نے اس آیت کو بمعنی فور سمجھا ، اور پھر یہ خوف پیدا ہوا کہ حق تقویٰ کا آج ہی حاصل کرنا تو بڑا دشوار ہے ، پھر اس حکم کی تعمیل کیوں کر ہو اس پر دوسری آیت نازل ہوئی فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ ، یعنی یہ مطلب نہیں کہ تقویٰ آج ہی حاصل کرلو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جتنا تقویٰ تم سے اس وقت ہوسکتا ہے اس وقت تو اس کو اختیار کرلو پھر ترقی کرتے رہو یہاں تک کہ حق تقویٰ حاصل ہوجاوے۔

اور ایک بات طلبہ کو یہ بھی سمجھ لینی چاہیے کہ اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ میں استطاعت با اعتبار کمیت کی مراد نہیں ، یعنی یہ مطلب نہیں کہ جتنے اعمال بجالا سکو اور جتنے محرمات سے بچ سکو ، بس انہی کے تم مکلف ہو یہ معنی بالکل غلط ہے، کیونکہ تمام واجبات وفرائض کا بجالانا اور تمام محرمات سے بچنا ہر شخص پر ہر وقت واجب ہے ، اور سب لوگ اس وقت ان کے مکلف ہیں اور ان میں سے کوئی کام بھی استطاعت سے باہر نہیں ، اس لیے کمیت کے اعتبار سے مااستطعتم کی قید کا لغو ہونا لازم آئے گا بلکہ یہ قید کیفیت کے اعتبار سے ہے یعنی اعمال شریعہ میں جس کیفیت کا تقویٰ تم اس وقت حاصل کرسکو اس کو تو ابھی بجالاؤ ، اور باقی کیفیات کے حصول کی کوشش کرتے رہو ، پس اس سے تقویٰ کے درجات کا کیفیت کے اعتبار سے متفاوت ہونا معلوم ہوتا ہے ، نہ کمیت کے اعتبار سے خوب سمجھ لو۔

خلاصہ یہ ہوا کہ کمال دین حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے جس کا طریقہ

یہ ہے کہ اعمال کو کامل کیا جائے ،فرائض وواجبات کے بجالانے میں کوتاہی نہ ہو، محرمات کا ارتکاب نہ ہو، اوراعمال کے کامل کرنے میں جو نفس کی مزاحمت مانع ہوتی ہے اس کا علاج کاملین کی صحبت اختیار کرنا ہے ان کے پاس جانا چاہیے اور جانہ سکیں تو ان سے خط وکتابت کا تعلق رکھا جائے جس میں فضول قصے نہ لکھیں بلکہ اپنے کو مریض اوران کو طبیب سمجھ کر اپنے حالات سے ان کو اطلاع کرتے رہیں پھراس کے بعد جو کچھ وہ بتلائیں اس پر عمل کریں اوران کے احکام کا اتباع کریں بس یہ راستہ ہے خدا تک پہنچنے کا ،جس سے زیادہ آسان راستہ کوئی نہیں بتلاسکتا حجت ختم ہو چکی ہے۔(خطبات حکیم الامتؒ ص/۳۰۰تا۳۰۵)

# اصلی نفع دین کا ہے

رَبَّنَا وَ ابۡعَثۡ فِیۡہِمۡ رَسُوۡلًا مِّنۡہُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِکَ وَ یُعَلِّمُہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَۃَ۔

حاصل اس دعا کا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہم السلام نے اپنی اولاد کوایک دینی نفع پہنچایا اس دعا کے طرز سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ امر اصلی قابل التفات نفع دینی ہے اور نفع دنیوی اس کے تابع اوراس کے ساتھ ملحق ہم کو حضرت ابراہیم علیہم السلام سے سبق لینا چاہئے کہ انہوں نے جہاں اپنی اولاد کے لیے نفع دنیاوی کی دعا کی کہ۔

وَارۡزُقۡ أَهۡلَهٗ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنۡ آمَنَ مِنۡهُمۡ بِاللّٰهِ وَالۡيَوۡمِ الۡآخِرِ۔

وہاں اس دینی نفع کی بھی دعا کی کہ رَبَّنَا وَابْعَثْ، تو نفع دنیاوی کے لیے دعا کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ضروری ہے اور ظاہر بھی ہے کہ اگر دنیا کا نفع نہ ہوتو دنیا میں بہت کم طبیعتیں ایسی ہیں کہ وہ خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوں پس اپنے رزق کی وسعت کے ساتھ اپنی صحت کے لیے بھی خدا تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔

اور یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب ایک صحابیؓ کو دیکھا کہ بہت لاغر ہورہے ہیں تو حضورؐ نے دریافت فرمایا کہ تم نے کچھ دعا تونہیں کرلی، کہنے لگے ہاں ،دعا تو کی تھی ،آپؐ نے فرمایا: کیا دعا کی تھی ؟ کہنے لگے کہ یہ دعا کی تھی کہ جو کچھ عذاب ہونا ہو دنیا ہی میں ہوجاوے آپؐ نے ان کو متنبہ فرمایا ،تو یہ غلطی کی بات ہے، کیونکہ انسان ضعیف ہے اور احتیاج اس کے خمیر میں ہے۔

ایک شخص میرے پاس آئے اور کہا کہ میرے لیے دس روپے کا انتظام کر دیجئے، کیونکہ مجھے سخت ضرورت ہے، اس کے بعد اِدھر اُدھر کا تذکرہ کر کے لگے فقیری کا دم بھرنے ، کہنے لگے کہ جنت کی کیا پرواہ ہے، اور دوزخ کا کیا ڈر ہے، میں نے کہا میاں بیٹھو! تم سے دس روپے سے تو صبر ہونہیں سکا، جنت سے کیا صبر کر سکو گے، اگر ایسے مستغنی تھے تو دس روپے ہی سے صبر کرلیا ہوتا۔

تو واقعی ایسا انسان محتاج ہے کہ دنیا اور آخرت دونوں کی اس کو ضرورت ہے اور آخرت کا دنیا سے زیادہ محتاج ہے، اسی لیے ابراہیم علیہ السلام نے جیسے دنیا کے لیے دعا کی ایسے ہی آخرت کے لیے بھی دعا کی ،تو گویا ہم کو سبق سکھلاتے ہیں۔

تو ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ذریۃ کے لیے یہ دعا کی، اوراس سے گویا ہم کو یہ سبق سکھلایا کہ اپنی اولاد کے لیے دنیا سے زیادہ اہتمام دین کا کرنا چاہیے۔

# اگر دل میں دین کی عظمت ہو تو اولاد کی

## دینی تربیت کر کے دکھلاؤ

اب ہم کو سبق لینا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ ہم کہاں تک اپنی اولاد کے حق میں ابراہیم علیہ السلام کے طریقے پر چلتے ہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ لوگ اپنی اولاد کے حقوق ادا نہیں کرتے، لیکن یہ ضرور ہے کہ زیادہ توجہ محض دنیا پر ہے، اس کی زیادہ کوشش ہوتی ہے کہ اولاد چار پیسے کمانے کے قابل ہو جاوے، اور جب اس قابل بنا دیتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے حقوق واجبہ ادا کر چکے، آگے اپنی اصلاح خود کر لیں گے، اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہے کہ لوگوں کے دلوں سے دین کی وقعت بالکل نکل گئی ہے، اس لیے ہمہ تن دنیا پر جھک پڑے ہیں۔

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دنیا کی ضرورتوں کی خبر نہ تھی اس لیے ان کو دنیا کی طرف توجہ نہیں ہوئی تو عقل اور نقل دونوں اس شبہ کی تکذیب کر رہے ہیں، نقل تو یہی سابق دعا جو اپنی اولاد کے لیے انہوں نے فرمائی: وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ، اور عقل اس لیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حق سبحانہٗ و تعالیٰ کے نائب ہیں، اور جیسے حق سبحانہٗ و تعالیٰ معاش اور معاد دونوں کی تربیت فرماتے ہیں حق سبحانہٗ تعالیٰ کے نائب بھی دونوں کی تربیت فرماتے ہیں، کیونکہ ان حضرات کو اصلاح کے لیے بھیجا جاتا ہے۔

اصلاح اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کے معاش اور معاد دونوں کی

اصلاح نہ کی جائے، نیز تاریخ اور انبیاء علیہ السلام کی تعلیم میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انبیاء کو عقل معاش بھی کامل ہوتی ہے، مگر لوگ اس میں غلطی کرتے ہیں ، عقل معاش ہونے کی یہ معنی نہیں ہوتے ہیں کہ وہ نوکریوں اور صنعتوں کے طریقے بتلا دیں گے، لوگ یہی سمجھ کر بزرگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ یہ لوگ دنیا سے بے خبر ہیں باوجودیکہ دنیا کی ضرورت یقینی ہے، مگر یہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔

صاحبو! یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کی ضرورت ہے لیکن اول یہ غور کیجئے کہ ضرورت کس کو کہتے ہیں؟ دوسرے معاش کے طریقے بتلانے اور اس پر ترغیب دینا یہ علماء کا کام نہیں ہے۔

دیکھو! حکیم عبدالعزیز اور حکیم عبدالمجید اپنے فن کے ماہر تھے، اور ان کا کام یہ تھا کہ وہ امراض کی تشخیص کریں، اب فرض کرو کہ ایک مریض ان کے پاس آیا، حکیم صاحب نے نبض دیکھ کر تپ دق تجویز کی، اور اس کے لیے نسخہ لکھ دیا، جب وہ نسخہ لے کر چلا تو رستے میں ایک موچی ملا، اور اس مریض کی کیفیت دریافت کی ،اس نے کہا کہ حکیم صاحب نے تپ کہنہ تجویز کیا ہے، کہنے لگا کہ حکیم صاحب نے جوتے کے متعلق کچھ کہا، اس نے کہا کہ جوتے کے متعلق تو کچھ نہیں کہا، کہنے لگا کہ ہمیں لگا کہ وہ حکیم نہیں ہے، ان کو اتنی ضرورت کی تو اطلاع نہیں، یہ نہ دیکھا کہ ایک شخص جوتے لیے بیٹھا ہے اور یہ ننگے پیر ہے، آخر اس کو جوتا پہننا چاہیے یا نہیں۔

اب میں پوچھتا ہوں کہ اس موچی کی نسبت اپ کیا فتویٰ دیں گے؟ کیا اس کو عقلاء میں شمار کیا جاوے گا، ہرگز نہیں، بلکہ پاگل کہا جائے گا، اور کہا جاوے گا کہ

اس نے طبابت کی حقیقت کو نہیں سمجھا، اور اس کے فرائض منصبی پر اس کو اطلاع نہیں، البتہ حکیم پر اس وقت الزام تھا کہ وہ نسخے کے اندر بلا وجہ یہ کہہ دیتے کہ جوتا نہ پہننا، اور جبکہ وہ اس سے سکوت کرتے ہیں تو ان پر کوئی الزام نہیں وہ اپنے فرض منصبی کو ادا کر چکے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۳۱۰ تا ۳۱۵)

ہم لوگ مسلم کہلاتے ہیں مگر غور کرنے کے قابل یہ ہے کہ ہماری حالت اسلام سے کس قدر قریب ہے، اور اس کے کتنے مناسب ہیں، جیسے میں نے مثال دی ہے کہ مالدار اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس ہر قسم کا سامان ضرورت سے زیادہ ہو، یہی حالت اسلام کی ہے تو ہم کو اپنی حالت دیکھنی چاہیے کہ اس قدر بے اعتنائی ہوگئی ہے کہ نہ عقائد کی پرواہ، نہ اعمال کی فکر، نہ حسن معاشرت کا خیال، نہ بداخلاقی پر رنج۔

یہ حالت موجودہ دیکھ کر اس وقت یہ آیت تلاوت کی گئی ہے اور میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اس کی نقل کیا تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ یہ مدت سے تجویز شدہ بھی ہے، اگرچہ اس کی ضرورت نہ تھی، لیکن اس وقت مذاق کچھ ایسا بدل گیا ہے کہ اپنی شریعت میں خواہ کسی امر کی کتنی بھی تحسین کی گئی ہو لیکن اس وقت تک اس کو نہیں مانا جاتا جب تک کہ گزشتہ تاریخ میں بھی اس کی کوئی نظیر نہ ہو، اس لیے میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول نقل کر دیا، سو دیکھ لیجئے کہ دعائے ابراہیمی ؑ میں کن کن اجزائے ایمان کو ضروری کہا گیا ہے۔

# اللہ سے اولاد مانگنے کا قرآن نے

## یہ سب سے اعلیٰ طریقہ سکھایا ہے

فرماتے ہیں کہ اے اللہ ہماری اولاد میں ایک رسولؐ بھیجئے جن کی یہ صفت ہو کے ان لوگوں کو آپ کے احکام سناویں، اور یہ شان ہو کے ان کو کتاب اور حکمت تعلیم کریں، اوران کا تزکیہ کریں، رذائل سے بے شک آپ قادر ہیں، اور حکیم ہیں کہ موافق حکمت کے کرتے ہیں اور ایسا کرنا مصلحت ہے، تو آپ اس کو ضرور قبول فرمائیں گے، اس آیت کے ترجمے سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ رسول کی تین صفتیں اس آیت میں بیان کی گئی ہیں، اوران رسول سے مراد ہمارے حضور انور صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہیں، اس لیے کہ داعی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ ہیں، لہٰذا ضرور ہے کہ یہ رسول ان دونوں حضرات کی اولاد میں ہونا چاہیے، اور ہر چند کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے علاوہ بھی متعدد انبیاء ہوئے، مگر وہ بسلسلہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے ہوئے ہیں، حضرت اسماعیل علیہ السلام کے سلسلے میں صرف ہمارے حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم ہی ہیں، لہٰذا آپؐ ہی مراد ہوئے۔

## سب سے افضل تعلیم

دعا کے درمیان بعثتِ رسول کی دعا کرنا ایک بڑی رحمت کاملہ کا مانگنا ہے، ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ یوں کہتے ان کو پاک کیجئے، اوران کو کتاب دیجئے، اوران کو قبول کیجئے، لیکن تعلیم بواسطۂ وحی اس تعلیم سے افضل ہے جو کہ بلاواسطۂ وحی کے

بذریعہ الہام کے ہو، اگر بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیم بلاواسطہ زیادہ قرب کا ذریعہ ہے اور اسی وجہ سے اکثر عوام اور بعض خواص کی یہی رائے قائم ہوگئی ہے اور یہاں تک اس کا اثر ہوا ہے کہ انبیاء کی تعلیم کی وہ قدر نہیں کی جاتی جس قدر کسی بزرگ کی تعلیم کی قدر ہوتی ہے۔

میرے استاد مولانا فتح محمد صاحبؒ کے پاس ایک شخص آیا اور اپنی عُسرت اور قرض کو بیان کیا، اور کہا کہ کوئی دعا بتلا دیجیے کہ قرض ادا ہو جائے، مولانا نے فرمایا کہ یہ پڑھا کرو: اَللّٰھُمَّ اکْفِنِیْ بِحَلَالِکَ عَنْ حَرَامِکَ وَاَغْنِنِی بِفَضْلِکَ عَمَّنْ سِوَاکْ۔

اور اس کے ساتھ یہ بھی فرما دیا کہ یہ حدیث میں وارد ہوئی ہے، حدیث کا نام سن کر اس شخص کی یہ کیفیت ہوئی کہ جیسے سرد پڑ گیا، اور کہنے لگا حدیث میں تو بہت سی دعائیں ہیں، آپ اپنے پاس سے کوئی چیز بتلایئے جو سینہ بہ سینہ چلی آتی ہو، یہ فاسقانہ کلمہ سن کر مولانا کو بہت غصہ آیا اور آپ نے فرمایا کہ تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم پر دوسروں کی تعلیم کو ترجیح دیتا ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۳۲۱ تا ۳۲۳)

ایک شخص نے خواب میں دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو فرما رہے ہیں کہ شراب پی، اس نے علماء سے کہا کہ انہوں نے کہا کہ شراب حرام ہے، تجھ کو خواب پورا یاد نہیں رہا، میں کہتا ہوں کہ ممکن ہے کہ شراب سے مراد محبت الٰہی ہو، تو دیکھیے! چونکہ بلاواسطہ یہ تعلیم تھی اس میں ابتلا ہوا کہ دیکھیے یہ سمجھتا ہے یا نہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے جو علوم ہوتے ہیں ان میں یہ بات نہیں ہوتی۔

یہی وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کو جو شخص خواب میں دیکھے تو اس میں یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ یہ شیطان ہوگا، کیونکہ آپؐ کی شان محض ہدایت کی ہے، لہٰذا اس میں یہ اختلاط نہیں ہوسکتا، بزرگوں نے لکھا ہے کہ شیطان خواب میں آکر یہ کہہ سکتا ہے کہ میں خدا ہوں، لیکن یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نبیؐ ہوں، وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ حکمت ابتلاء کے لیے صفت مفصل کے ساتھ بھی متصف ہیں، دوسرے اول صورت میں متنبہ ہو جانا ممکن ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ منزّہ ہے، اور جس کو خواب میں دیکھا منزہ نہیں، اور دوسرے میں ممکن نہ تھا اس لیے آپ کے واسطے کو تمام خطرات سے محفوظ رکھا تو معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا واسطہ ایک بڑی نعمت ہے۔

## تعلیم کتب سے بھی اس قدر نفع نہیں ہوتا

### جو کاملین کی صحبت سے ہوتا ہے

لہذا، ابراہیم علیہ السلام نے بجائے کتاب وغیرہ براہ راست مانگنے کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو واسطہ قرار دیا، نیز اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کی طبیعت اس پر مجبور ہے کہ اپنے بنی نوع کو دیکھ کر اقتدا کرتے ہیں، یعنی ان کو ایک نمونے کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہی فرق ہے اس میں اور جانور میں کہ جانوروں کی کو ضروریات کی تعلیم کی حاجت نہیں، کیونکہ جانوروں میں جو کچھ کمالات ہیں وہ سب طبی ہیں اکتسابی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بطخ کا بچہ پیدا ہوتے ہی تیرنے لگتا ہے، اور ایک بڑے سے بڑا تیراک شخص کا بچہ تیراک نہ ہوگا، کیونکہ کمالات انسان

کے طبعی نہیں، بلکہ ان کو ایک نمونہ دیکھنے کی ضرورت ہے، اور ضرورت نمونہ ہی باعث ہے کہ انسان کو تعلیم کتب سے بھی اس قدر نفع نہیں ہوتا جس قدر کاملین کی صحبت سے ہوتا ہے، یہ ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو اس کی ضرورت ہے۔

اکثر لوگ اپنی اولاد کے لیے تمام اسائشوں کی فکر کرتے ہیں مگر اس کی ذرا پرواہ نہیں کرتے کہ صحبت بھی نیک ہو، بلکہ اکثر بداخلاق معلموں کے سپرد کر دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اگرچہ ناقص ہے لیکن ابھی بچپن ہے کیا حرج ہے، حالانکہ یہ تجربہ ہے کہ اگر مبادی خراب ہوں تو مقاصد بھی خراب ہوتے ہیں، یاد رکھو کہ خاک از تودۂ کلاں بردار، یہ ضرور ہے کہ اگر کامل سے سیکھے گا تو کامل نہ ہوگا، لیکن یہ ذی استعداد تو ہو جائے گا، کیونکہ کامل آدمی فن کی حقیقت کو ظاہر کر دیتا ہے، بخلاف ناقص کے، اور یہ تو عامی ضرورت ہے جس پر کم وبیش توجہ بھی ہے، مگر بڑا ضرر یہ ہے کہ ناقص کی صحبت میں اخلاق بالکل برباد ہوتے ہیں، اس پر لوگوں کو ذرا توجہ نہیں۔

ہمارے یہاں ایک معلم ہے ان کی نسبت سنا گیا ہے کہ وہ اپنے لڑکوں کو دوسرے معلم کے ہاں بھیجتے ہیں کہ جا کر اس کے مکتب کی چٹائیاں توڑ ڈالیں، بتلایئے جب بچپن ہی سے یہ حالت ہوگی تو بڑے ہو کر ان کی کیا اصلاح ہوگی، مگر اس پر بالکل خیال نہیں، بلکہ اکثر کہتے ہیں کہ بچہ وہی ہے جو کہ شوخ ہو حالانکہ شوخی دوسری چیز ہے اور شرارت دوسری چیز ہے۔

غرض انسان اپنے ابنائے نوع سے سبق لیتا ہے جو حالت دوسرے کی دیکھتا ہے وہی خود اختیار کرتا ہے، مجھے خوب یاد ہے کہ میں اپنے گھر کے لوگوں کو علاج

کرانے کے لیے ایک طبیب کے پاس لے گیا، ان کو میں نے دیکھا کہ بے حد متحمل تھے، باوجودیکہ بے حد نازک مزاج تھے، تو میں چونکہ ان کے پاس جاتا تھا اس لیے میرا غصہ کم ہوگیا تھا میں نے غور کرکے دیکھا تو معلوم ہوا کہ محض پاس بیٹھنے کا اثر ہے، تو بہت اچھا طریقہ تربیت کا صحبت ہے۔

اب لوگ سمجھتے ہیں کہ اپنی عمر کو پہنچ کر خود ہی سمجھ جائیں گے، یہ غلط ہے بلکہ جب بچہ بولنے پر بھی قادر نہیں ہوتا اسی وقت سے اس کے دماغ میں دوسروں کی تمام حرکات منقش ہوتی ہیں، اور وہ ان سے متاثر ہوتا ہے، اسی واسطے حکماء نے لکھا ہے کہ بچہ کے سامنے کوئی حرکت خلاف تہذیب نہ کرنی چاہیے، راز اس میں یہی ہے کہ انسان کے دماغ کی مثال پریس کی سی ہے، یہ کاپی لکھ کر جب لگاؤ تو چھپ جائے گا، اسی طرح جو چیز دماغ انسان کے روبرو ہوتی ہے اس میں منقش ہوجاتی ہے، اگرچہ اس وقت شعور نہیں ہوتا لیکن اس انتقاش کے لیے شعور کی ضرورت نہیں ہے، اگر ہم پریس میں انگریزی چھاپ لیں اور پھر انگریزی سیکھ لیں تو چند روز کے بعد ضرور پڑھ لیں گے، بچہ اگرچہ اس وقت نہیں سمجھ سکتا لیکن بڑا ہوکر سمجھے گا۔

## پانچ چھ برس کے بعد بچہ تربیت کے قابل نہیں رہتا

چنانچہ ایک عاقل عورت نے یہ کہا کہ پانچ چھ برس کے بعد بچہ قابل تربیت نہیں رہتا، بلکہ ہر حالت پختہ ہوجاتی ہے، وہ کہتی تھی اگر پہلے بچے کو درست کردے تو اس کے بعد کے سب بچے اسی سانچے میں ڈھل جائیں گے، غرض معلوم ہوا ہوگا کہ صحبت کا کیا اثر ہے۔

تو جناب باری تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ابراہیم علیہ السلام سے یوں دعا کرائی کہ ان میں ایک پیغمبر بھیجیے اور پھر آپ کو مبعوث فرمایا کہ آپ نمونہ ہوں ،سو بعض نے آپ کو دیکھا اور بعض نے آپ کی سیرت دیکھ کر آپ کی حالت معلوم کی ،اور اسی طرح آپ ہمارے بھی پیش نظر ہیں ،اور اس اعتبار سے اگر ،فِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ۔لیا جائے تو درست ہوگا۔

واقعی آپ کی سیر کو دیکھ کر جس قدر آسانی سے ہم اتباع کر سکتے ہیں قوانین کلیہ کو دیکھ کر نہیں کر سکتے تھے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جب آپ ہمارے لیے نمونہ ہیں تو ہم سے یہی باز پرس ہوگی کہ تم اس نمونے کی موافق بن کر کیوں نہیں آئے۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ جیسے ہم کسی درزی سے اچکن سلائیں اور نمونے کے لیے اپنی اچکن اس کو دے دیں تو اس اچکن دینے کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ جدید اچکن کی کاٹ تراش سلائی وغیرہ سب اس پہلے کے مطابق ہو، اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ تراش وغیرہ میں فرق ہو جائے تو درزی کو مستحق عتاب سمجھا جاتا ہے، اس عتاب کے جواب میں اگر وہ یہ کہنے لگے کہ زیادہ تر تو موافق نمونے کے ہے اور للاکثر حکم الکل، تو ہرگز یہ جواب مسموع نہیں ہوتا۔

تو جو برتاؤ آپ نے اس درزی سے کیا اسی کے لیے آپ خدا تعالیٰ کے سامنے تیار ہو جایئے اور سوچ لیجئے کہ جب آپ خدا تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہوں گے اور نمونہ نبویؐ پر پورے نہ اتریں گے تو کسی سخت عتاب کے سزاوار ہوں گے، اسی کو خدا تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ۔

کہ بالکل اس نمونے جیسے بن جاؤ، نماز ایسی ہو جیسے حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی تھی روزہ وہی ہو، نکاح شادی کا طرز وہی ہو، وضع وہی ہو، ہر چیز میں وہی طرز ہو، جو کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا طرز تھا، یہ تو نمونہ ہے لیکن یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے اس نمونے میں وسعت کردی۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ۳۲۵ تا ۳۲۹)

# فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کی شادی

## شادی کا سب سے بہترین نمونہ ہے

اسی طرح خدا تعالیٰ نے شادی کا ایک نمونہ یعنی حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی ہم کو دکھلا دیا ہے کہ اس میں نہ مہمان آئے تھے نہ لال خط گیا تھا، نہ ڈوم گیا تھا، نہ نائی، نہ واسطہ سے پیغام پہنچا، بلکہ پیغام خود دولہا صاحب سے لے کر گئے تھے اور حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے بھیجے ہوئے تھے، اول حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا سے حضرات شیخین نے پیغام دیا تھا لیکن ان کی عمر زیادہ ہونے کی وجہ سے حضور نے عذر فرما دیا، اللہ اکبر صاحبو! غور کرنے کی بات ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ہم کو کیسے کیسے گہرے امور پر مطلع فرما دیا ہے، یعنی حضرات شیخین سے انکار فرما کر آپ نے یہ بتلا دیا کہ اپنی اولاد کے لیے شوہر کی ہم عمری کا لحاظ بھی ضرور کرو۔

ایک نوجوان عورت کی شادی ایک بوڑھے مرد سے ہوگئی تھی وہ کہتی تھی کہ جب میرے سامنے آتے ہیں تو مجھ کو بہت شرم آتی ہے، اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ

جیسے دادا آ گیا، اور اکثر عورتیں عمروں میں تفاوت ہونے کی وجہ سے آوارہ ہو جاتی ہیں، کیونکہ ان کا دل نہیں ملتا، بتلایئے حضرات شیخین سے زیادہ کون ہوگا لیکن حضورؐ نے عمر کے تفاوت کی وجہ سے انکار فرما دیا۔

جب دونوں صاحبوں کو اس شرف سے مایوسی ہوئی تو ان دونوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ حضورؐ نے ہم دونوں سے تو اس خاص وجہ سے انکار فرما دیا ہے، تم کم عمر ہو بہتر ہے کہ تم پیغام دو، جو لوگ شیخین پر حضرت علیؓ کے ساتھ عداوت رکھنے کا الزام رکھتے ہیں ان کو اس واقعہ میں غور کرنا چاہیے، غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ تشریف لے گئے اور جا کر خاموش بیٹھ گئے، آپؐ نے فرمایا کہ مجھے معلوم ہے کہ جس غرض سے تم آئے ہو، اور مجھے خدا تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوا ہے کہ میں فاطمہؓ کا نکاح تم سے کر دوں، منظوری کے بعد حضرت علیؓ چلے آئے، ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو چار اصحابؓ کو جمع کر کے خطبہ پڑھا اور نکاح پڑھا دیا، چونکہ حضرت علیؓ مجلس نکاح میں موجود نہ تھے اس لیے یہ فرما دیا کہ اگر علیؓ منظور کریں، حضرت علیؓ کو جب خبر ہوئی تو آپؓ نے منظور کیا، اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ایمن کے ساتھ حضرت فاطمہؓ کو حضرت علی کے گھر روانہ کر دیا، نہ ڈولہ تھا نہ بارات تھی۔

اگلے دن حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم خود تشریف لائے، اور حضرت فاطمہ زہرا سے پانی مانگا، انہوں نے اٹھ کر پانی دیا، آج ہم نے اس سادگی کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، نکاح کے بعد ایک مدت تک دلہن منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے، میں کہا کرتا ہوں کہ بجائے منہ پر ہاتھ کے ہاتھ پر منہ رکھنا چاہیے، بہر حال جو کچھ بھی کہا جائے

منہ ڈھکا جاتا ہے اور وہ اس قدر پابند بنائی جاتی ہے کہ نماز وغیرہ کچھ بھی نہیں پڑھ سکتی جس طرح بندے کو خدا کے ہاتھ میں ہونا چاہئے تھا، اسی طرح وہ نائن کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور کس قدر بے حیائی ہے کہ عورتیں منہ دیکھ کر فیس دیتی ہیں، تو آج کل پابندی کی یہ حالت ہے اور حضرت فاطمہؓ نے اگلے ہی دن کام کیا اور پھر حضرت علیؓ سے فرمایا کہ پانی لاؤ، وہ بھی لائے، اس سے **معلوم** ہوتا ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ پانی لائی تھیں حضرت علیؓ بھی موجود تھے، اب عورتیں اس فعل کو بالکل ناجائز سمجھتی ہیں اسی طرح کی اور بھی جہالتیں ہیں۔

## کیا شوہر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جائے گا؟

عورتوں کا یہ بھی خیال ہے کہ شوہر کا نام لینے سے نکاح ٹوٹ جاتا ہے، اور شوہر کا نام لینا گویا بالکل ناجائز ہے۔ مگر عورتوں کو نام لینا تو بے ادبی ہے، زبان چلانا اور گستاخی کرنا بے ادبی نہیں ہے، شوہر سے لڑنا یا عورتوں کو گالیاں دینا گویا ناجائز نہیں ہے، بعض عورتیں تو اس کی یہاں تک پابندی ہے کہ اگر قرآن میں وہ لفظ آجائے تب بھی اس کو نہیں پڑھتیں، گویا قرآن میں ان کے شوہر ہی کا نام لکھا ہے، اور اس سے بڑھ کر یہ کہ بعض عورتیں اس کے شہر کا نام بھی نہیں لیتی اور شوہر کے نام کے ہم وزن الفاظ بھی نہیں کہتیں، لیکن معلوم نہیں کہ یہ ساری باتیں ناجائز ہو کر گستاخی کرنا کیسے جائز ہو گیا، بس حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے شادی کر کے بھی دکھلادی۔

حضور نے غمی کر کے بھی دکھلا دی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صاحبزادہ ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا آپؐ نے نہ جزع فزع کیا نہ کسی کو اجازت دی، صرف آنسو نکلے اور یہ فرمایا کہ۔

انابفراقک یا ابراھیم لمحزونون

اور ایک جگہ تشریف فرما رہے لوگ آ کر تعزیت کرتے رہے، پس ہم کو بھی چاہیے کہ تسلی دیں اور ثواب بخشیں، یہ دونوں امر مسنون ہیں، اور باقی سب لغو ہے، مثلاً دو دروازے کے مہمانوں کا آنا اور دسویں، چالیسویں میں شریک ہونا، پھر عدّت کے ختم ہو کے بعد اس عورت کو عدّت سے نکالنے کے لیے جمع ہونا، گویا وہ کسی کوٹھڑی میں بند تھی کہ یہ سب مل کر اس کا قفل توڑیں گے۔

## میت کے کھانے کا رواج اس طرح ختم کیجئے

ضلع بلند شہر کے ایک رئیس کا انتقال ہوا ان کے صاحبزادے نے اس رسم کو توڑنا چاہا لیکن اس کی یہ صورت اختیار نہیں کی کہ کچھ نہ کریں بلکہ یہ کیا کہ حسب رسم تمام برادری کی دعوت کی اور بہت سے عمدہ عمدہ مرغن کھانے پکوائے، بڑے لوگوں پر ایک یہ بھی آفت ہے کہ جب تک وہ گھی کی نہر نہ بہاویں اس وقت تک ان کا کرنا کچھ سمجھا ہی نہیں جاتا، غرباء بحمد اللہ اس سے بَری ہیں، میں جب ڈھاکہ گیا تو وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں سیر بھر گوشت میں سیر بھر گھی کھاتے ہیں، میں نے کہا کہ صاحب گھی کچھ زیادہ کھانے کی چیز نہیں ہے۔ ورنہ جنت میں گھی کی بھی ایک نہر ہوتی جیسے دودھ وشہد کی نہریں جنت میں ہیں۔

غرض جب سب لوگ جمع ہو گئے تو ہاتھ دھلوا کر کھانا چنوا دیا، اور سب کو بٹھلا دیا، اجازت شروع سے پہلے کہنے لگا کہ صاحبو! آپ کو معلوم ہے کہ میرے والد ماجد کا انتقال ہو گیا ہے، اور والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ جانا جیسے عظیم الشان صدمہ کا باعث ہوتا ہے، ظاہر ہے تو صاحبو کیا یہی انصاف ہے کہ ایک تو میرا باپ مرے اور اوپر سے تم لوگ مجھ کو لوٹنے کے لیے جمع ہو، تمہیں کچھ شرم بھی آتی ہے، اس کے بعد کہا کہ کھایئے لیکن سب لوگ اسی وقت اٹھ گئے، اور یہ رائے ہوئی کہ رسوم کے متعلق علحٰیدہ بیٹھ کے غور کرنا چاہیے، چنانچہ بہت سے آدمی جمع ہوئے اور باتفاق رائے ان کو موقوف کر دیا اور وہ سب کھانا فقراء کو تقسیم کر دیا۔

ہمارے جوار میں ایک قصبہ کیرانہ ہے وہاں کے ایک حکیم صاحب فرماتے تھے کہ میرے پاس ایک گوجر آیا اس کا باپ بیمار ہو رہا تھا، کہنے لگا کہ حکیم صاحب جس طرح ہو سکے اب کی مرتبہ تو اس کو اچھا ہی کر دیجئے، کیونکہ قحط بہت ہو رہا ہے، اگر بڈھا مر گیا تو مرنے کا تو چنداں غم نہیں، مگر چاول بہت گراں ہیں، برادری کو کس طرح کھلاؤں گا۔

خلاصہ یہ ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لیے نمونہ ہیں، لہٰذا ہر حالت میں ہم کو غور کرنا چاہیے کہ ہم اس نمونے کے موافق ہیں یا نہیں۔

سلف صالحین نے یہاں تک کیا ہے کہ ایک درزی کے یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت تھی درمیان میں ایک جملہ معترضہ یاد آیا کہ ہماری شان خدا جانے کیا بڑھ گئی ہے کہ ہم غریبوں کے ہاں جاتے ہوئے عار کرتے ہیں، بلکہ ان کو

بلاتے ہوئے بھی عار آتی ہے، اکثر دیکھا گیا کہ جو لوگ ذرا معزز عہدوں پر ہیں وہ اپنی برادری کے غریب لوگوں کو اپنے پاس بلاتے ہوئے اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے عار کرتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک غریب آدمی کے یہاں تشریف لے گئے، اور اگر کوئی کہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غریب تھے نعوذ باللہ، تو سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فقر اختیاری تھا، اضطراری نہ تھا فقر وہ ہے کہ جس کا فقر اضطراری ہو ؎

شریف گر متواضع شود خیال بند
کہ پایئگاہ فیعش ضعیف خواہد شد

حضرت ابراہیم بن ادہم نے سلطنت چھوڑ دی تھی تو کیا ان کو فقیر کہا جائے گا، اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے بھی اپنے اختیار سے فقر اختیار کیا تھا اور اختیاری بھی کیسا کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر آپؐ پسند فرمائیں تو خدا تعالیٰ آپؐ کے لیے جبل اُحد کو سونا کردیں کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ساتھ چلا کرے۔

شاید کوئی کہے کہ جبل اُحد کیوں کر چلتا۔ تو صاحبو! آپ کے نزدیک زمین متحرک ہے یا نہیں، تو جب زمین حرکت کرسکتی ہے تو جبل اُحد کہ حرکت کرنے میں کیا محال لازم آتا ہے، اگر کہیے کہ زمین کشش آفتاب کی وجہ سے چلتی ہے تو میں کہوں گا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم مبارک میں بھی اگر کشش ہو تو کیا قباحت ہے، سائنس کے مسئلے ابھی ختم نہیں ہیں کشش کے لیے جسم کا بڑا ہونا کچھ ضروری نہیں، اور کشش تو محض آپ کی خاطر سے تنزل کرکے مان لی ہے، ورنہ کشش کیا چیز ہے، جو شخص خدا کو مانتا ہے اس کو کشش وغیرہ کے ماننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

تو آپ نے فرمایا کہ اے جبرئیلؑ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں، اور اگر غور کیجئے گا تو معلوم ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تجویز میں کتنی عظیم الشان حکمت، پنہاں ہے بات یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم جانتے تھے کہ میری امت مجھ سے محبت کرے گی، اگر میں دنیا لوں گا تو تمام امت تحصیل دنیا کو سنت قرار دے گی، اور دنیا کے مفاسد سے بچنے کی قوت ہوگی نہیں نتیجہ یہ ہوگا کہ امت ہلاک ہوجائے گی۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے ایک کامل آدمی جو کہ سانپ پکڑنے کا منتر جانتا ہو وہ باوجودیکہ اپنے ضرر سے بالکل مطمئن ہے، لیکن اس خیال سے کہ مجھے پکڑتے دیکھ کر بچہ بھی سانپ کے منہ میں انگلی نہ دے دے، خود بھی سانپ کو نہیں پکڑتا، بس حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے تکلیف برداشت کی تو کیا آپ کا فقر اضطراری فقر ہوگا، ہرگز نہیں، بلکہ فقر اختیاری تھا۔

مجھے حضرت شاہ ابوالمعالی کی حکایت یاد آئی آپؒ کے ہاں اکثر فقر وفاقہ ہوا کرتا تھا ایک مرتبہ ان کے پیران کے ہاں مہمان ہوئے اس روز بھی اتفاق سے فاقہ تھا اور حضرت شہاہ ابوالمعالی مکان پر نہ تھے، گھر کے لوگوں نے پڑوس سے قرض مانگنا چاہا لیکن وہاں سے قرض نہ ملا، کئی جگہ آدمی کو بھیجا لیکن سب جگہ سے جواب نہ میں ملا، جب ان کے پیر نے کئی بار آدمی کو آتے جاتے دیکھا تو دریافت فرمایا معلوم ہوا کہ آج فاقہ ہے، آپ نے کچھ نقدا اپنے پاس سے دیا اور فرمایا کہ جا کر بازار سے اناج لے آؤ، اور جب لاؤ تو مجھے دکھانا، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا، آپ

نے ایک نقش لکھ کر اس اناج میں رکھ دیا، اور نقش کا رکھنا ایک پردہ تھا ورنہ یہ آپ کا تصرف تھا اور یہ اوپر سے ہوتی چلی آئی ہے، خدا تعالیٰ جب کوئی خارق پیدا کرتے ہیں تو اس کو ناسوت کے پردے میں پیدا کرتے ہیں، جیسے بارش وغیرہ کا ہونا اسی کے موافق انہوں نے بھی وہ تعویذ لکھ کر اناج میں رکھ دیا، اور فرمایا کہ اس میں سے لے کر پکایا کرو چنانچہ مدت تک پکتا رہا اور ختم نہ ہوا۔

حضرت شاہ ابوالمعالی صاحبؒ سفر سے واپس تشریف لائے اور یہ حالت دیکھی تو ایک روز فرمایا کہ مدت سے فاقہ نہیں ہوا، اس کی کیا وجہ ہے؟ صاحبزادی نے یہ سارا واقعہ عرض کیا، اب اس وقت حضرت پر سخت تنگی کا وقت ہے کہ اگر تعویز سے کام لیں تو مذاق کے خلاف اور نہ کام لیں تو پیر کی تعویذ کی بے ادبی ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت شیخ ابوالمعالیؒ نے فرمایا کہ نقش حضرت کا تبرک ہے، میرا سر اس کا زیادہ مستحق ہے یہ کہہ کر اس کو تو اپنے سر میں باندھ لیا اور اناج کے لیے حکم دیا کہ اس کو صدقہ کر دیا جائے، تو جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ادنیٰ خادم کی یہ حالت تھی تو حضور کو کون فقیر کہہ سکتا ہے۔

# عزت رئیسوں میں جانے سے نہیں

## بلکہ غریبوں کے گھر جانے میں ہے

لکھنو کا واقعہ ہے کہ وہاں ایک عالم ایک سقہ کے گھر تشریف لے جاتے تھے کہ ایک رئیس ملے پوچھا کہ مولانا کہاں جا رہے ہیں؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ

اس سقے نے دعوت کی ہے، رئیس نے کہا لاحول ولاقوۃ آپ نے تو لوٹیا ہی ڈبودی، سقے کے گھر دعوت کھانے جاتے ہیں، مولوی صاحب نے کہا ہاں صاحب ٹھیک ہے اور سقے سے کہا کہ اگر تو ان کو لے چلے تو میں بھی چلتا ہوں ورنہ میں بھی نہیں جاتا، وہ ان رئیس کے سر ہوا اور ہاتھ پاؤں جوڑ کر لے چلے۔

مولوی صاحب نے اس تدبیر سے یہ بات دکھلا دی کہ ان غرباء کا اصرار کس طرح کا ہوتا ہے اور ان کو کس درجہ خلوص ہوتا ہے، حقیقت میں امراء کو خبر نہیں ورنہ اگر ان کو بھی معلوم ہو جائے کہ غرباء کو اہل اللہ وعلماء سے اتنی محبت ہے تو ان کو مجبور و معذور سمجھیں جیسے خود تھوڑے سے اصرار سے یہ رئیس مجبور ہو گئے۔

غرض وہاں جو پہنچے تو دیکھا کہ دو سو تین سو سقے کھڑے ہیں اور ان کو دیکھتے ہی سب کے سب تعظیم کے لیے بڑھے، رئیس صاحب نے یہ عظمت و محبت کبھی عمر بھر میں بھی نہ دیکھی تھی، آخر کھانا آیا تو مولوی صاحب نے سقوں کو اشارہ کیا انہوں نے نہایت اصرار وخوشامد سے کھلانا شروع کیا، آخر اس رئیس نے یہ منظر دیکھ کر کہا کہ مولانا میں نے آج دیکھا اور آج مجھ کو معلوم ہوا کہ عزت رئیسوں میں جانے سے نہیں بلکہ غریبوں کے گھر جانے میں ہے۔

تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم بھی غرباء کی دعوت منظور فرما لیتے تھے، چنانچہ ایک درزی کے ہاں چلے گئے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ ساتھ تھے آخر وہ درزی کپڑا سینے بیٹھ گئے آج کل اس کو بے تہذیبی سمجھتے ہیں کہ مہمان کے سر پر مسلط کیوں نہ ہوا۔

## کدّو کھانا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سنت ہے

حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کدو کے ٹکڑے تلاش کر کے کھا رہے تھے حضور کو تلاش کرتے دیکھ کر اس روز سے مجھے کدو سے محبت ہو گئی ہے، آپ نے دیکھا محبت ایسی چیز ہے ہم کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ ہم کو محبت نہیں ہے ورنہ محبت وہ چیز ہے کہ محبوب کی ہر ہر ادا محبوب ہو جاتی ہے۔

## جب کسی چیز کی عظمت ہوتی ہے تو اثر بھی ہوتا ہے

اس زمانہ میں عظمت سے اس کی مثال سمجھو معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ ہندوستان میں ایک حاکم اعلیٰ لنگڑا کر چلتا تھا تو دلداوگان فیشن نے اس کی تقلید میں لنگڑا کر چلنا شروع کر دیا تھا، اسی طرح ایک بادشاہ کی داڑھی گاؤ دم تھی تو لوگ مدت تک اسی قسم کی داڑھی رکھتے تھے، بلکہ شاید دعا کرتے ہوں کہ ہماری داڑھی بھی اسی قسم کی ہو جاوے اور ہم لنگڑے ہو جائیں۔

تو دیکھیے! عظمت سے اس زمانے میں تشبہ کا مسئلہ ایسا چلا کے علماء منع کرتے کرتے عاجز آ گئے، لیکن لوگوں پر کچھ اثر نہ ہوا، وجہ اس کی یہی ہے کہ عظمت نے اس کو محبوب بنا دیا ہے، تو اہل دنیا کی عظمت نے جب یہ رنگ دکھلایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کیوں یہ رنگ نہ دکھلاتی۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۲ ۳۳ تا ۳۴۶)

# قرآن شریف کوئی تاریخ کی کتاب نہیں ہے

## بلکہ وہ ایک روحانی مطب ہے

جس میں امراض باطنی کا علاج بتایا گیا ہے، اور یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے، کیونکہ آج کل لوگوں نے قرآن کو بالکل نہیں سمجھا، قرآن میں وہ چیزیں تلاش کی جاتی ہیں جو کہ قرآن میں نہیں ہے کوئی اس میں سائنس ڈھونڈتا ہے، کوئی جغرافیہ تلاش کرتا ہے، اور بہت زیادہ تعجب ان لوگوں پر ہے جو اس کو قرائن سے ثابت کرتے ہیں کیونکہ ڈھونڈتا وہ شخص ہے جو کہ جانتا نہیں، تو اس پر تو یہی تعجب ہے کہ اس نے ناواقفی سے غلطی کی، مگر جو لوگ ثابت کررہے ہیں ان پر زیادہ تعجب ہے کہ جان بوجھ کر غلطی کرتے ہیں، میں دیکھتا ہوں کہ جب کوئی فلسفے کی نئی تحقیق ظاہر ہوتی ہے تو اس کو زبردستی قرآن مجید میں ٹھوس کر بڑے فخر سے بیان کیا جاتا ہے کہ قرآن نے تیرہ سو برس پہلے اس کی خبر دی ہے اور اس سے قرآن کی بلاغت ثابت کی جاتی ہے، اور ان علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے، افسوس ان علوم کو اسلامی علوم کہا جاتا ہے، میں بقسم کہتا ہوں کہ ان صاحبوں کو اسلامی علوم کی ہوا بھی نہیں لگی، صاحبو! صنعت اور سائنس سے انکار نہیں کیا جاتا، مگر گفتگو یہ ہے کہ قرآن کو اس سے کیا تعلق، قرآن میں اگر اس کا ذکر مقصوداً یا تبعاً کیا گیا ہے، مثلاً اعتقادات اور اعمال مقصود بالذات ہیں ۔قرآن میں صرف ایک مضمون ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں خدا تعالیٰ کے ساتھ قرب کے طریقے بتلائے گئے ہیں، ان طریقوں سے جس چیز کو تعلق ہے اس کا ذکر مقصود بالذات ہیں، کیونکہ قرب کا طریقہ یہی ہے اور بعض چیزیں جن کو من وجہ دخل ہے وہ تبعاً آ گئی ہیں۔

مثلاً قرآن نے توحید کا دعویٰ کیا ہے، اس کی دلیل میں ، إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ، فرمایا جس سے مطلب یہ ہے کہ ان کائنات میں بھی توحید کے دلائل ہیں تو ان کائنات میں چند حیثیتیں ہیں۔

اول ان کا دلیل توحید ہونا ،دوسرا ان کے پیدا ہونے کے طریقے، اور تیسرے ان کے تغیرات کے ڈھنگ۔

قرآن کو صرف پہلی حیثیت سے ان سے تعلق ہے اس کے بعد اگر کوئی یہ سوال کرنے لگے کہ بادل کس طرح پیدا ہوتے ہیں اور بارش کیوں کر ہوتی ہے؟ اور اسی قسم کے حالات تو قرآن سے اس کا تلاش کرنا غلطی ہے بلکہ خود اس کی فکر میں پڑھنا لغو ہے۔

حدیث میں ہے:مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ، یہ ایسی کام کی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی ہے کہ اگر اس پر کاربند ہو جائیں تو ہم بہت سی مشکلات سے نجات پا جائیں، اور اس کا ذرا عنوان بدل دیا جائے تو اس کی حقیقت منکشف ہو جائے گی، خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اضاعت وقت سے منع فرمایا ہے اس وقت لوگ علی العموم اضاعت اوقات کی قباحت اور حفاظت اوقات کے استحسان پر متفق اللسان ہیں ،لیکن اس پر عمل اگر کیا ہے تو شریعت نے کیا ہے، دوسرے محض دعویٰ ہی دعویٰ کرتے ہیں ،تو جس چیز میں کوئی مقید فائدہ نہ ہو وہ لایعنی ہے۔

قانون شاہان میں تجارت اور زراعت سے بحث کی جاتی ہے، مگر اس طرح کے کون سی تجارت جائز ہے اور کون سی ناجائز؟ تاکہ امن قائم رہے، یہ کسی قانون میں نہیں ہے کہ تجارت اس طرح کرنی چاہیے اور نفع کی فلاں فلاں صورتیں ہیں، اگر قانون کی کتاب میں ساری باتوں کا ہونا ضروری ہے تو دکھلایئے کہ قانون گورنمنٹ میں یہ سب چیزیں کہاں ہیں۔؟

بس قرآن بھی ایک قانون ہے، امن اور تجارت کا اور وہ بھی یہ چاہتا ہے کہ دنیا میں امن قائم رہے اور آخرت میں نجات ہو، غرض قرآن پاک قانون ہے تو بڑے ظلم کی بات ہے کہ احکام ظاہری کے قانون میں تو ان مسائل سائنس کو تلاش نہ کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے قانون میں ان تمام باتوں کو تلاش کیا جائے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قانون کی حقیقت کو سمجھے ہی نہیں، تو اس تقریر سے ثابت ہوا کہ جغرافیہ وغیرہ مقصود نہیں ہیں، البتہ اگر ان کا ذکر ہوگا تو تبعاً ہوگا۔

لیکن هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ سے کوئی یہ نہ سمجھیں کہ متقیوں کے لیے ہے، اور غیر متقی کے لیے نہیں، اس آیت سے اکثر لوگوں کو دھوکا ہوجاتا ہے، نیز دوسری آیت میں بھی غلط سمجھ لیتے ہیں، اور وجہ اس کی زیادہ تر یہ ہوتی ہے کہ قرآن کو فلسفی نظر سے دیکھا جاتا ہے، چنانچہ اس سفر میں مجھ سے ایک صاحب نے اس کے متعلق دریافت کیا میں نے کہا کہ یہ تو کوئی بات نہیں، یہ محاورہ ہے، مطلب یہ ہے کہ اب جو لوگ متقی نظر آتے ہیں یہ اسی کی بدولت متقی بنے ہیں، اس جواب سے وہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے اب بالکل صاف ہوگیا۔

تو لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ ترجمے میں محض محاورے کا اتباع کرتے ہیں ،گو اصل مدلول محفوظ نہ رہے، اس وقت اس قسم کے بہت سے ترجمے ہو گئے ہیں ،تعیین کی ضرورت نہیں ہے، البتہ آپ لوگوں کو اتنا ضرور کرنا چاہیے کہ جب تک علماء سے دریافت نہ کرلو اس وقت تک کسی ترجمے کو بھی نہ دیکھو، اور دریافت کرنے کے بعد بھی اپنے دیکھنے پر اکتفانہ کرو بلکہ کسی سے پڑھ لو، یہ سورت قرآن مجید کی صحیح سمجھنے کی ہے غرض یہ ہے کہ اس وقت یہ غلطیاں عام ہو رہی ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہیں لیکن سمجھ کر نہیں پڑھتے اسی واسطے اشکالات ہوتے ہیں ورنہ کوئی بھی اشکال نہیں ہے، مثلاً هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ہی میں یہ سمجھ لیا کہ یہ صرف متقی کے لیے ہدایت ہے اور کسی کے لیے نہیں، حالانکہ یہ غلط ہے، بلکہ تعلیم اس کی عام ہے اور دلائل بھی عام فہم ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۳۵۱ تا ۳۵۷)

ایک شخص پرتاب گڑھ میں ملے اور فاتحہ خلف الامام کے متعلق سوال کیا میں نے کہا کہ آپ کو دوسرے سب مسائل محقق ہو گئے، انہوں نے کچھ جواب نہ دیا، میں نے کہا کہ اچھا آپ مسلمان ہیں، پھر میں آپ سے دلیل پوچھوں گا، اور دنیا بھر کے مذاہب کو پیش کر کے سب کی تردید کراؤں گا، اگر آپ ایک جگہ بھی جھجکے تو آپ مقلد ہیں، اور جب کہ آپ اصل مذہب میں مقلد ہیں، تو فرعی مسائل میں تقلید کرتے کیوں عار آتی ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۳۶۱)

# جو امن قرآن نے سکھلایا ہے کسی

## قانون نے نہیں سکھلایا ہے

قرآن نے صرف دو چیزوں کا اہتمام کیا ہے، ایک امن عام کہ اس دنیا میں رہ کر یہ حالت ہو کہ ۔

کسے را با کسے کارے نبا شد

میں کہتا ہوں کہ جو امن قرآن نے سکھلایا ہے کسی قانون نے نہیں سکھلایا لیکن افسوس ہے کہ اس وقت لوگ مسلمانوں کو شورش پسند کہتے ہیں، حالانکہ اگر موازنہ کر کے دیکھا جائے تو مسلمانوں سے زیادہ امن پسند اور امن جوئی قوم دنیا میں نہیں ہے، مثال کے طور پر ایک جزئی بیان کرتا ہوں جمعہ کے متعلق فرماتے ہیں۔

اِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ۔

وہ مجمع جو کہ محل خدا تعالیٰ کی عبادت کے لیے اور خدا تعالیٰ کے سامنے سر جھکانے کے لیے جمع ہوا ہے، اس کو بھی یہ حکم ہو رہا ہے کہ جب اپنا کام کر چکو تو جمع رہنے کی کوئی ضرورت نہیں، سب منتشر ہو جاؤ، کیونکہ ممکن ہے فضول اجتماع سے کوئی خرابی پیدا ہو، آگے فرماتے ہیں، وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ، جس سے مقصود یہ ہے کہ منتشر ہو کر بھی ادھر ادھر مارے مارے نو کیونکہ اس میں پھر فساد کا احتمال ہے بلکہ رزق حلال کی تلاش میں لگو، پھر فرماتے ہیں وَاذْكُرُ اللّٰهَ كَثِيْراً، یعنی خدا تعالیٰ کو بہت یاد کرو، کیونکہ اصل مقصود یہی ہے کہ خدا تعالیٰ کا قرب حاصل ہو، تو حق تعالیٰ

کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ مجمع بلا ضرورت نہ ہونا چاہیے، اور اگر کسی ضرورت سے ہوتو ضرورت کے ختم ہو جانے پر سب کو منتشر ہو جانا چاہیے، غور کیجیے کہ نمازیوں کا مجمع جس میں شورش وفساد کا احتمال ہی نہیں ہے مگر چونکہ خدا تعالیٰ جانتے ہیں کہ انسان ضعیف ہے، عجب نہیں کہ اس میں تُوتُو مَیں مَیں ہو جائے، اگرچہ جوتی پیزار نہ ہو ،اس لیے حکم فرمادیا کہ سب منتشر ہو جاؤ۔

غرض ایک تو قرآن میں امن کی رعایت ہے دوسرے خدا تعالیٰ کی رضا جوئی ،ان دو امر کے سوا اگر کوئی تیسرا مسئلہ آ گیا ہے تو وہ اس کے تابع ہو کر آیا ہے، تو معلوم ہوا کہ قرآن میں اس کے سوا اور کوئی مسئلہ نہ ڈھونڈنا چاہئے، علیٰ ہذا، اگر حکایتیں قرآن میں ہیں تو وہ بھی انہی کے خادم ہو کر ذکر کی گئی ہیں، فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو ان کو یہ سزا ملی اور فلاں قوم نے یہ کیا تھا تو ان کو یہ اجر ملا، ہم اگر ایسا کریں گے تو ہم کو بھی ایسا ہی سزا یا اجر ملے گا اس سے معلوم ہوا کہ جہاں جمل خبریہ ہیں ان سے مقصود جمل انشائیہ ہی ہیں۔

چنانچہ اس مقام پر بھی یہی ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل فرمائی جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ اعتناء فی الدین نہایت ضروری ہے جس کی تفصیل آیت میں ہے ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ اے ہمارے رب ہماری اولاد میں سے ایک رسول پیدا کر کہ وہ ان کو تیری آیات سناوے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم کرے، اور ان کو پاک کرے، اس حکایت کے نقل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اے سننے والو سمجھ جاؤ کہ ضروری چیزیں یہ ہیں کہ جن کا اہتمام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا اور سمجھ کر ہم سے دعا کی۔

اب سمجھنا چاہیے کہ وہ ضروری چیزیں کیا ہیں؟ سو وہ مفصلاً تو تین چیزیں ہیں اور مجملاً ایک چیز ہے، یَتْلُوْا، اور یُعَلِّمُ، اور یُزَکِّیْ اور مجملاً ایک چیز ہے جس کو دین کہتے ہیں، کیونکہ یہ سب دین ہی کے شعبے ہیں، اس لیے کہ دین مرکب ہے دو چیزوں سے ایک علم، اور دوسرا عمل، جیسے فن طب کے اس میں اول علم کی ضرورت ہوتی ہے پھر عمل کی۔

اطاعت خداوندی صراط مستقیم ہے اور صراط مستقیم سے خارج ہونا اعتدال سے خارج ہونا ہے، کیونکہ خط مستقیم ایک ہی خط ہوتا ہے، یعنی اگر دو نقطوں کے درمیان بہت سے خطوط سے اتصال کیا جائے تو ان خطوط میں خط مستقیم ایک ہی ہوگا جو کہ سب سے اکثر ہوگا، باقی سب ٹیڑھے ہوں گے اور اعتدال سے خارج ہونا مرض ہے، تو خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنا مرض ہوا، اور اس سے معلوم ہوا ہوگا کہ سب طریقوں سے مختصر طریق اور اکثر طریق شریعت اسلامی ہے، تو اس اعتدال سے جب کوئی خارج ہوگا وہ مریض کہلائے گا، اور قرآن میں اس کو مرض کہا گیا ہے، چنانچہ ارشاد ہے: فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ، اس کی تفسیر جب تک کہ وجدان صحیح نہ ہو سمجھ میں نہیں آسکتی، کیونکہ اس کے مرض ہونے کی صفت امر باطن ہے جو حواس سے ادراک نہیں ہوتا، لیکن جب وجدان صحیح ہوجاتا ہے تو اس کا مرض ہونا واجدان سے معلوم ہوجاتا ہے، جیسے امراض ظاہری کی حالت ہے کہ بعض اوقات وجدان سے معلوم ہوجاتا ہے، اور بعض اوقات نہیں ہوتا تو جیسے امراض طبیہ میں بعض امراض وجدانی ہیں اسی طرح امراض باطنی میں بھی وجدانی ہیں کہ جب وجدان صحیح ہوتا ہے تو اس کا ادراک ہوتا ہے۔

اس کا ایک امتحان بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب کوئی گناہ ہو جائے تو دیکھئے کیسی تکلیف اور رنج ہوتا ہے اور اپنے نفس کو انسان کیسی ملامت کرتا ہے، اگر کوئی کہے کہ ہم کو تو کبھی نہیں ہوتا، دن رات گناہ کرتے ہیں لیکن کچھ بھی تقریب وہ رنج کا احساس نہیں ہوتا، تو میں کہوں گا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ ابتداء سے آج تک یہ شخص مرض ہی میں مبتلا ہے، صحت کبھی نصیب ہی نہیں ہوئی اس کی راحت کا احساس ہوا اور اس سے مرض گناہ کی کلفت کا احساس ہوا اس شخص کی ایسی مثال ہے جیسے ایک اندھا مادرزاد کی اس کو یہی ادراک نہیں ہوسکتا کہ میں اندھا ہوں، کیونکہ عمی عدم البصر کو کہتے ہیں تو جس کو بصر کا ادراک نہ ہو اس کو عمی کا ادراک کیوں کر ہوگا، تو مریض بھی اپنے کو وہی سمجھے گا اور مرض کی کلفت بھی اسی کو ہوگی، جس نے کبھی صحت دیکھی ہو پس جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہم کو تو کبھی تکدر نہیں ہوتا تو وجہ اس کی یہ ہے کہ اس کو کبھی انشراح ہی نہیں ہوا، اس کو چاہیے کہ انشراح پیدا کرے اس کے بعد دیکھے کہ اگر کبھی کوئی گناہ ہو جاتا ہے تو اس میں کس قدر تکلیف ہوتی ہے۔

کم از کم یہی کرے کہ امتحان ہی کے لیے ایک ہفتہ کی رخصت اپنے معمولی کاموں سے لیں اور کسی صاحب برکت کے پاس جا کر رہے اور اس سے اللہ کا نام پوچھ کر جس طرح وہ بتلاوے ایک ہفتہ تک کام میں مشغول رہے، کام میں مشغول ہونے کے بعد دیکھئے گا کہ دل ایک نئی حالت ہوگئی جو کہ اس سے قبل نہ تھی، اس کو تو محفوظ رکھئے، پھر دیکھیے کہ پہلی حالت اور اس جدید حالت میں کوئی فرق ہے یا نہیں، واللہ آپ دیکھیں گے کہ پہلی حالت نہایت مکدر تھی اور اب ایک صحت نصیب ہوگئی ہے اور ایک قسم کا انشراح قلب ہے۔

# خدا کو ہمارے ایمان سے کوئی نفع ہے

## نہ کفر سے کوئی ضرر

اور قرآن میں بہت سی جگہ ہے یہ مضمون آیا ہے کہ ہمارا نہ کوئی نفع تمہارے ایمان سے اور نہ کوئی ضرر تمہارے کفر سے، اور یہ فرمانا ایسا ہے جیسے کوئی طبیب کہنے لگے کہ اگر تم دوا پیو تو ہمارا کیا نفع، اور نہ پیو تو ہمارا کیا ضرر، بلکہ حکیم کو تو ایک گونہ نفع بھی ہے، خدا تعالیٰ کو تو کچھ بھی نفع نہیں، اس واسطے کہ خدا تعالیٰ کے لیے استکمال بالغیر ہے، ہر چیز ان کے افادۂ وجود کی محتاج ہے، مگر وہ کسی امر میں کسی کی محتاج نہیں ہے، آفتاب عالمتاب، عطر خانہ اور گھورہ سب پر روشن ہے، لیکن نہ اس کو عطر خانہ سے خوشبو پہنچتی ہے نہ گھورے سے بدبو، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

ما بری از پاک وناپاکی ہمہ
وزگراں جانی وچالاکی ہمہ

کہ ہم تو ایسے مقدس ہیں کہ پاکی سے بھی پاک ہیں، پاکی سے پاک ہونے کے معنیٰ یہ ہے کہ جیسی پاکی تم سمجھتے ہو ہم اس پاکی سے پاک ہیں، کیونکہ انسان کتنی بھی تقدیس کرے لیکن احصاء غیر ممکن ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

لااحصی ثناءعلیک انت کمااثنیت علی نفسک۔

واقعی بڑی سے بڑی تعریف اور تقدیس بھی اس کے واقعی تقدس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں، اس کی مثال مولانا نے بیان فرمائی ہے کہ ۔

شاہ را گوید کسے جولاہہ نیست
ایں نہ مدح ست اومگر آگاہ نیست

یعنی اگر کوئی شخص بادشاہ کی تعریف کرے کہ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں کہ جولاہے نہیں ہیں تو کیا اس کو کوئی مدح کہے گا ، ہرگز نہیں، اس طرح ہمارے فہم کے موافق ہمارے نفع کے لیے تسبیح کو مشروع کردیا گیا ہے، اسی کو مولانا فرماتے ہیں ۔

من نگردم پاک از تسبیح شاں
پاک ہم ایشاں شوند دور فشاں

غرض خدا تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہاں نہ نفع پہنچے نہ ضرر، حدیث میں ہے کہ اگر ساری دنیا مطیع ہوجائے تو خدا تعالیٰ کی سلطنت میں اتنا بھی اضافہ نہیں ہوتا جتنا مچھر کا پر، برخلاف یہاں کے سلاطین کے جس قدر رعایہ اطاعت کرے سلطنت زوردار ہے، اور اگر رعایا اطاعت نہ کرے تو سلطنت کمزور ہے، وجہ یہ ہے کہ دنیا کے بادشاہ رعایا کے بنائے ہوئے ہیں، اور خدا تعالیٰ خود بذات کامل ہے، لہٰذا رعایا کو خود اپنے نفع کی فکر کرنی چاہیے، اللہ تعالیٰ کو ان کی عبادت سے کچھ بھی نفع نہیں ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۳۶۶ تا ۳۷۴)

مگر ایک جزو ایسا ہے کہ اس کو بالاتفاق سب نے چھوڑ رکھا ہے، یعنی خدمت الفاظ قرآن جو کہ علم کے دو شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے چنانچہ آج کل کے عقلاء کا تو اس پر اجماع ہوگیا ہے کہ قرآن کے پڑھنے کے کوئی ضرورت نہیں ہے، چنانچہ

اپنے بچوں کو قرآن نہیں پڑھاتے اور کہتے ہیں کہ بچے کے اتنے دن کیوں ضائع کیے جائیں، میں کہتا ہوں کہ اگر تلاوت ایک بے کار اور فضول چیز ہے تو قرآن میں جو جا بجا تلاوت کی فضیلت آئی ہے اور حکم فرمایا گیا ہے اور تلاوت کرنے والوں کی مدح فرمائی گئی ہے، کیا یہ سب ترغیب اور حکم محض بے کار چیز پر ہے، ایک جگہ ارشاد ہوتا ہے: اُتْلُ مَآ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں: یَتْلُوْنَ اٰیٰتِ اللّٰہِ اٰنَآءَ الَّیْلِ۔

کیا قرآن کے یہ اجزاء عمل کرنے کے لیے نہیں محض دیکھنے کے لیے ہیں، اور کیا یہ حالت پیدا کر کے ہم لوگ صاحب کتاب کہلانے کے مستحق ہیں۔

صاحبو! اگر کسی شخص کے پاس بہت سا مال ہو اور وہ اس کو کسی ایسی جگہ رکھ دے کہ اس سے منتفع نہ ہو سکے تو کیا اس شخص کو مالدار کہیں گے، پس ایسی حالت میں جیسا وہ صاحب مال ہے ایسے ہی آپ صاحب کتاب ہیں، افسوس آپ نے ایک عظیم الشان دولت کو چھوڑ دیا ہے، اور پھر آپ کو ذرا غم نہیں ہے۔

## قرآن کی تلاوت اور حفظ مسلمانوں کیلئے

### ضروری ہے یا نہیں؟

اگر کہو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تو سمجھو کہ اگر پڑھنا چھوٹ جائے تو قرآن کا لکھنا اور چھپنا اور فروخت ہونا سب چھوٹ جائے، اور قرآن کہیں بھی دستیاب نہ ہو، یہ بات اس وقت آپ کو ہلکی معلوم ہوتی ہے، مگر ایک صدی کے بعد آپ دیکھئے

کہ کیسا حالت ہوگی، اور اگر دستیاب بھی ہو تو صحیح لکھا جانا اور صحت معلوم ہونا یہ سب اسی تلاوت اور حفظ کی بدولت ہے، اس وقت علوم دینیہ کی جوگت ہو رہی ہے ظاہر ہے تو اگر تلاوت بھی بالکل ترک کر دی جائے اور لوگوں کے ذہن سے قرآن اتر جائے اور پھر کسی لفظ یا آیت میں اختلاف ہو تو کون شخص فیصلہ کرے، بلکہ میں کہتا ہوں کہ علوم دینیہ اگر باقی بھی ہیں تب بھی پڑھنا چھوڑ دینے کی صورت میں قرآن مجید کی صحت نہیں ہوسکتی۔

مجھے اپنے بچپن کا قصہ یاد ہے کہ ایک مرتبہ میں نماز میں قرآن سنا رہا تھا اور والد ماجد مرحوم سن رہے تھے میں اس زمانے میں صرف ونحو کی چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑھا کرتا تھا جب میں نے یہ آیت پڑھی: فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗٓ اَحَدٌ۔ کی ذال کو مفتوح پڑھا اور اپنے ذہن میں عَذَابَهٗ کی ضمیر کا مرجع نائب فاعل انسان کو اس سے قبل آیت میں مذکور ہے قرار دیا، اور کسر ذال کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہ آئی، والد صاحب مرحوم نے ٹوکا میں نے پھر وہی پڑھا، انہوں نے مکرر ٹوکا میں نے پھر وہی پڑھا، انہوں نے تیسری بار پھر ٹوکا میں نے بکسر ذال پڑھا لیکن دل میں یہ خیال رہا کہ والد صاحب نے صحیح نہیں بتلایا، جب سلام پھیرا تو انہوں نے پوچھا کہ تم اتنا اصرار کیوں کرتے ہو، میں نے کہا کہ کسرہ کے معنی نہیں بنتے اس لیے غلط ہے قرآن دیکھا گیا تو کسرہ نکلا مارے وہم کے اور قرآن دیکھا سب میں وہی کسرہ آخر اپنی غلطی ظاہر ہوئی۔

یہ مثال کے طور پر اپنا ایک واقعہ بیان کر دیا ہے اسی طرح اور بہت سی غلطیاں ہوتی ہیں لیکن حفظ کی بدولت وہ سب صحیح ہو جاتی ہیں اور اگر حافظ باقی نہ

رہے تو باوجود علماء کے ہونے کے بھی تحریف ممکن ہے، تو یہ سب حافظوں کی بدولت ہے کہ قرآن صحیح موجود ہے، اب فرمایئے کہ حفظ کی کتنی ضرورت ثابت ہوئی، بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اگر حفظ کرنے کا سلسلہ بند ہو جائے اور پڑھنا پڑھانا چھوٹ جائے اور قرآن کے صحیح نسخے موجود ہوں تب بھی صحیح نہیں پڑھے جا سکتے۔

اس کی تائید کے لیے میں ایک واقعہ بیان کرتا ہوں میرے بھائی ریل میں سوار تھے اور ایک تفسیر ان کے ہاتھ میں تھی جو کہ ٹائپ کے چھاپے کی چھپی ہوئی تھی، ایک صاحب بہادر بھی اسی ڈبے میں سوار تھے، بھائی سے کہنے لگے کہ میں اس کتاب کو دیکھ سکتا ہوں انہوں نے کہا کہ دیکھئے، آپ نے تفسیر کو اٹھا کر دیکھا، اول ہی آلہ نکلا ،صاحب بہادر نے بہت دیر تک اس کو سوچا جب سمجھ میں آیا تو بھائی سے پوچھتے ہیں یہ کیا ہے؟ آلو بھائی نے تفسیر ہاتھ سے لے لی اور کہا کہ یہ آپ کی دیکھنے کی نہیں ہے۔

اب میں کہتا ہوں کہ اپنی اس تجویز پر اس روز بد کو سوچ کر دیکھیے جب کہ آپ بھی اس انگریز کی طرح آلہ کو آلو پڑھنے لگیں گے واللہ جب تک کسی پڑھے ہوئے سے نہ پڑھا جائے ممکن ہی نہیں کہ آلہ یا اس کے دوسرے الفاظ کو صحیح پڑھا دیا جاوے ،آخر یہ کس طرح معلوم ہوگا کہ تلفظ میں الف لام را علٰیحدہ علٰیحدہ پڑھے جائیں گے، اور اگر کوئی کہے کہ اس کے صحیح پڑھنے کی ضرورت ہی کیا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ ایسے لوگوں سے جو اس حد تک پہنچ چکے ہوں اس وقت ہماری گفتگو نہیں ہے۔

ایک اور دلیل حفظ قرآن کے ضروری ہونے کی بیان کرتا ہوں اور وہ یہ دلیل اس وقت کے مذاق کے اعتبار سے بہت عجیب دلیل ہے اس کے لیے اول دو مقدمے سنیے۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ جتنی عرضی وسماوی کتابیں ہیں ان میں کوئی کتاب بھی ایسی نہیں ہے کہ وہ یاد ہو کر یاد رہ سکے، اور اگر کسی نے یاد بھی کر لیا تو بہت بڑے حافظے کی ضرورت ہے، اور قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جاتا ہے اور بہت تھوڑی عمر میں لڑکے اس کو حفظ کر لیتے ہیں۔

چنانچہ قصبہ پانی پت میں تو اگر دس سال کا بچہ حفظ نہ کر لے تو کہتے ہیں کہ کیا بوڑھا ہو کر حفظ کرے گا اور اکثر لڑکیاں بھی وہاں کی حافظ ہوتی ہیں اور سبع کی جاننے والی لڑکیاں متعدد ہیں، اور قرآن کے حفظ کے ایسے عجیب وغریب قصے ہیں کہ لوگ سن کر تعجب کرتے ہیں۔

چنانچہ میرے ایک دوست بردوان کے رہنے والے ہیں انہوں نے تین ماہ سے بھی کم میں قرآن حفظ کر لیا تھا، ایک اور میرے دوست نے اپنے پیر یعنی میرے استاد کو خواب میں دیکھا تو انہوں نے ان کو اپنے سینے سے لگایا اور ان کے سینے میں ایک نور داخل ہوا، انہوں نے ایک معبّر سے بیان کیا انہوں نے تعبیر یہ دی کہ تم کو قرآن حفظ ہو جائے گا، چنانچہ انہوں نے یاد کرنا شروع کیا سو چھ ماہ میں اچھا خاصا حفظ ہو گیا۔

ایک اور قصہ یاد آیا ایک واعظ مظفر نگر میں وعظ کہہ رہے تھے ایک آیت میں قصداً رک کے اور حاضرین سے خطاب کیا کہ اس مجلس میں جتنے حافظ ہوں کھڑے ہو جائیں، تاکہ میں ان سے یہ آیت پوچھ سکوں اس کو سن کر ایک جماعت کثیر کھڑی ہو گئی، انہوں نے کہا کہ صاحبو! مجھ کو آیت یاد ہے میں نے صرف یہ دکھلانا چاہا کہ مسلمانوں کے اس اتفاقی اور مختصر مجمع میں جہاں خاص حفاظ کو جمع نہیں کیا گیا ایسی

تعداد سے مذہبی کتاب کے برزبان یادرکھنے والے موجود ہیں۔ کیا دوسری کوئی قوم قصداً جمع کر کے بھی اس قدر تعداد اپنی مذہبی کتاب کے حافظوں کی دکھلا سکتی ہے غرض قرآن مجید بہت سہولت سے یاد ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس زمانے میں عقلاء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نیچر ہر زمانے میں اس چیز کو پیدا کرتا ہے جس کی ضرورت ہوتی ہے میں اس کو اصطلاح میں کہتا ہوں کہ خدا تعالیٰ ہر زمانے میں اس چیز کو پیدا کرتے ہیں جس کی ضرورت ہوتی ہے۔

ان دونوں مقدموں کے ممہد ہونے کے بعد میں کہتا ہوں کہ کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے یہ مادہ طبیعت میں ودیعت کیا ہے کہ قرآن شریف بہت جلد یاد ہو جائے، معلوم ہوا کہ فطرۃً اس کے حفظ کی ضرورت ہے تو صاحبو! اپنے نیچر کی مخالفت نہ کرو۔

سنا ہے کہ نول کشور کے یہاں ایک پتھر پر قرآن لکھا ہوا نالی پر رکھا ہوا تھا مولوی حبیب الرحمن صاحب سہارنپوری نے اسے دیکھا تو اس سے کہا منشی صاحب یہ تو ہمارے اور آپ کے دونوں کے نزدیک معظم ہے، ہمارے نزدیک قرآن ہونے سے اور آپ کے نزدیک پتھر ہونے سے کہ مادہ بت کا ہے۔

اسی طرح میں کہتا ہوں کہ جو لوگ رسولؐ کے متبع ہیں ان کو رسولؐ کے کہنے سے اور جو لوگ نیچر کے متبع ہیں ان پر نیچر کے کہنے سے اس کی حفاظت ضروری ہے۔

پس ثابت ہوا کہ حافظ بننا ضروری ہے، ہاں آپ ڈریے نہیں میں یہ نہ کہوں گا کہ ہر شخص حافظ ہو، البتہ ہر شخص پر حفظ کو ضروری سمجھنا ضروری ہے، مگر ضروری

سمجھنے کی علامت نہیں کہ صرف منہ سے کہنے لگو کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں، بلکہ اس کا ضروری ہونا دل میں رچ جانا چاہیے اوراس کا پتہ آثار سے خود بخود چل جاتا ہے۔

دیکھئے !اگر شراب نہ پی ہو تو کبھی وجد اور بے ہوشی نہیں ہوگی، اگر چہ زبان سے کتنا بھی کہا جائے کہ شراب پی ہے اور جب پی جائے گی تو فوراً ہی اس کا اثر بھی ظاہر ہوگا، اگر چہ اس کو کتنا ہی روکا جائے۔

## اگر تمہارا بچہ حفظ نہیں کرے گا تو کچھ دنوں کے

### بعد تم اسلام سے دور اور کفار اسلام سے قریب ہو جائیں گے

تو محض یہ کہہ دینا کہ ہم ضروری سمجھتے ہیں کافی نہیں ہے، بلکہ دل سے ضروری سمجھنا چاہیے، جس پر آثار بھی مرتب ہوں اور عمل بھی، اور اگر کہیے کہ یہ کیا ضروری ہے کہ سارے کام ہم کریں، ضروری بھی ہم ہی سمجھیں، اور اس پر عمل بھی ہم ہی کریں، دنیا میں اور لوگ بھی تو ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہر چیز اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوتی ہے، پس ضروری سمجھنا بھی جب کبھی متحقق ہوگا اپنے لوازم کے ساتھ متحقق ہوگا اور وہ عمل ہے۔

اس اعتراض پر مجھے ایک حکایت یاد آئی حضرت مولانا محمود حسن صاحب سلمہ کے ہاں ایک طالب علم تھے نہایت ہی کم سمجھ ایک مرتبہ سبق میں انہوں نے مولانا سے ایک سوال کیا جو متضمن ایک دعویٰ کو تھا، مولانا نے فرمایا کہ اس کی دلیل بیان کرو، تو آپ فرماتے ہیں کہ کیا ضرور ہے کہ سارے کام ہم ہی کریں، دعویٰ بھی ہم ہی کریں اور دلیل بھی ہم ہی بیان کریں، دعویٰ ہم نے کر دیا ہے دلیل آپ بیان کر دیں۔

اب غور کیجئے کہ اس ایک حکایت پر سب کو ہنسی آتی ہے، لیکن اپنے اس خیال پر جب ہم حفظ القران کو ضروری سمجھتے ہیں تو ہم کو عمل کی کیا ضرورت، ہنسی نہیں آتی، حالانکہ دونوں واقعے ایک ہی مرتبے میں ہیں، سو غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر سب کے سب اسی پر متفق ہو جائیں کہ ہم کو محض ضروری سمجھ لینا کافی ہے اور اس سمجھنے پر عمل ایک بھی نہ کرے تو آخر قرآن کو حفظ کون کرے گا؟ کیا یہود اور نصاریٰ کریں گے؟ اور اس وقت جو رنگ پلٹ رہا ہے اور اس زمانے کی رفتار میں جو تغیر ہو رہا ہے اس پر نظر کر کے یہ بھی بعید نہیں معلوم ہوتا، اگرچہ ابھی تک اس تغیر کی ابتدائی حالت ہے کہ سنبھالنے سے سنبھل سکتی ہے لیکن اگر اس پر توجہ نہ کی گئی تو پچاس برس کے بعد بالکل ہی نئی حالت ہوگی، اس واسطے کہ اس وقت مسلمانوں نے اکثر قرآن کو پڑھنا چھوڑ دیا ہے اور دوسری قوموں نے بغرض اعتراض کرنے کے پڑھنا شروع کیا ہے، تو اگر یہی رفتار رہی تو چند روز میں عجب نہیں کہ مسلمانوں کو اسلام سے بُعد اور ان کفار کو اسلام سے قرب ہوتا جاوے۔

اسلام سے بُعد کا پہلا زینہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر اور دین کو چھوڑ کر صرف دنیا کے حاصل کرنے پر متوجہ ہو رہے ہیں، اور تحصیل دین کو مخل دنیا سمجھ رہے ہیں، اور واقعی حقیقت یہ ہے کہ دنیائے حلال دین کے ساتھ سایہ کی طرح ہے، اگر کوئی سائے کو پکڑنا چاہے تو اس کی صورت یہی ہے کہ اصل چیز کو حاصل کرے، تو دنیا بھی جبھی حاصل ہو سکتی ہے کہ جب دین کو مضبوطی کے ساتھ اختیار کیا ہو، آج افسوس ہے کہ فلسفہ و حقیقت شناسی کی اتنی بڑی ترقی ہے، لیکن لوگ دنیا کی حقیقت

میں ذرا غور نہیں کرتے، محض مال اور جاہ کی طلب کو اصل مقصود سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ امر دیکھنے کے قابل ہے کہ مال کیوں مقصود ہے، اور جاہ کیوں مطلوب ہے۔

سو مال تو جلب منفعت کے لیے مطلوب ہے، اور جاہ دفع مضرت کے لیے، یعنی ہم کو بڑائی کی اتنی ضرورت ہے کہ ظالموں کی دستِ بُرد سے محفوظ رہیں، دیکھیے! سقے چمار وغیرہ بیگار میں پکڑے جاتے ہیں، لیکن جو معزز لوگ ہیں وہ نہیں پکڑے جاتے، کیونکہ وہ ذی جاہ ہیں اور جاہ ایک قدرتی قلعہ ہے، تو یہ دونوں چیزیں جلب منفعت اور دفع مضرت کے لیے ہیں، پس مال اس قدر کافی ہے کہ جس سے ہم منافع حاصل کر سکیں، اب لوگوں نے نفس مال کو معبودِ مطلق بنا رکھا ہے تو یہ کتنی بڑی فلسفی غلطی ہے۔

صاحبو! اصل مقصود محض دین ہے، جب وہ حاصل ہو جاتا ہے تو دوسرے مقاصد خود بخود حاصل ہو جاتے ہیں، چنانچہ دیکھ لیجیے! کہ جو لوگ خدا کے کام میں لگے ہیں ان میں کوئی بھی پریشانی میں مبتلا نہیں، بلکہ میں کہتا ہوں کہ اہل اللہ اس قدر آسائش میں ہیں کہ اہل دنیا کو بھی اتنی آسائش نصیب نہیں ہے، اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اول ایک بڑے سے بڑے دنیا دار کے پاس ایک مہینہ رہیے، اس کے بعد اہل اللہ میں سے کسی کے پاس ایک مہینہ بھر رہ کر دیکھیے، پھر دونوں کی حالت میں موازنہ کیجیے، آپ کو صاف معلوم ہوگا کہ وہ دنیا دار طرح طرح کے افکار میں مبتلا ہے، اور یہ دیندار پریشانی سے محفوظ و مامون ہے یہ تو مال کی غایت تھی۔

رہی جاہ اس میں اہل اللہ اہل دنیا سے زیادہ بڑھے ہوئے ہیں، عزت جس چیز کا نام ہے وہ انہی حضرات کو نصیب ہے، کیونکہ عزت دو طرح کی ہوتی ہے، ایک

تو عزت زبان سے، اور ایک دل سے، اہل دنیا کی جو کچھ عزت ہوتی ہے وہ محض زبان اور ہاتھ پیر سے ہوتی ہے، یعنی لوگ ظاہر میں ان کی عزت کرتے ہیں، دل میں کسی قسم کی وقعت ان کی نہیں ہوتی، اور اہل اللہ کی عزت دل سے ہوتی ہے۔

دوسرے اہل دنیا اور اہل اللہ میں اس سے بھی زیادہ ایک فرق ہے اور وہ ایک تمدنی مسئلہ ہے، یعنی معزز وہ شخص کہلائے گا کہ جو اپنی قوم میں معزز ہو، ایک مقدمہ تو یہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مجموع مرکب میں قوم وہ جماعت ہے جس کے احاد زیادہ ہوں، جیسا کہ میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گیہوں کا ڈھیر وہ کہلائے گا جس میں گیہوں زیادہ ہو، اس پر قیاس کر کے اب میں پوچھتا ہوں کہ مسلمانوں میں زیادہ افراد کن لوگوں کے ہیں، غرباء کے یا امراء کے؟ ظاہر ہے کہ غرباء مسلمانوں میں زیادہ ہیں، تو مسلمانوں کی قوم غرباء کی جماعت کا نام ہوگا، اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ غرباء میں کس کی عزت زیادہ ہے، اہل اللہ کی، یا اہل دنیا کی، ہر شخص جانتا ہے کہ اہل اللہ کی عزت غرباء میں زیادہ ہے، تو قوم کے نزدیک معزز اہل اللہ ہوئے، تو اس تمدنی مسئلے سے ثابت ہو گیا کہ مال اور جاہ سے جو امر مقصود ہے اہل اللہ ہی کو حاصل ہے۔

## ایک جماعت ایسا ہونا ضروری ہے جو دین
### کے کام کے سوا کوئی اور کام نہ کرے

چونکہ معاش کی بھی ضرورت ہے اس لیے کچھ افراد اس میں بھی لگیں اور کچھ افراد ایسے بھی ہونے چاہیے کہ وہ محض خادم قوم ہوں، کیوں کہ اگر سب کے سب تحصیل معاش میں پڑ جائیں تو دین کا سلسلہ آگے کو نہیں چل سکتا، مثلاً سر رشتہ تعلیم

ہی کولیا جائے کہ اگر اُس میں کوئی نہ جائے تو ساری نوکریاں بند ہوجائیں گی، اسی طرح دین کے کام میں بھی اگر کوئی نہ لگے تو یہ کام بند ہوجائے گا، لہٰذا ضروری ہے کہ ایک جماعت محض خادمانِ دین کی ہو، کہ یہ لوگ اس کے سوااور کوئی کام نہ کریں ،اور میں اس کی ایک نظیر رکھتا ہوں کہ قانونی حکم ہے کہ جو شخص ملازم سرکار ہو وہ دوسرا کام نہیں کرسکتا، چنانچہ اگر کسی نے کیا تو اس کو ملازمت چھوڑنے پر مجبور کیا گیا یا اس کو دوسرے کام کے ترک کرنے پر مجبور کیا گیا۔

علیٰ ہذا سید صاحب کو دیکھئے! کہ ان کو دنیا کی دُھن تھی تو اس میں کیا حالت تھی کہ اپنی زندگی اور آسائش سب اس میں صرف کردی، میں کوئی چیز نہیں ہوں، لیکن یہ حالت ہے کہ جب کبھی کوئی رسالہ لکھتا ہوں تو راتوں کو نیند نہیں آتی، پینسل کاغذ پاس لے کر سوتا ہوں، اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر جو کچھ یاد آتا ہے اس کو لکھتا ہوں، تو اگر ایسے شخص کو کوئی دوسرا کام دے دیا جائے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ بھی خراب ہوگا اور وہ بھی۔

ایک شاعر کی حکایت مشہور ہے کہ وہ نماز پڑھ رہا تھا کہ ایک مصرع سوجھا، فوراً نماز توڑ دی، اور اس مصرع کو لکھا، اگرچہ اس کی یہ حرکت پسندیدہ نہ تھی، لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا ہوگا کہ جب کسی کام کی دھن ہوتی ہے تو کیا حالت ہو جاتی ہے، تو اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ ایک جماعت کا ایسا ہونا ضروری ہے کہ وہ دین کے کام کے سوا اور کوئی کام نہ کرے۔

اس جماعت پر یہ الزام بھی بالکل خلاف انصاف ہے کہ یہ قوم کے محتاج ہیں، البتہ اگر وہ تم سے مانگے تو ان کو جو چاہو سو کہو، سو بحمد للہ ان کا تو یہ مذاق ہے کہ ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو، کہنے لگے کہ ہم خدا کے

مہمان ہیں، اور مہمان نی تین دن کی ہوا کرتی ہے، وَإِنَّ يَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَأَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّونَ۔ حضرات واللہ، اس وقت بھی ایسے خدا کے بندے موجود ہیں کہ لوگ ان کو دیتے ہیں اور وہ نظر بھی نہیں کرتے اور ان کی وہ حالت ہے کہ ؂

ولا رامے کہ داری دل در و بند
دگر چشم از ہمہ عالم فرو بند

وہ ایک ہی ذات میں ایسے منہمک ہیں کہ کسی دوسرے کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا، شاہ نیمروز نے ایک بزرگ کو لکھا، دیکھئے! اس حکایت سے معلوم ہوگا کہ دینے والے درخواست کرتے ہیں اور لینے والے صاف انکار کر دیتے ہیں کہ میں چاہتا ہوں اپنا آدھا ملک نیمروز آپ کے حوالے کر دوں، آپ نے جواب میں تحریر فرمایا ؂

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد
در دل اگر بود ہوس ملک سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب
ملک من نیمروز بیک جو نمے خرم

غور کیجئے! کہ ادھر سے اصرار ہے اور اُدھر سے سوکھا جواب ہے کہ ہم کو کوئی ضرورت نہیں، اور اس میں تصنع نہیں تھا، ورنہ اثر کیوں ہوتا، تو جب وہ آپ سے مانگتے نہیں تو آپ کو کیا فکر ہے، اور جب یہ بات ہے تو آپ کیوں پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں سے کھائیں گے، اور اگر کہیے کہ یہ تو شافی جواب نہ ہوا، کیونکہ اس میں یہ تو پتہ ہی نہ چلا کہ

آخر کہاں سے کھائیں گے، تو صاحب یہ جواب تو میں نے معترضین کی رعایت کر کے دے دیا تھا۔

لیجیے! اب میں اصلی جواب دیتا ہوں لیکن اس میں معترضین کی رسوائی ہوگی، اس جواب کے لیے اول میں ایک مثال پیش کرتا ہوں کہ اگر کسی شخص نے نکاح کیا اور جب بیوی اس کے گھر آئی تو وہ بیوی سے پوچھنے لگا کہ تم نے نکاح تو کرلیا مگر یہ تو بتلاؤ کہ تم کھاؤ گی کہاں سے؟ تو وہ بھی اس کو کیا جواب دے گی، ظاہر ہے کہ یہ جواب دے گی کہ میاں میں تمہاری جیب سے لے کر کھاؤں گی، اور کہے گی کہ تم کو یہ پوچھتے ہوئے شرم نہیں آتی، اس سوال سے خود اپنی بے عزتی ظاہر کر رہے ہو، اور یہ جواب نہایت سچا اور حق جواب ہوگا۔

جب یہ مثال سمجھ میں آ گئی تو اب میں اس سوال کا جواب دیتا ہوں کہ یہ لوگ انہی معترضین کی جیبوں سے اصول کر کے کھائیں گے، اور اس سوال سے یہ معترضین اپنی قلعی کھول رہے ہیں کہ ہم میں حمیّت نہیں ہے کہ خادمانِ دین کی خدمت کو ضروری نہیں سمجھا، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ یہ شرعی مسئلہ ہے کہ جو شخص کسی کام میں محبوس ہو اس کا نان نفقہ اس پر واجب ہوتا ہے، چنانچہ بیوی کا نام نفقہ اسی لیے شوہر پر واجب ہے، چنانچہ اگر وہ از خود اپنے گھر چلی جائے تو شوہر پر اس کا نفقہ واجب نہیں رہتا، حالانکہ بیوی اس وقت بھی رہتی ہے اسی طرح قاضی کا نفقہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے کیونکہ لوگوں کی ضرورت میں محبوس ہے۔

اب دیکھیے! کہ بیت المال کس چیز کا نام ہے، سو بیت المال کا خلاصہ یہ ہے

کہ وہ مسلمانوں کے مال کا مجموعہ اور بلفظ دیگر مسلمانوں کا چندہ ہوتا ہے، مگر چندہ ذلیل لفظ ہے ،اور بیت المال اور خزانہ معظم لفظ ہے، لیکن حقیقت ایک ہی ہے، چنانچہ بادشاہ کو جو خزانہ شاہی سے تنخواہ ملتی ہے وہ خزانہ کیا چیز ہے، کیونکہ خزانہ بھی مسلمانوں کے پیسہ پیسہ دودو پیسہ کے مجموعہ کا نام ہے،تو اگر یہ ذلت ہے تو بادشاہ نے بھی یہی کیوں لیا، نیز تمام حکام کو جو تنخواہ ملتی ہے وہ اسی مدّ میں سے ملتی ہے، کیونکہ وہ اس قدر محبوس اور مجبور ہوتے ہیں کہ اگر کوئی دوسرا کام کریں تو مجرم سمجھے جاتے ہیں۔

## مولویوں کی جماعت ہمیشہ قائم رہے گی اور مولوی

### کھاتے رہیں گے چاہے سب لوگ ان کو دینا اور مدد کرنا بند کردیں

آپ کو معلوم ہے کہ آریہ اپنے مذہب کی اشاعت میں بہت سرگرم ہے، انہوں نے یہ طے کرلیا ہے کہ ایک جماعت ان میں مذہب ہی کی حمایت کرنے کے لیے رہے اور تمام قوم ان کی متنکفل ہو،صاحبو! افسوس کی بات ہے کہ ایک ایسی قوم جس کے پاس مذہبی جماعت نہ تھی اس نے مذہبی جماعت تیار کرنے کی کوشش کی، اورتمہارے پاس ایک عظیم الشان جماعت موجود ہے،اورتم اس کوتوڑنے کی فکر میں ہو،لیکن یاد رکھو! کہ اگر تم نہ بھی کفالت کرو بلکہ تمام لوگ اس جماعت کے مخالف ہو جائیں اور سب اس کو دینا اور مدد کرنا بند کردیں تب بھی یہ جماعت قائم ہی رہے گی ،اور مولوی کھاتے ہی رہیں گے۔

اگر کہیے کہ کیوں کر کھاتے رہیں گے اور کہاں سے ان کو ملے گا؟ تو لیجئے! میں بتلاتا ہوں کہ کہاں سے ان کو ملے گا قرآن شریف میں ارشاد ہے۔

هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللهِ فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ ۖ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ ۚ وَاللهُ الْغَنِيُّ وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ ۚ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم۔

حاصل ترجمہ یہ ہے کہ تم کو انفاق فی سبیل اللہ کے لیے بلایا جاتا ہے، مگر بعض بخل کرتے ہیں اور اس بخل سے اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، ورنہ خدا تعالیٰ غنی ہے، اور تم محتاج ہو، اگر تم اس سے بے توجہ ہی کرو گے تو خدا تعالیٰ تمہارے بدلے دوسری قوم پیدا کر دیں گے، جو کہ دین کی خدمت کرے گی، اب اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ قوم کہاں سے پیدا ہوگی تو اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ روزانہ یہ سلسلہ خلق جاری ہی ہے، اور دوسرا جواب یہ ہے کہ اس وقت تمام عالم کے انسانوں کی حالت میں غور کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مسلمان ہیں وہ اسلام کے احکامات اور اس کی تعلیمات کو چھوڑ چھوڑ کر اس سے دور ہو رہے ہیں، اور نا مسلم لوگ اسلام کی خوبیوں کی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے چلے جا رہے ہیں، اور جزئیات شرع کے اسرار و حکم تک بیان کرنے کا ان کو خیال ہے۔

چنانچہ ایک ڈاکٹر نے مٹی کے ڈھیلے سے استنجا کرنے کے متعلق کہا کہ مٹی بہت سے روقروح کا علاج ہے تو پیشاب میں جو مادہ تیزاب کا ہے اس کی مضرت روکنے کے لیے مٹی کا استعمال مصلحت ہے۔

اسی طرح ایک اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ والہ وسلم کا ارشاد دیکھا کہ آپ نے فرمایا ہے کہ اگر کتا برتن کو چاٹ جائے تو اس کو سات مرتبہ

دھوڈالو، ان سات مرتبہ میں ایک مرتبہ مٹی سے بھی دھوڈالو، اس ارشاد میں مجھے یہ خیال ہوا کہ مٹی سے دھونے کو کیوں فرمایا، کیا سات مرتبہ پانی سے دھونا کافی نہیں، آخر بہت دنوں کی چھان بین اور تلاش کے بعد یہ معلوم ہوا کہ مٹی میں ایک جز ونوشادر کا بھی ہے اور نوشادر لعاب کلب کی سمّیت کا دافع ہے، مگر ہر جگہ وہ میسر نہیں، اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی چیز ارشاد فرمائی جو کہ ہر جگہ میسر ہو، اور آسانی سے میسر ہو، یعنی مٹی، تو مسلمانوں کی وہ حالت ہے اور غیر مسلموں کی یہ حالت ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمہید ہے، اس دن کی، جس دن کے عجب نہیں کے ایسے مسلمان خارج اسلام ہو جائیں، اور ایسے غیر مسلم مسلمان ہو جائیں، اور اگر مسلمانوں کو اس عمل کا خیال ہے کہ یہ روز بد وز نہ دیکھنا پڑے، اور حفاظت اسلام کی سعادت تمہارے نام رہے تو سنبھلو اور کام میں مشغول ہو جاؤ، مسلمانوں کا ہرا بھرا کھیت سوکھتا ہے، لیکن اب بھی کچھ نہیں گیا اگر ذرا سی توجہ بھی یہ کریں تو کافی ہوگا ورنہ مجھے اس وقت کی حالت سے سخت اندیشہ ہے۔

## اہل مدارس اور خدامان دین کی مدد غیب سے

### ہوگی اس لئے وہ مانگنا چھوڑ دیں

غرض یہ معلوم ہو گیا کہ خادمانِ دین کی خدمت اور ان کی مدد خود غیب سے ہوگی، اب جس کا جی چاہے اپنے نفع کے لیے ان سعادت کو حاصل کرے ان کو کسی خاص شخص یا خاص جماعت کی کوئی ضرورت نہیں، ان کی وہ حالت ہے کہ۔

گرنستانی بستم میر سد

اور میں اہل انجمن اور اہل مدارس کو بھی یہی رائے دیتا ہوں کہ وہ مانگنا بالکل چھوڑ دیں، انشاءاللہ جس دن یہ ایسا کریں گے خدا تعالیٰ ان کو بہت کچھ دیں گے ارشاد ہے۔ وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ۔

تو ایک خاص جماعت تو ایسی ہونی چاہئے، مگر ہر شخص چونکہ خادم دل نہیں ہو سکتا اس لیے اکثر کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ کمائیں اور دوسروں کی مدد کریں۔

اس حالت سے کوئی اہل اللہ کو طفیل خوار نہیں کہہ سکتا، کیونکہ وہ سرکاری لوگ ہیں، دیکھئے گورنر جنرل کو کثیر التعداد رقم ہر مہینے ملتی ہے، حالانکہ بظاہر اس کو کوئی ایسا بڑا کام نہیں کرنا پڑتا، لیکن محض اس لیے کہ اس کا کام دماغی کام ہے، تو حضرات اہل اللہ پر جو گزرتی ہے اور جو دماغ سوزی ان کو کرنی پڑتی ہے، اگر آپ پر وہ گزرے تو چند روز میں جنون ہو جائے، اور یہیں سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی ہوگی کہ اہل اللہ پر اپاہج ہونے کا الزام بھی بالکل غلط ہے، وہ ہرگز اپاہج نہیں ہوتے، ہاں وہ بدن کے اعتبار سے اپاہج ہیں، سو یہ فخر ہے، ان کی یہ شان ارشاد خداوندی میں مذکور ہے۔

أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ۔

(سورۃ البقرہ)

تو یہ عدم استطاعت مایۂ فخر ہے، نیز یہ خود کہتے ہیں کہ ؎

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم

مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

یہ اگر طفیلی ہیں اوران کا جسم گو معطل ہے لیکن ان کی روح ایک بہت بڑے کام میں ہے، ان کی روح نے اُس بارگراں کو اٹھایا ہے جس کے اٹھانے کی پہاڑ بھی تاب نہیں لاسکتا، اور زمین وآسمان سے بھی نہیں اٹھ سکا، چنانچہ ارشاد ہے۔

لَوْ أَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلَىٰ جَبَلٍ لَّرَأَيْتَهُ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ۔ (سورۃ الحشر)

اور دوسری جگہ ارشاد ہے۔

إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَن يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنسَانُ۔ (سورۃ الاحزاب)

توجس رکی روح اتنا بڑا بارگراں اٹھائے ہوئے ہے، وہ اپاہج کیسے کہا جاسکتا ہے، کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے ترا خارے بپانہ شکستہ کے دانی چیست
حالِ شیرانے کہ شمشیر بلابر سر خورند

آپ کو کیا خبر ان پر کیا گزرتا ہے؟ صاحبو! وہ اس مشقت میں ہیں جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔

غور کیجئے کہ! حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر کیا گزرتی ہوگی جو یہ لفظ فرمایا گیا۔

# عوام کو علماء کے تابع رہنا چاہئے نہ کہ علماء کو

## عوام کے تابع یہی منشاء خداوندی ہے

اب لوگ یہ چاہتے ہیں کہ چین وآرام تو ہر طرح کا ہم کو رہے، اور مصیبت اور مشقت دوسروں پر رہے، ہم جس طرح چلیں مولوی ہمارے تابع ہو جائیں، اور ہمارے جادۂ موصل الی السقر سے سرمُو ہم کو نہ ہٹائیں، میں ایسے لوگوں سے کہا کرتا ہوں کہ پرانے مولوی تو تمہارے قابو سے نکل چکے ہیں، وہ تمہارے تابع نہیں ہوں گے، ان سے یہ امید رکھنی تو فضول ہے، البتہ تم اپنی اولاد کو پڑھاؤ وہ تمہارے کہنے میں ہوگی، ان سے اپنی مرضی کے موافق کام لینا، مگر ہم نے آج تک کسی ہمدرد قوم کو نہ دیکھا کہ اس نے قومی ہمدردی میں اپنی اولاد کو پڑھایا ہو، کیونکہ سمجھتے ہیں کہ علم دین پڑھ کر ہماری اولاد کو یہ بڑے بڑے عہدے کہاں سے مل سکیں گے، اور اگر کسی نے اپنی اولاد میں سے کسی کو علم دین کے لیے تجویز بھی کیا ہے تو اس کو جو سب میں احمق اور اور کندن ہے، سبحان اللہ کیا علوم شریعت کی قدر کی ہے، صاحبو غور کیجئے! کہ جب سارے اُلّو ہی پڑھیں گے تو وہ تو اُلّو ہی رہیں گے۔

مولوی منفعت علی صاحب سلمہ سے ایک شخص نے کہا کہ کیا وجہ علماء میں اب رازیؒ غزالیؒ پیدا نہیں ہوتے؟ انہوں نے کہا کہ اس وقت انتخاب کا قاعدہ یہ تھا کہ قوم میں جو سب سے ذہین اور ذکی ہو وہ علوم دین کے لیے منتخب ہوتا تھا، اور اب انتخاب کا یہ قاعدہ ہے کہ جو سب میں احمق اور رغبی ہو وہ اس کے لیے تجویز ہوتا ہے۔

دلیل اس کی یہی ہے کہ اب بھی جو ذہین وذکی پڑھتے ہیں وہ غزالیؒ اور رازیؒ سے کم نہیں ہوتے، میرے ساتھ چلو، اور علماء کی حالت دیکھو، تو معلوم ہوجائے گا کہ اس وقت بھی غزالی اور رازیؒ موجود ہیں، اور ہر زمانے میں پیدا ہوتے ہیں، لیکن عدد میں کم ضرور ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ جو لوگ قابل ہیں وہ تو ادھر متوجہ نہیں ہوتے ورنہ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر ۲۰ر آدمی ایسے پڑھیں تو ان میں ۱۵ر غزالیؒ اور رازیؒ ضرور نکلیں گے، اب بیچارے غریب، غرباء، جولاہے، دُھنئے پڑھتے ہیں، ان کی جیسی سمجھ ہوتی ہے ویسے ہی نکلتے ہیں، اور یہ ہو نہیں سکتا کہ غریب غرباء کے بچے کو نہ پڑھایا جائے، کیونکہ امراء نے خود چھوڑا اور ان سے ہم چھڑادیں تو پھر علم دین کس کو پڑھائیں، نیز غریب غرباء کیا کریں انگریزی تو پڑھ نہیں سکتے، کیونکہ اس کی تعلیم نہایت گراں ہے اور عربی ہم نہ پڑھائیں، تو یہ بیچارے تو بالکل ہی کورے رہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۹/۷ ۳ تا ۴۰۱)

# نیکی کتنی قدر کی چیز ہے

اور اگر کوئی کہے کہ نیکیوں کو کیا کریں تو سمجھو کہ نیکیاں اس وقت تم کو بیکار نظر آتی ہیں، لیکن جب تم دار دنیا سے چل کر دار عقبیٰ میں پہنچو گے تو معلوم ہوگا کہ حسنات کیسا کار آمد سکہ تھا۔

دیکھو! اگر ایک شخص مکہ جارہا ہو اور بمبئی میں پہنچ کر اس کو کسی نے خاص مکہ کا رائج الوقت سکہ دیا تو اگرچہ یہ سکہ بمبئی یا عدن میں نہیں چلتا، لیکن چونکہ وہ جانتا ہے کہ

میں چار دن بعد مکہ پہنچ جاؤں گا، اس لیے یہ نہیں کہتا کہ میں اس کو کیا کروں، اور اگر کہے تو اس کو یہی جواب دیا جاتا ہے کہ آٹھ دن کے بعد دیکھ لینا کہ تم اس کو کیا کرو گے۔

اس وقت حسنات بے کار معلوم ہوتے ہیں لیکن جب قیامت کے میدان میں کھڑے ہو گے اور لوگوں کے اعمال نامے وزن کیے جا رہے ہوں گے اور ان کے موافق جزا مل رہی ہوگی اور تم تہیدست ہو گے اس وقت معلوم ہوگا کہ حسنات کیا چیز تھی فرماتے ہیں ۔

کہ بازار چند انکہ آگندہ تر
تہیدست رادل پراگندہ تر

اگر کسی عمدہ بازار میں کسی مفلس کو بھیج دیا جائے تو اس کو انتہائی پراگندگی حاصل ہوگی ، کیونکہ جدھر نظر پڑے گی اچھی اچھی قیمتی چیزیں نظر آئیں گی ، اور ساتھ ہی ساتھ اپنا افلاس اور تہیدست بھی یاد آئے گی ، اس لیے حسرت بھی بڑھتی جائے گی بالخصوص جب کہ بازار جاتے وقت اس سے کہا گیا ہو کہ کچھ نقد لیتے جاؤ اور وہ چھوڑ کر چلا گیا ہو۔

پس یہی حالت میدان قیامت میں ان لوگوں کی ہوگی اور وہ ایسا وقت ہوگا کہ سوائے اس سکہ کے اور کوئی سکہ کام نہ دے گا، کیونکہ کوئی چیز یہاں سے ساتھ ہی نہ جائے گی چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ ۔(سورۃ الانعام)

کہ تم اکیلے آئے ہو اور جتنی چیزیں ہم نے تم کو دی تھیں سب پس پشت چھوڑ آئے، اور اگر لاتے بھی تو کیا ہوتا، چنانچہ ارشاد ہے کہ اگر تمام زمین کے خزانے بھی اس وقت مل جاتے تو انسان اپنی جان کا فدیہ دیتا، لیکن اس سے قبول نہ ہوتا، تو اب اس کا جواب معلوم ہو گیا کہ نیکیوں کو کیا کریں گے، یعنی اس وقت ان کی قدر ہوگی، وہاں نیکیوں کی یہ حالت ہوگی کہ سب چیزوں سے زیادہ عزیز ہوں گی۔

حتیٰ کہ ایک شخص کے اعمال وزن کیے جائیں گے تو اس کے گناہ اور نیکیاں دونوں برابر ہوں گی، حکم ہوگا کہ اگر ایک نیکی کہیں سے لے آؤ تو تمہاری مغفرت ہو جائے گی، یہ سن کر بہت خوش ہوگا کہ بھائی، بیٹا، باپ، ماں، وغیرہ دوست، احباب، بہت لوگ ہیں کوئی تو ضرور ہی دے گا، چنانچہ یہ سوچ کر سب کے پاس جائے گا، اور سب کے سب انکار کردیں گے، سخت پریشان ہوگا، اور بالکل مایوس ہو جائے گا کہ ایک شخص سے ملاقات ہوگی، اور وہ اس کی حالت کو دیکھ کر پوچھے گا کہ کس فکر میں ہو، یہ کہے گا کہ ایک نیکی کی تلاش میں ہوں، کیونکہ مغفرت میں ایک نیکی کی کمی ہے، لیکن کوئی شخص نہیں دیتا، یہ سن کر وہ کہے گا کہ جب صرف ایک ہی نیکی کی کمی مانع مغفرت ہوگئی تو میرے پاس تو صرف ایک ہی نیکی عمر بھر کی ہے باقی تمام معاصی، وہ ایک نیکی کیا کام آ سکے گی، اچھا لو میں وہ نیکی تم کو دے دیتا ہوں کہ تمہاری مغفرت ہو جائے، چنانچہ یہ شخص نہایت ہی خوش وخرم اس نیکی کو لے کر جائے گا اور اس کی مغفرت ہو جائے گی، اور اس کے ساتھ ہی اس نیکی دینے والے کی بھی مغفرت ہو جائے گی۔

اس مضمون سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ نیکی کتنی قدر کی چیز ہے، اور میدان

قیامت میں اس کی کیا کچھ ضرورت ہوگی، اور یہ کیسی نایاب ہوگی، اس وقت معلوم ہوگا کہ اگر کسی نے قرآن کا ایک ختم دنیا میں کرلیا تھا تو اس سے کیسا کچھ فائدہ اس کو ہوا، کتنی نیکیاں اس کے صحیفۂ اعمال میں لکھی گئیں۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص/ ۴۰۷ تا ۴۰۹)

## حفظ کر لینے سے دوسرے علوم نہایت آسان ہوجاتے ہیں

ان ساری باتوں کے علاوہ قرآن مجید کے الفاظ اس قدر شیری اور باحلاوت ہیں کہ ان کی طرف خود کشش ہونی چاہیے، اگر اس پر ثواب وغیرہ کا وعدہ بھی نہ ہوتا تب بھی اس کو یاد کرنا چاہیے تھا، بعض لوگ کہتے ہیں کہ حفظ کرنے سے دماغ کمزور ہوجاتا ہے، اس لیے ہم اپنے بچوں کو حفظ نہیں کراتے، کیونکہ کمزوری دماغ کے بعد وہ کسی دوسرے کام کے نہیں رہتے، اس کے جواب میں ایک ڈاکٹر کا قول نقل کردینا کافی ہے۔

ایک ڈاکٹر نے مجھ سے کہا ہے کہ دماغ صرف قوت فکریہ سے کمزور ہوتا ہے حفظ الفاظ سے نہیں ہوتا، کیونکہ حفظ دماغ کی اصلی ریاضت نہیں، وہ صرف زبان کی ریاضت ہے اور دماغ کی ریاضت غور وفکر ہے، تو حفظ سے دماغ نہ تھکے گا، اگر تھک سکتی ہے تو زبان، اور زبان تھکتی نہیں، دوسری بات انہوں نے یہ بھی کہی کہ قرآن اس وقت یاد ہوجاتا ہے کہ بچہ اس وقت تک کچھ بھی نہیں کرسکتا، یعنی اس کے دماغ میں کسی

کام کے کرنے اور غور وفکر کی قابلیت ہی نہیں ہوتی، اور اگر زبردستی اس وقت کسی دوسرے کام میں لگادئے جاتے ہیں تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مضرت اٹھاتے ہیں۔

پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اعتدال کی رفتار سے چلے تو قرآن شریف اس وقت حفظ ہوجائے گا جس وقت تک کہ وہ خود بھی بچے کو کسی فکر کے کام میں نہ لگائے، اور اگر فرض بھی کرلیا جائے کہ دماغ کمزور ہوجائے گا، تو میں کہتا ہوں کہ دماغ کس کا ہے؟ صاحبو! کتنی شرم کی بات ہے کہ خدا تعالیٰ کا عطا کیا ہوا دماغ ساری عمر اپنے لیے اس کو صرف کیا جائے اور خدا تعالیٰ کے لیے دو چار سال بھی نہ دیے جائیں، غرض جس پہلو سے بھی دیکھا جائے قرآن کا یاد کرنا نہایت ضروری ثابت ہوتا ہے، اور ایک بڑا فائدہ اس میں یہ ہے کہ اس کے عوض سے دوسرے علوم نہایت درجہ آسان ہوجاتے ہیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کے پاس جب کوئی اپنے بچے کو لاتا، تو دریافت فرماتے کہ اس نے قرآن شریف حفظ کیا ہے یا نہیں؟ اگر وہ حافظ ہوتا تو فرماتے کہ انشاء اللہ یہ پڑھ لے گا، اور اگر حافظ نہ ہوتا تو وعدہ نہیں کرتے تھے، یوں فرماتے تھے کہ میں بھی دعا کروں گا تم بھی دعا کرنا۔

حضرت حکیم الامتؒ فرماتے ہیں واقعی یہ تجربہ بھی ہے کہ جو لوگ حافظ ہیں اکثر ان کو دوسرے علوم بھی نہایت آسانی سے آجاتے ہیں، لیکن اگر حافظ بناؤ تو اس کا خیال رکھو کہ ان کو یاد بھی رہے، کیونکہ اکثر لوگ انگریزی میں اس قدر کھپ جاتے ہیں کہ ماں باپ کی ساری کوشش اور اپنے بچپن کی تمام محنت رائگاں جاتی ہے، اور

ایسے ہی لوگ ہیں جن کی بدولت عقلائے وقت کو یہ مہمل خیال پیدا ہوا کہ قرآن پڑھنا وقت ضائع کرنا ہے، اس لیے اس کے بقائے حفظ کا ضرور خیال رکھو اور کوئی وقت روزانہ اس کی تلاوت کا نکال لو۔

اگر کہو کہ کثرت کام سے وقت نہیں ملتا، تو میں کہتا ہوں کہ اگر تم کو کوئی بیماری لگ جائے، اور ڈاکٹر اس بیماری میں یہ تجویز کرے کہ ایک گھنٹے تک روزانہ صبح کو قرآن پڑھا کرو، تو اس وقت تمہارے پاس کہاں سے وقت نکل آئے گا؟ تو تھوڑی دیر کے لیے دین کو ایسا ہی سمجھ کر اس کے لیے وقت نکال لیا کرو۔

(خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۴۱۳ تا ۴۱۵)

## میرا مقصود سب کو مولوی بنانا نہیں ہے بلکہ

### مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی بھی ہو

### اور سارے لوگ اس سے وابستہ رہیں

مقصود یہ ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسی جماعت بھی رہنا چاہیے اور دوسرے لوگوں کو اس جماعت سے وابستگی رہنا چاہیے، اب تو وحشت بالکل دور ہو جانا چاہیے، کیونکہ سب کو مولوی نہیں بنایا جاتا، صرف اتنی اصلاح کی جاتی ہے کہ ان لوگوں کو بے کار نہ سمجھو، سو اس سے آپ کے کسی کام میں، یا کسی قسم کی ترقی میں، یا کسی نوکری میں، کوئی فرق نہیں آتا، ہاں، ایک غلط خیال میں جو آپ مبتلا ہیں اس سے وہ غلطی جاتی رہے گی، نیز اس جماعت کے فیوض سے اس وقت جو آپ محروم

ہیں جب آپ کو ان کے ساتھ وابستگی ہوگی تو آپ ان کے فیوض سے متمتع ہوں گے، البتہ موجودہ حالت میں اور اس حالت میں ایک فرق ضرور ہوگا، خواہ اس کو آپ دنیاوی ضرورت یا ترقی کی کمی سمجھ لیں تو ممکن ہے اور وہ فرق یہ ہے کہ اس وقت آپ تعزیرات الٰہیہ کہ بہت سے جرائم میں مبتلا ہیں وہ اس وقت چھوٹ جائیں گے، اس کو آپ نفع سمجھیں یا نقصان، آپ کے عادات میں بھی تغیر وتبدل ہوگا لیکن نہایت لطف اور تدریجی نرمی کے ساتھ۔

اس کی تائید یہ ہے کہ آپ دیکھیں عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی کسی جرم کا مرتکب ہو تو اس کو فوراً چھوڑ دینا چاہیے، لیکن قواعد شریعت بعض معاشی کی نسبت جو کہ جرائم ہیں یہ تجویز کرتے ہیں کہ چھوڑنے میں جلدی نہ کرو، پہلے کوئی اس کا بدل تجویز کرلو، اور اس زمانہ تک اپنے کو گنہگار سمجھ کر استغفار کرتے رہو، پھر جب دوسرا انتظام ہو جائے تو اس کو چھوڑ دینا، بھلا دنیا کا کوئی قانون بھی ایسا ہے جس میں یہ سہولت ہو واللہ العظیم شریعت میں وہ حسن وجمال ہے، وہ لطف ہے کہ اس کی نسبت بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلتا ہے۔

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

مگر افسوس کہ لوگوں نے کبھی شریعت کو تحقیق کی نظر سے نہیں دیکھا، اس لیے وہ لوگوں کو ایک خونخوار دیو نظر آتا ہے، صاحبو! شریعت آپ کی دستگیری کرنے والی ہے، بعض جرائم تک میں مثلاً ناجائز نوکری میں یہ اجازت ہے کہ اگر اس وقت کوئی

دوسرا انتظام نہیں ہوسکتا اور کوئی سبیل نہیں نکل سکتی تو پہلے اس کا انتظام کر لینا پھر چھوڑ دینا، اور اگر اس اس پر بھی شریعت سے وحشت ہوتی ہے تو ہم ذمہ دار نہیں ہیں۔

غرض علم واہل علم کے ساتھ تلبس رکھنے سے کوئی دنیاوی ضرورت ومصلحت فوت نہیں ہوتی، صرف جرائم کا انسداد ہوگا، اور وہ بھی اس لطف کے ساتھ سو اس کی نسبت میرا یہ کہنا کہ اس جماعت کے ساتھ وابستگی کرنے سے اتنا نقصان ہوگا کہ یہ جرائم چھوٹ جائیں گے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۴۲۲ تا ۴۲۳)

## آگے آخرت ہوگی وہاں کون سے گارڈ مزاحمت سے بچائیں گے

صاحبو! خدا تعالیٰ نے عقل اس واسطے دی ہے کہ اس سے انجام کو سوچیں اور جیسا یہ انجام سوچنے کے قابل ہے کہ ہم آج پڑھ لیں گے تو کل ڈپٹی کلکٹری ملے گی، ایسا ہی اس آگے کا انجام بھی تو سوچنے کے قابل ہے کہ آخرت میں کیا ہوگا؟ اور اگر کہو کہ آگے کوئی انجام نہیں تب تو پھر تم سے خطاب ہی نہیں، لیکن چونکہ تم اگلے انجام کے بھی قائل ہو اس لیے پوچھا جاتا ہے کہ وہاں کیا ذخیرہ کی ضرورت نہ ہوگی؟ اور اگر ہوگی تو پھر قرآن کی تعلیم کی توضیح اوقات کس منہ سے کہا جاتا ہے، افسوس کہ دنیا میں رہنا محض موہوم اور اس کے لیے یہ کوشش اور آخرت میں جانا یقینی، اور اس کے لیے سامان کی ضرورت نہ ہو، اور اس کے سامان کو اضاعت وقت کہا جائے اصل یہ ہے کہ خود آخرت ہی سے اس درجہ غفلت ہوگئی ہے کہ وہ یاد ہی نہیں آتی۔

ایک مرتبہ میں سہارنپور سے کانپور کو جاتا تھا میرے ساتھ کچھ پونڈے (گنّے) بھی تھے، میں نے وزن کرانا چاہا جولوگ رخصت کرنے آئے تھے انہوں نے تو رائے کی مخالفت کی ہی، مگر خود اسٹیشن والوں نے بھی کہا کہ آپ لے جائیں، ہم گارڈ سے کہہ دیں گے کوئی مزاحمت نہ کرے گا، میں نے پوچھا یہ گارڈ کہاں تک جائے گا، جواب ملا کہ غازی آباد تک، میں نے کہا آگے کیا ہوگا، جواب ملا کہ آگے وہ گارڈ دوسرے گارڈ سے کہہ دے گا، میں نے کہا آگے کیا ہوگا، جواب ملا پھر وہ کانپور تک برابر رہے گا اور کانپور آجائے گا، میں نے کہا آگے کیا ہوگا، جواب ملا بس آگے تو کانپور آجائے گا اور سفر ختم ہو جائے گا، میں نے کہا کہ نہیں اس سے آگے آخرت ہوگی وہاں کون سے گارڈ مزاحمت سے بچائیں گے، سب چپ ہو گئے، اور محصول لیا گیا غرض آخرت ان اہل الرائے کو یاد نہ آئی۔

یہاں سے ایک جملہ معترضہ بھی قابل ذکر ہے وہ یہ کہ اس حصہ میں جو باوجود اہل اختیار کی رعایت کے اس رعایت کو قبول نہیں کیا گیا اس کا سبب بجز اثر تعلیم شریعت کے کیا ہے، کیا آج کل کوئی مہذب ایسا کرسکتا ہے کہ اگر صاحب حق کو حق کی اطلاع بھی نہ ہو تب بھی دوسرے کا حق ادا کرے، لیکن شریعت اس کو ضروری بتلاتی ہے، اب شریعت اور اپنی تہذیب مخترع کا مقابلہ کر کے دیکھ لیجئے واللہ، ہم نے دیکھا ہے کہ غریب دین دار لوگ جن کو کم عقل سمجھا جاتا ہے وہ تو ان باتوں کا خیال رکھتے ہیں مگر ہمارے معزز جو عقلاء کہلاتے ہیں ذرا بھی خیال نہیں کرتے، صاحبو! عاقل وہی ہے جو انجام پر بھی نظر کرے، پس جس میں دین نہیں وہ عاقل کیا

ہوسکتا ہے؟ آج کل عقل اور دین میں منافات سمجھی جاتی ہے، حالانکہ ہمارے تمام بزرگ دنیا کی عقل کے ساتھ دین میں بھی ہمیشہ کامل ہوئے ہیں۔

ہرقل نے حضرت عمرؓ کی نسبت سفیر اسلام سے پوچھا تھا کہ وہ کیسے شخص ہیں؟ اس نے جواب دیا تھا کہ ان کی حالت یہ ہے، لَا یَخْدَعُ وَلَا یُخْدَعُ، یعنی نہ کسی کو دھوکہ دیتے ہیں نہ ان کو کوئی دھوکہ دے سکتا ہے، ہرقل نے کہا کہ اگر وہ ایسے ہیں تو ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا، کیونکہ جس میں دین اور عقل دونوں جمع ہوں اس کی قوت کا مقابلہ ممکن نہیں ہوتا۔

یہ جملہ معترضہ ختم ہوا، بیان اس کو کررہا تھا کہ آخرت سے بے خبری بے حد ہو گئی ہے اور اس بے خبری کی یہاں تک نوبت پہنچی ہے کہ جو باخبر ہو کر اس کی فکر کرتے ہیں ان کو احمق سمجھا جاتا ہے۔

میرے ایک دوست جو بی، اے، تک تعلیم پائے ہوئے ہیں، مگر دین دار ہیں، اپنا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ ایک بار بوجہ تنگی وقت بدون اسباب وزن کرائے ہوئے ریل میں سوار ہو گئے، منزل مقصود پر پہنچ کر ٹکٹ کلکٹر سے اس کی اطلاع کی اور وزن کرا کر محصول دینا چاہا، ٹکٹ کلکٹر نے کہا کہ لے بھی جاؤ، انہوں نے کہا کہ آپ کو رعایت کا حق نہیں، آپ مالک نہیں، اس کو تعجب ہوا، اور اسٹیشن ماسٹر کے پاس لے گیا انہوں نے وہاں بھی یہی تقریر کی، تو وہ دونوں باہم انگریزی میں یوں کہنے لگے کہ معلوم ہوتا ہے اس شخص نے شراب پی رکھی ہے، گویا دوسرے کا حق دینا ایسا عجب امر ہے کہ حق دینے والے پر نشہ پینے کا شبہ ہوا، لیکن ہاں واقع میں وہ شراب محبت میں مدہوش تھے اور اسی کا نشہ ان کو چور کیے ہوئے تھا۔

آخر انہوں نے کہا کہ جناب میں شراب پئے ہوئے نہیں ہوں، لیکن اسٹیشن والوں نے ہرگز محصول نہ لیا، مجبور ہو کر دوسرے طریقہ سے انہوں نے ادا کیا، اور وہ طریق یہ ہے کہ اگر کسی ریلوے کا ہمارے ذمہ کچھ رہ جائے تو اس قیمت کا ٹکٹ اسی لائن کا لے کر تلف کر دیں اور اس ٹکٹ کو استعمال نہ کریں۔

اس وقت مولویوں کے ساتھ جو تمہارا خشک اعتقاد ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے مشہور ہے کہ دو کنجوس تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ تم کھانا کیوں کر کھاتے ہو؟ اس نے کہا کہ بھائی ہر مہینے ایک پیسہ کا گھی لے آتے ہیں اور سامنے رکھ کر اس کو خطاب کرتے ہیں کہ میں تجھ کو کھا جاؤں گا، پورا مہینہ یوں ہی کاٹ دیتے ہیں، پھر آخر میں اس کو کھا لیتے ہیں، وہ بولا تم بڑے فضول خرچ ہو ہم تو روٹی پکا کر جس گلی میں گوشت بھننے کی خوشبو آتی ہے وہاں کھڑے ہو کر خوشبو سونگھتے جاتے ہیں اور روٹی کھا لیتے ہیں۔

تو یہ دونوں بھی گھی کے معتقد تھے اور ایک گونہ تلبس بھی تھا لیکن ان کو اس کا کیا نفع ہوا، ایسے ہی آپ کو نرے اعتقاد سے اور محض ادب و تعظیم سے کیا نفع ہوگا۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۴۲۹ تا ۴۳۴)

سو اول تو یہ غیر مسلم ہے، کیونکہ کھانا کمانا تو ایک محدود حاجت ہے تو اپنی حاجت کے لائق سب ہی کر لیتے ہیں، اور اگر بہت ہی کمایا تو خاص اس کے کام میں تو تھوڑا ہی آئے گا، بلکہ جو اصلی مقصود ہے کھانے کمانے سے کہ جان کو لگے اس میں اکثر غرباء اکثر امراء سے بڑھے ہوئے ہیں۔

میں ایک امیر اور ایک غریب کی حکایت سناتا ہوں کہ وہ دونوں آپس میں دوست تھے، غریب تو بہت موٹا تازہ اور امیر صاحب نہایت دبلے پتلے، ایک روز اس نے اپنے غریب دوست سے پوچھا کہ یار تم کیا چیز کھاتے ہو کہ اس قدر توانا ہو رہے ہو؟ اس نے کہا کہ میں کھانا تم سے لذیذ کھاتا ہوں، امیر بولا بھائی وہ کھانا ہم کو بھی کھلاؤ، اس غریب نے دعوت کردی، وقت پر اس کے مکان پر پہنچے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، آخر جب دیر ہوگئی اور جب بھوک لگی تو بے تکلفی کے سبب کھانے کا تقاضا کیا، اس نے وعدہ کیا ابھی آتا ہے، پھر اور دیر ہوئی اور زیادہ بھوک لگی زیادہ تقاضا کیا اور وہ یوں ہی ٹالتا رہا، آخر جب وہ بہت ہی بے تاب ہوا اور سخت تقاضا کیا تو میزبان نے کہا کہ بھائی کھانا تو ابھی تیار نہیں لیکن دن کی باسی روٹیاں موجود ہیں ، اگر کہو تو لے آؤں، اس نے کہا کہ خدا کے لیے تم باسی ہی لے آؤ، چنانچہ وہ کچھ تھوڑے سے باسی ٹکڑے اور کچھ ساگ وغیرہ لایا ان کی تو بھوک کے مارے بُری حالت تھی بس انہی ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑے، اور نہایت مزے لے لے کر شکم سیر ہو کر کھائے، وہ غریب منع کررہا ہے کہ صاحب زیادہ نہ کھایئے! بہت مزیدار کھانا پک رہا ہے اس نے کہا کہ صاحب اب تو یہی بے حد مزے دار معلوم ہوتا ہے۔

تب اس غریب نے کہا کہ صاحب جو مزے دار کھانا میں ہر روز کھاتا ہوں وہ یہی ہے، مطلب یہ تھا کہ میں اسی وقت کھاتا ہوں جب سخت بھوک لگتی ہے اس لیے جو کچھ کھاتا ہوں جز و بدن ہوتا ہے، اور تم محض ضابطہ پوری کرتے ہو کہ کھانے کا وقت ہوا خادم نے آکر عرض کیا حضور کھانہ تیار ہے، تم نے سنا اور کھانے کے لیے آمادہ ہوگئے، اگرچہ اس وقت تم کو بھوک بھی نہ ہو۔

غرض اگر کسی نے بارہ تیرہ سو کمائے بھی تو کھانا تو اس کا بھی جو کہ مقصود بالذات ہے محدود ہی ہوگا، ہاں کمانا غیر محدود ہوگا، مگر جب کہ کھانے کی غایت محدود ہے تو کمانے کا غیر محدود ہونا اس کو کیا کرآمد ہوا، جب مقصود بالذات ہی کم ہے تو مقصود بالغیر کے زیادہ ہونے سے کیا نفع، سو اول تو اسی مقدمہ میں کلام ہوا کہ مولوی ہو کر کمانا کھا نہ سکیں گے، کیونکہ بقدر ضرورت تو سب ہی کما کھا لیتے ہیں اور اگر تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس کو بھی ثابت کیجئے کہ وہ کمانا جو آپ لوگوں کے ذہن میں ہے یعنی نوکری تجارت وغیرہ آیا وہ ضروری بھی ہے اس کا اندازہ اس طرح ہو جائے گا کہ اپ کسی خادم دین کو بھوکا ننگا دکھلا دیجئے اور خدمت دین کی عام بنے خواہ و تدریس ہو یا وعظ ہو، یا کسی خادم دین کو ذلیل دکھلا دیجیے پھر جب یہ بھوکے ننگے بھی نہیں ذلیل بھی نہیں تو وہ کون سی چیز ہے جو خادمان دین میں کم ہے؟ اگر وہ کوئی چیز ہے تو آپ کی ہوسیں ہیں تو ان کے لیے جواب کافی ہے کہ۔

حرص قانع نیست صائب ورنہ اسباب معاش
آنچہ مادرکار یم اکثرے درکار نیست

(خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۴۳۴ تا ۴۳۸)

مجھے عالمگیرؒ کی ایک حکایت یاد آتی ہے یہ حکایت زبانی ہے کتابی نہیں، کہ ایک روز جامع مسجد میں انہوں نے طالب علموں کو دیکھا کہ سخت پریشان پھرتے ہیں اور خورد نوش کی کوئی سبیل نہیں سمجھے کہ سبب اس کا بے رغبتی امراء کی ہے، چاہا کہ اس کی اصلاح ہو بس وضو کرتے ہوئے وزیر اعظم سے ایک مسئلہ پوچھا کہ اگر نماز

میں فلاں شبہ ہو جائے تو کیا کرے، وزیر صاحب اس کا جواب نہ دے سکے عالمگیرؒ نے ذرا غضبناک نظر سے وزیر کی طرف دیکھا اور کہا تم کو یہ توفیق نہیں ہوتی کہ فقہ کے ضروری مسائل یاد کرو وزیر وغیرہ سب تھرّا گئے اور فوراً ہی طلبہ کی تلاش شروع ہو گئی، اور روزانہ ان سے سیکھتے اور اس طرح سے وہ سب اطمینان کی حالت میں ہو گئے پھر تو یہ حالت تھی کہ طالب علم ڈھونڈے نہ ملتے تھے، حضرت مولانا شیخ محمد صاحب رحمت اللہ علیہ بیان فرماتے ہیں کہ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بارہ ہزار حدیثیں یاد تھیں۔

دیکھیے! جب امراء کو اس جماعت سے دلچسپی ہوئی گو بضرورت سہی تو اس کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ ان سے مستفید ہونے لگے، اگر آپ کو بھی اس سے دلچسپی ہوتی تو کم از کم ہفتہ میں ایک ہی دن کسی عالم سے مسائل پوچھ لیا کرتے اگر خود ان کے پاس نہ جاتے تو ان ہی کو اپنے پاس بلا لیتے کیونکہ آج وہ رئیس کہاں رہے ہیں جو خود طالبانہ حاضر ہوں۔

پہلے یہ حالت تھی کہ ہارون رشید نے امام مالکؒ سے درخواست کی کہ شہزادوں کو حدیث پڑھایا جایا کیجئے! انہوں نے فرمایا کہ آپ ہی کے خاندان سے علم دین کی عزت ہوئی ہے، اور آپ ہی بے عزتی کرتے ہیں، ہارون رشید نے کہا کہ اچھا شہزادے وہاں ہی حاضر ہوں گے مگر اس وقت عام رعایا سے الگ کر دئے جایا کریں۔

آج بھی بعض رئیس جماعت میں نہیں آتے کہ خلط ملط سے لوگ ہمارا رعب نہ کھائیں گے، صاحبو! ذرا سنبھلو، یہ طرز درپردہ حکم شریعت پر اعتراض ہے کہ

ایسا مضر قانون تجویز فرمایا ہے، دوسرا یہ بالکل غلط ہے کہ خلط ملط سے رعب جاتا رہے گا، رعب بھی تو اس وقت بھی ہوگا لیکن النفس کے ساتھ ہوگا اب وحشت کے ساتھ ہے۔

خدا تعالیٰ کے احکام ایسے بے ڈھنگے نہیں ہیں کہ ان کے مضر اثار ہوں دیکھیے خلفائے راشدین کا کس قدر رعب رعایہ پر تھا لیکن اس کے ساتھ ہی دیکھ لیجئے کہ خلفاء کی طرف سے کیا تواضع ہوا کرتی تھی۔

حتیٰ کہ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے برسر منبر فرمایا کہ: اسمعوا واطیعوا تم سنو حکم خلیفہ، اور اطاعت کرو سامعین میں سے ایک شخص نے کہا کہ لا نسمع ولا نطیع ہم نہیں سنتے، اور نہیں اطاعت کرتے ہیں، حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو اس شخص نے کہا کہ غنیمت سے چادر جو آج تقسیم ہوئے ہیں سب کو تو ایک ایک ملا ہے اور آپ کے بدن پر دو ہیں، معلوم ہوتا ہے آپ نے تقسیم میں عدل نہیں کیا، آپ نے فرمایا بھائی تو نے اعتراض میں بہت جلدی کی، بات یہ ہے کہ میرے پاس آج کرتہ نہیں تھا تو میں نے اپنی چادر کو ازار کی جگہ باندھا اور ابن عمرؓ سے ان کی چادر مستعار لے کر ان کو کُرتہ کی جگہ اوڑھا ہے۔

اس واقعہ سے اپ کو یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان حضرات میں بڑے چھوٹے سب برابر حصے کے مستحق سمجھے جاتے تھے، آج بڑوں کا دوہرا حصہ ہونا تو گویا لازمی امر ہے، البتہ اگر مالک ہی دہرا حصہ دے تو کچھ مضائقہ نہیں، غرض تواضع کی تو یہ کیفیت تھی اور باوجود اس نرمی کے رعب کی یہ حالت تھی کہ ایک مرتبہ

آپ بہت سے صحابہؓ کے ساتھ جا رہے تھے اتفاقاً پشت کی طرف جو آپ نے نظر کی تو جس جس پر نظر پڑی سب گھٹنوں کے بل گر پڑے ۔

ہر کہ ترسد از حق وتقویٰ گزید
ترسد از وے جن وانس وہر کہ دید

یعنی جو خدا تعالیٰ سے ڈرے گا اس سے سب ڈریں گے، اور اگر کسی کے رعب میں کمی ہے تو تقویٰ کی کمی کی وجہ سے، ورنہ ضرور ہیبت ہوتی ہے، ہاں وحشت اور نفرت نہیں ہوتی، اور یہ احتساب وعدم اختلاط کے ساتھ جو ہیبت ہوتی ہے وہ ایسی ہے جیسے لوگ بھیڑئے سے ڈرتے ہیں کہ اگر اس مجلس میں بھیڑیا آ جائے تو بھی سب کھڑے ہو جائیں۔

تو جیسے آج کل رؤساء کو خیال ہے ایسا ہی ہارون رشید کو یہ خیال ہوا کہ اگر شہزادے سب سے الگ پڑھیں گے تو ان کا رعب باقی رہے گا، اس لیے امام مالکؒ سے عرض کیا کہ شہزادوں کے ساتھ کسی کو نہ بٹھلایئے، امام صاحبؒ نے فرمایا کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا غرض آخر شہزادے ہی حاضر ہوا کرتے اور حدیث سنا کرتے۔

تو اس وقت تو بادشاہ ایسے تھے کہ ایک عالم نے ٹکا سا جواب دے دیا اور اس کو بادشاہ نے قبول کر لیا، لیکن آج وہ حالت نہیں ہے، اس وقت بھی علماء کو چاہیے کہ اپنے کو ذلیل نہ کرے، لیکن بہت زیادہ اجتناب بھی نہ کریں کہ اس میں اہل دنیا بالکل ہی محروم رہیں گے، یعنی اگر کوئی شخص انتفاع دین کے لیے اہل علم کو قدر کے ساتھ بلائے تو چلا جانا مناسب ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ عالموں کو بلا کر آپ ان سے عربی پڑھیے، اس میں تو آپ کو پھر عذر سمجھیں گے سو میرا یہ مطلب نہیں، کیونکہ بحمد للہ اردو میں میں بھی ایسا کافی ذخیرہ مذہبی ہو گیا ہے کہ آپ کو عربی کی ضرورت نہ پڑے گی، لیکن یہ خوب یاد رکھیے کہ مذہبی کتابوں سے مراد علماء باعمل کی کتابیں ہیں، نیچریوں کی خرافات مراد نہیں، اگرچہ لقب ان کا بھی مولوی ہو۔

مجھ سے ایک نائب تحصیلدار صاحب نے کہا کہ میں مذہبی کتابیں دیکھا کرتا ہوں دریافت جو کیا تو معلوم ہوا کہ آپ نیا چرہ کی کتابیں دیکھتے ہیں، میں نے کہا کہ صاحب اگر آپ قانون گورنمنٹ یاد نہ کریں اور اخبار ہی دیکھا کریں تو کیا آپ کو گورنمنٹ کی عملداری میں رہ کر کام چلا سکتے ہیں، ہرگز نہیں، کیونکہ جو نصاب گورنمنٹ نے تجویز کیا تھا آپ نے اس کو نہیں دیکھا، بلکہ اپنی طرف سے ایک نیا نصاب تجویز کرلیا ہے، تو اسی طرح مذہب میں بھی وہ کتابیں دیکھئے جو مذہبی نصاب میں داخل ہیں۔

اس وقت لوگوں نے نصاب تعلیم بھی اپنی رائے سے تجویز کرلیا ہے، چنانچہ مردوں نے تو یہ نصاب مذکور تجویز کیا یعنی بددینوں کی تالیفات اور عورتوں نے موضوع قصے کہانیوں کی کتابیں تجویز کیں، جیسے معجزہ آل نبیؐ وغیرہ جس کا مہمل ہونا نام ہی سے ظاہر ہے کیونکہ معجزہ آل نبیؐ کا نہیں ہوتا۔

دوسرے اس میں حضرت علیؓ پر یہ الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے حضرت حسنینؓ کو کسی فقیر کو ہبہ کر دیا تھا، اور اس نے کسی اور کے ہاتھ بیچ دیا تھا، اور ایسے

قصے پڑھنے والے تو جاہل ہی ہیں، ان جاہلوں سے بڑھ کر بعض مولویوں نے یہ غضب کیا ہے کہ نفع تجارت کے لیے وہ قصہ چھاپا اور چونکہ موضوع کی اشاعت ناجائز ہے، اپنے کو بری کرنے کے لیے آخر میں یہ لکھ دیا کہ یہ قصہ موضوع طبع ہوا ،اول تو آپ کو اس کی اشاعت کی کون سی دینی ضرورت تھی، پھر یہ کہ عوام تو موضوع کے معنیٰ بھی نہیں سمجھتے، اگر لکھنا تھا تو یہ لکھتے کہ یہ قصہ بالکل لغو اور جھوٹ ہے اس کا پڑھنا جائز نہیں ،لیکن اگر ایسا لکھتے تو وہ بکتا کہاں، خدا بچائے ایسے دین فروشوں سے اسی لیے کہا ہے ۔

بد گہر را علم و فن آموختن
دادن تیغست دست راہزن

## صحبت نیک ہر شخص کیلئے ضروری ہے کیوں

### کہ اسی سے زندگی میں تاثیر آئیگی

اب اگر کہو کہ پھر اس صورت میں تو انتخاب بہت مشکل ہوا تو واقعی تم کو انتخاب مشکل ہے م،مگر کسی عالم سے انتخاب کرائیے تو یہ تو نصاب تعلیم میں گفتگو تھی مگر اس کے ساتھ ہی یہ اس سے زیادہ ضروری ہے کہ ابتداء ہی سے اپنی اولاد کو کسی بزرگ کی صحبت میں وقتاً فوقتاً رکھئے اور خود بھی رہئے اس کی صحبت میں خدا تعالیٰ نے اصلاح کا ایک اثر رکھا ہے اسی کو فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مردے کاملے پامال شو

صحبت نیکاں اگر یک ساعتست
بہتراز صدسالہ زہد وطاعتست
ہرکہ خواہد ہم نشینی باخُدا
گو نشیند درحضور اولیاء

مگر صحبت کا ہم لوگوں میں بالکل ہی اہتمام نہیں، میں نے ایک موقع پر اس کو ایک مستقل تقریر میں بیان کیا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ جہاں اور تمام ضروریات اپنی اولاد کے لیے تجویز کی جاتی ہیں چندروز کے لیے اس کا بھی انتظام کر لیجئے کہ اس کو کسی بزرگ کے سپرد کر دیجئے، اور کم سے کم ایک سال تک ان کے پاس ضرور رکھیے، اگر کہیے کہ اس میں تو ان کی دنیوی تعلیم کا بڑا نقصان ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ اس کی یہ صورت کیجئے کہ ہر چھٹی میں چندروز رکھا کیجیے، اس طرح چند مرتبہ میں یہ مدت پوری ہو جائے گی، غرض صحبت کا بھی اہتمام ہو، اور محقق علماء کی کے تجویز کردہ نصاب کی تعلیم ہو، اس طرح دین کی درستی ہوگی، ہوسکتی ہے اگر فرصت کم ہوتو اردو سہی ورنہ وقت ملے تو عربی سے بھی نہ چوکئے کہ تبحر وتحقیق کا یہی طریقہ ہے۔(خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۴۴۲ تا ۴۴۷)

## اتحاد واتفاق آپسی تواضع میں ہے نہ کہ تکبر میں

اب اعمال کا دخل لیجئے، یہ بھی انشاءاللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا، سب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے، اس کے نہ

ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے، کیونکہ فساد کا منبع ہے نااتفاقی ہے اور نااتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے، کیونکہ اگر تکبر نہ ہو، اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نااتفاقی کی کوئی وجہ نہیں، تو اتفاق کے لیے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے، اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے، نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت نہ سکھلائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہو جاتی ہے، اور نماز میں اول ہی سے اللہ اکبر کی تعلیم ہے، تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا، اور جوارح سے رکوع اور سجدہ کرے گا، زمین پر پیشانی رکھے گا، وہ کیوں کر اپنے کو بڑا سمجھے گا۔

اگر کہو اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھے گا، لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں، جواب یہ ہے کہ یہ نہ تجربہ کاری کا اعتراض ہے دیکھو! اگر تحصیلدار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لفٹنٹ گورنر آجائے تو خود ان کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب سے ہونے لگتے ہیں، اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گولی ماردی۔

تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی مغلوب اور ناتواں سمجھے گا، کیونکہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی، تو اللہ اکبر کی تعلیم وہ ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور اس سے نااتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے۔

علیٰ ہذا اسے قوت بہیمیہ سے سینکڑوں فساد لڑائی جھگڑے دنیا میں ہوتے ہیں اور روزے سے قوت بہیمیہ ٹوٹتی ہے۔

اسی طرح زکوٰۃ کہ اس سے لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے، دیکھو حاتم طائی سے بوجہ سخا کے سب کو محبت ہے، اور اتفاق کا منبع یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے۔

حج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں، ایک زمانہ میں، ایک مکان میں، جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں، جس کو اتفاق واتحاد میں بہت دخل ہے، جیسا اوپر مذکور ہو اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجمع میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی بہت سی واردات ہو جاتی ہیں، اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں۔

غرض حج کو اتفاق دامن میں بہت بڑا دخل ہے، جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال حج از سرتا پا تواضع سے پُر ہے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۴۵۵ تا ۴۵۸)

## طلبہ اپنی اصلاح ایسے کریں!

لا تقوم الساعة حتى لا يقال في الأرض: الله، الله۔

جب تک کوئی بھی اللہ اللہ کہنے والا موجود ہے قیامت نہ آئے گی۔

اب میں نہایت ادب سے تھوڑا سا خطاب طالبعلموں کو کرتا ہوں کہ آپ کی ضرورت محض علم وعمل کی وجہ سے ہوئی، ورنہ آپ کوئی چیز نہیں، اور یاد رکھو! جتنا لطیف کھانا ہوتا ہے اس میں زیادہ اور جلدی بدبو ہو جاتی ہے، پس جس طرح آپ بحالت درستی نافع الوجود ہیں اسی طرح نادرستی میں مضر اور سبب فساد بھی ہوں گے۔

آپ کو بھی اپنی اصلاح کرنا ضروری ہے اور آپ کی اصلاح کے دو طریق ہیں، ایک تو یہ کہ زمانہ تحصیل میں استاد دیندار ڈھونڈئے بد دین استاد ہرگز ہرگز اختیار نہ کرو، یہی طالب علمی اور مختصر وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام اطاعت ہے اور کفر بغاوت ہے،تو دنیوی سلطنتوں کا تو یہ قاعدہ ہے کہ اگر کسی شہر میں باغی زیادہ ہوں تو شہر پر توپ خانہ لگا دیا جاتا ہے، خدا تعالیٰ بھی اگر یہی کرتے تو اکثر اوقات توپ لگے ہوتے، مگر یہ خدا تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس نے یہ قانون مقرر کیا کہ اگر کُل باغی ہوں مگر صرف ایک غیر باغی ہو، تو اس کی بدولت تمام عالم محفوظ رہے گا، ہاں جب بغاوت عام ہو جائے اس وقت پھر ہلاک عام بھی ہوگا۔

تو امن ام کے لیے علم دین کی ضرورت وقت ہے، تخم پاشی کا پھر اس کے بعد کچھ دنوں پڑھ کر کسی اہل اللہ کی چند صحبت اختیار کر، وتب البتہ تم خادم دین بن سکو گے، پھر لوگ تمہارے قدم دھوئیں گے۔

## طالب علموں میں عیب مت نکالو یہ غلط ہے!

پھر پہلی جماعت غیر اہل علم سے خطاب کرتا ہوں کہ اگر کوئی صاحب علم ایسا نہ ہو تو اس کو چھوڑ و، اور اس کو نہ دیکھو، وہ سرکاری آدمی نہیں، مگر یہ یاد رہے کہ وہ کام کا آدمی بھی ان ہی ناکاروں میں ملا جلا ہوا ہے، اور اس کی تلاش کے لیے البتہ ان سب کی بھی خدمت کروان ہی میں وہ مل جائے گا۔

مُراعات صد کن برائے یکے

شیخ نے حضرت ابراہیمؑ کی حکایت لکھی ہے کہ وہ بغیر مہمان کے کھانا نہ کھاتے

تھے، ایک دن مجوس مہمان ہوا جس نے کھانے پر بسم اللہ نہ کہی، آپ نے ناراض ہو کر اٹھا دیا فوراً وحی سے ارشاد ہوا کہ ؎

گراومی بُرد پلیش آتش سجود
تو واپس چرا میکشی دست جُود
خورش دہ بکنجشک و کبک وحمام
کہ شاید ہمائے دراختند بدام
چو ہر گوشہ تیر نیاز افگنی
بنا گاہ بینی کہ صید ے کنی

جب شکاری شکار ہما کرتا ہے تو چیل اور کوؤں کو نہیں اڑاتا، انہی کے ساتھ ہما بھی پھنس جاتا ہے۔

اسی طرح اگر ہم انتخاب کر کے تعلیم دین اور ان میں عیب نکالیں گے جیسا کہ آج کل لوگ طالب علموں میں عیب نکالتے ہیں تو بخدا بہت سے اچھے اچھے بھی دولت علم سے محروم رہ جائیں گے، کیونکہ بہت لوگوں کو دیکھا ہے کہ اول اول جن میں قابلیت نظر نہیں آتی مگر بعد میں ان کے جوہر کھلتے ہیں، بس ان سب کی خدمت کرو انہیں میں سے لعل و جواہر بھی نکل آئیں گے۔

ایک بادشاہ زادے کا لعل شب کو جنگل میں گر پڑا تھا تو حکم دیا کہ سب کنکڑوں کو جمع کرلو، روشنی میں چھانٹ لیں گے، انہی کنکڑوں میں سے وہ لعل پا گیا۔

تو آپ اپنے انتخاب سے ہمیں معاف کیجئے، اور آپ ان پر اعتراض نہ

کیجئے، البتہ اگر تم طالب علموں کے ساتھ اولاد کا سا برتاؤ کرو اور اپنی اولاد سمجھو اور پھر شفقت وخیر خواہی سے ان کی بے عنوانی پر ان کو تنبیہ بھی کرو پھر دیکھو وہ بھی سمجھیں گے کہ ۔

آں را کہ بجائے تسئت ہر دم کرمے
ذرش ہنہ ارکند بعمر سے ستمے

یہ عدم انتخاب اس طالب علم کے اعتبار سے ہے جس کا صرف غیر نافع ہونا محتمل ہو باقی جس کا مضر دین ہونا معلوم ہوجائے اس کو متبوع ہونے کے درجے تک ہرگز نہ پڑھائیں البتہ اپنے عمل کے لائق اس کو بھی تعلیم دینا فرض ہے۔

## اہل علم اور دین کو صرف چندہ دینا کافی نہیں

### ان سے وابستگی بھی ضروری ہے

غرض اولاد کو جس درجے کی تنبیہ کرتے ہو اس کی اجازت ہے اور اس سے زائد اجازت نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ بہت بڑی ضرورت دنیا میں اہل علم اور دین کی ہے ان کے ساتھ وابستہ ہوجاؤ، مگر وابستگی کے یہ معنی نہیں کہ چندے میں روپیہ دے کر بے فکر ہو جاؤ، روپیہ تو خدا دے گا بلکہ ان سے کھل کر ملو، اور ان سے مسئلے پوچھتے رہو تا کہ تم کو دین اور اہل دین کی محبت بڑھے اور تمہارے لیے یہ وعدہ صادقہ پورا ہوجائے کہ آدمی قیامت میں اس کے ساتھ ہوگا جسے دنیا میں دوست رکھتا ہے اور اگر تم کو ان کی

محبت ہوگئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خدا تعالیٰ سے بھی تم کو محبت صادقہ ہوجائے گی، اور بعض لوگ خود تو علماء کی طرف متوجہ ہوتے نہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ علماء ہماری خبر نہیں لیتے، تو صاحبو! مریض طبیب کے پاس جایا کرتا ہے طبیب مریض کے پاس ازخود نہیں جایا کرتا، کیا وجہ ہے کہ سول سرجن کی شکایت نہیں کی جاتی کہ ہماری خبر نہیں لیتا، صاحبو! سول سرجن کی شکایت تو ناجائز اور علماء کی شکایت جائز۔

صاحبو! علماء کو اپنی خبر کب دی اگر تم دو دفعہ جا کر ان کو اپنے مرض کی خبر دو گے تو وہ ایسے شفیق ہیں کہ چار دفعہ خود آئیں گے اب تو مولوی اس لیے بھی بچتے ہیں کہ ان کا ازخود متوجہ ہونا خود غرضی پر محمول ہوگا مشہور مقولہ ہے۔

نعم الامیر علی باب الفقیر وبئس الفقیر علی باب الامیر۔

وہ امیر اچھا شخص ہے جو فقیر کے دروازے پر حاضر ہوا، اور وہ فقیر بُرا ہے جو امیر کے دروازے پر جائے۔

تو یہ معنی ہے وابستگی کے اور جب آپ وابستہ ہوں گے تو وہ بھی آپ سے زیادہ متوجہ ہوں گے اس سے ملاپ پیدا ہوگا، مگر ابتداء میں اس کی اہل دنیا کی طرف سے ہونا چاہیے اور اس کی وابستگی کے ساتھ اپنے بچوں کو بھی علم دین پڑھائیے، غرض یہ چیزیں ضروری الوجود ہیں ان کی فکر کیجئے۔

(خطباتِ حکیم الامتؒ ص ۴۶۱ تا ۴۶۷)

مثلاً کسی نیک کام کے لیے رقم جمع کیے جائیں اور یہ تجویز لیا جائے کہ اس کے واسطے اتنی رقم جمع ہونی چاہیے، تو اب حلال وہ حرام کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی،

غضب یہ ہے کہ جولوگ اپنی ذات کے واسطے لینے میں احتیاط کرتے ہیں وہ بھی نیک کاموں کے واسطے لینے میں اتنی احتیاط نہیں کرتے، چنانچہ اب کے چندہ بُلقان میں میں نے دیکھا ہے کہ جومحتاط لوگ رنڈیوں اور بھڑووں کا روپیہ کبھی نہ لیتے تھے انہوں نے اس چندہ میں ان کا روپیہ بلا تأمل لے لیا۔

اسی طرح مدرسوں اورانجمنوں کے چندوں میں کوئی بندۂ خدا ہوگا جواحتیاط کرتا ہوگا، ورنہ مشکل ہے، اس میں محتاط لوگ بھی یوں سمجھتے ہیں کہ اپنے لیےتو احتیاط کرنا ممکن ہے، کیونکہ اس میں احتیاط کرنے سے اگر آمدنی کم ہوئی تو اپنی ذات پر تھوڑی سی دقت برداشت کرلیں گے کہ ایک وقت کھایا دوسرے وقت نہ کھایا، لباس عمدہ نہ پہنا، گھٹیا ہی پہن لیا، مگر یہاں مدرسوں اورانجمنوں کے چندہ میں یا ترکوں کے چندہ میں احتیاط کیسے کریں یہاں تو دس ہزار کا پورا ہونا ضروری ہے، اس سے کم میں کام ہی نہیں چل سکتا، اوراتنی بڑی رقم تو اسی طرح پوری ہوسکتی ہے کہ جہاں سے جو ملے لے لیا جائے، پھر نفس یوں سمجھتا ہے کہ یہ تو خدا کا کام ہے ہمارا ذاتی کام تھوڑا ہی ہے، اس میں تھوڑی سی چشم پوشی بھی کرلی جائے تو کچھ حرج نہیں۔

واقعی مولویوں کا نفس بھی مولوی ہوتا ہے، اور درویشوں کا نفس درویش، تو وہ یوں ان کو تاویلیں بتا دیتا ہے، حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے، کیونکہ اپنے نفس کے لیے گناہ کرنے میں مقصود تو کچھ حاصل ہو جاتا ہے تو کم سے کم اپنے پاس روپیہ ہی آتا ہے، اور دین کے کام میں گناہ کرنے سے تو مقصود بھی حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ دین کے کام سے تو رضائے حق ہی مقصود ہے، سو معصیت میں وہ کہاں، اورروپیہ اپنے کو

نہ ملنا تو ظاہر ہی ہے، کیونکہ وہ دوسروں کو پہنچ گیا، بس تم خواہ مخواہ بیچ میں خالی ہاتھ بھی رہے اور گناہ میں بھی مبتلا ہوئے، تو ایسے کام میں تو اور بھی زیادہ احتیاط کرنا چاہیے۔

اب میں کہتا ہوں کہ جب ہم جیسوں کو خدا کے کام میں تحصیل مال کے لیے اتنی وسعت ہو جاتی ہے اور اس میں ہم سے اتنی بے احتیاطیاں ہوتی ہیں جہاں اپنے کو کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا، تو جہاں اپنے نفس کے لیے مال حاصل کرنا مقصود ہو وہاں تو کس قدر بے احتیاطیاں ہوں گی، کیونکہ وہاں تو مال سے اپنے آپ کو بھی نفع حاصل ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ اپنا کام نکالنے کے لیے تو کچھ بھی حلال حرام کی پرواہ نہ ہوگی، بالخصوص جب کہ صرف کام نکالنا ہی مقصود نہ ہو، بلکہ اسے جمع کرنا بھی منظور ہو، اب تو بے احتیاطیوں کا دروازہ بہت ہی وسیع ہوگا، ہاں اگر کسی کو مال جمع کرنے کی پرواہ نہ ہوتو، البتہ وہ احتیاط کرسکتا ہے چنانچہ دینداروں میں تو بفضلہٖ تعالیٰ ایسے بہت ہیں جن کو مال جمع کرنے کی پرواہ نہیں ہوتی، مگر دنیا داروں میں ایسا بہت کم ہے، ان کو تو ہر وقت یہی نیت ہوتی ہے کہ اتنا سرمایہ جمع ہونا چاہیے، اتنی جائیداد ہونی چاہئے، پھر اس کے لیے نہ سود اور شوت سے دریغ ہوتا ہے، نہ قرض لے کر مار لینے سے، نہ قرض لے کر انکار کرنے سے، نہ بہنوں کا حق دبانے سے، نہ کسی کی زمین غضب کر لینے سے، غرض پھر وہ طرح طرح کے گناہ مال جمع کرنے کے لیے کرتے ہیں، اور حلال وہ حرام کی کچھ تمیز نہیں رہتی۔

یہ تو حاصل کرنے کا حال تھا، اب آگے رہ گیا حفاظت کرنا، تو مال کی حفاظت تو پوری پوری جب ہوتی ہے یہ نہ زکوٰۃ دئے نہ صدقۂ فطر دئے، نہ کسی کو اللہ واسطے

کچھ دیے، بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ سائل کے متعلق یہ معلوم ہو گیا کہ واقعی محتاج ہے، لیکن مال اس لیے نہیں دیتے کہ مال کم ہو جائے گا، بعض لوگ زیور میں زکوٰۃ نہیں دیتے، حالانکہ ہمارے امام صاحبؒ کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ واجب ہے، مگر اس میں لوگوں نے دوسرے مجتہدوں کی آڑ پکڑ لی ہے، ان کے نزدیک واجب نہیں، سو خوب سمجھ لو کہ محض حظ نفس کے لیے کسی دوسرے امام کا مذہب اختیار کر لینا یہ دین نہیں، بلکہ اتباع نفس اور تلاعب بالدین ہے، یعنی دین کو کھیل بنانا ہے۔

## ترک تقلید سے ایمان اس طرح چلا جاتا ہے

علامہ شامیؒ نے ایک بزرگ کا قول لکھا ہے کہ ان کے سامنے ایک شخص نے کسی عالم کا واقعہ بیان کیا جو حنفی تھے، کہ انہوں نے ایک محدث کو اس کی لڑکی کے نکاح ہ کا پیام دیا، تو اس نے کہا کہ میں پیام منظور کر سکتا ہوں، مگر تم حنفی اور میں محدثین کے طریقہ پر ہوں، اس طرح نباہ نہیں ہو گا، اگر تم امام ابو حنیفہؒ کی تقلید کو ترک کر کے محدثین کا مذہب اختیار کر لو تو پھر مجھے کچھ عذر نہ ہو گا، چنانچہ اس عالم نے اس شرط کو مان لیا اور نکاح ہو گیا۔

سائل نے اُن بزرگ سے پوچھا کہ اس صورت میں ترک تقلید جائز تھی، فرمایا مجھے اندیشہ ہے کہ مرتے وقت اس شخص کا ایمان نہ سلب ہو جائے، کیونکہ جس مذہب کو یہ اب تک حق سمجھے ہوئے تھا اور حق سمجھ کر ہی اس کی تقلید کرتا تھا اس کو اس نے محض ایک ہوائے نفس کے لیے ترک کر دیا تو اس کا ایمان بچنا بہت مشکل ہے۔

اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْهُ اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْحُوْرِ بَعْدَ الْكُوْرِ وَمِنَ الْعَمِيِّ بَعْدَ الْبَصْرِ وَمِنَ الضَّلَالَةِ بَعْدَ الْهُدٰى اٰمِيْن۔

اسی طرح بعض لوگوں نے محض اپنا مال بچانے کے لیے زیور کے مسئلے میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب لے لیا ہے، اس میں تو شافعی ہو گئے، پھر دوسری جگہ اگر کہیں اڑ گڑے میں پھنسے تو وہاں ابو حنیفہؒ کا قول لے لیتے ہیں، اس وقت حنفی بن جاتے ہیں تو ان کا نفس ایسا ہے جیسے شتر مرغ کہ صورت میں اونٹ کے بھی مشابہ ہے، اور پر دار ہونے کے وجہ سے پرندہ بھی ہے، اب اگر کوئی اونٹ سمجھ کر اس پر بوجھ لادنا چاہے تو اپنے کو پرندہ کہتا اور اس طرح جان بچاتا ہے، اور اگر کوئی پرندہ سمجھ کر یہ کہے کہ ذرا اور پر کو اڑ کر دکھا تو کہتا ہے میں تو اونٹ ہوں بھلا کہیں اونٹ بھی اڑا کرتا ہے، حضرت فریدالدین عطار اسی کو کہتے ہیں ؎

چوں شترمرغے شناس ایں نفس را
نے کشد بار ونہ پرد برہوا
گر بپرگو نیش گوید اُشترم
در نہی بارش بگوید طائرم

تو واقعی نفس کی یہی کیفیت ہے کہ یہ اپنے اوپر بات آنے ہی نہیں دیتا، بس کبھی کچھ بن گیا، کبھی کچھ بن گیا، بعضوں کا نفس تو دنیا کے پردہ میں ایسی چالاکیاں کرتا ہے اور بعض دل کی آڑ میں یہ حرکتیں کرتے ہیں، بس کسی سے سن لیا تھا کہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک زیور میں زکوٰۃ نہیں تو وہ زکوٰۃ سے بچنے کے لیے

شافعی بن گئے، یہ تو دین داروں کا حال ہے، جو خلاف شرع کام کرنے سے اپنے نزدیک بہت بچتے ہیں، اور جہاں اس کی ضرورت نہیں وہاں تو کچھ بھی پرواہ نہیں، ان کی طرف سے چاہے کسی مذہب میں جائز ہو یا ناجائز ہو سب برابر ہے ان کو تو اپنے کام سے کام تو یہ حفاظت مال میں ہمارا برتاؤ ہے۔

اب تیسرا مرتبہ رہا صرف کرنے کا، اس میں انسان سمجھتا ہے کہ ہمارا مال ہے، جہاں ہم اڑائیں مگر یہ اس کی غلطی ہے، انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ حق تعالیٰ کا ہے، جس میں وہ محض امین ہے کہ جہاں خدا تعالیٰ کی اجازت ہو وہیں صرف کرنے کا اختیار ہے، اور جہاں ممانعت ہے وہاں اس کو ہرگز اختیار صرف نہیں ہے۔

## ریاء اور شہرت کیلئے کھانا کھلانا حرام اور اس میں شرکت بھی ناجائز ہے

اب سمجھو کہ بعض جگہ خرچ کرنا گناہ بھی ہے، جیسے ناچ رنگ میں اور تفاخر کی رسموں میں، مگر بہت لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کمانے میں تو احتیاط کی ضرورت ہے لیکن خرچ کرنے میں کیا ضرورت، اس خیال کا منشاء یہی ہے کہ انسان اپنے کو صرف کرنے میں خود مختار سمجھتا ہے، جس کا غلط ہونا بھی معلوم ہو چکا اور اس غلط خیال کے بعد بعض کو تو خرچ کرنے میں یہاں تک وسعت ہے کہ ناچ ورنگ میں بھی صرف کرنے سے باک نہیں کرتے، اور بعض اتنی وسعت تو نہیں کرتے وہ ناچ ورنگ میں مال خرچ کرنے کو برا سمجھتے ہیں لیکن رسوم فخر میں صرف کرنے سے ان کو بھی باک

نہیں، جن سے غرض صرف یہی ہوتی ہے کہ نام ہو، اور افسوس یہ ہے کہ بعض دیندار و مقتداء بھی ان رسوم میں روپیہ صرف کرنے کو بُرا نہیں سمجھتے، اور کہتے ہیں کہ اس میں حرج کیا ہے؟ کھلانا اور پلانا اور برادری کو جمع کر کے دعوت دینا کیوں ناجائز ہو گیا۔

میں کہتا ہوں کہ جناب ذرا اس کی غرض تو دیکھیے! لوگوں کی نیت پر تو نظر کیجئے! کہ اس دعوت اور دھوم دھام میں نیت کیا ہوتی ہے؟ نیت صرف تفاخر اور ریا ہی کی ہوتی ہے کہ ہمارا نام ہو، لوگ کہیں کہ بڑے حوصلہ کا آدمی ہے، اور جب یہ نیت ہے تو بتلایئے کہ یہ افعال کہاں جائز ہیں؟ کیونکہ مباحات کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ فی نفسہ جائز ہیں، لیکن ان کو بُری نیت سے کیا جائے تو ناجائز ہو جاتے ہیں، مگر افسوس اب تو یہ بات بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ نام ونمود کا قصد کرنا کوئی بُرا کام ہے، اس میں بھی گفتگو اور بحث کی جاتی ہے۔

جس کی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کو علم دین کی خبر نہیں، حدیث وقرآن کو پڑھتے نہیں، اور جو پڑھتے ہیں وہ اکثر سمجھتے نہیں، حدیث کو دیکھئے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔

مَن لَبِسَ ثوبَ شُهرةٍ في الدُّنيا، أَلْبَسَهُ اللّٰهُ ثوبَ مَذلَّةٍ يومَ القيامةِ۔

یعنی جو کوئی شہرت اور نام کے لیے کپڑا پہنے گا اللہ تعالیٰ اس کو لباس ذلت پہنائیں گے، حالانکہ کپڑے میں کچھ زیادہ خرچ بھی نہیں ہوتا، مگر شہرت کے لیے اتنا خرچ کرنا بھی جائز نہیں، پھر جہاں اسی غرض کے لیے ہزاروں پر پانی پھر جاوے وہ رسم کیسے جائز ہو سکتی ہے؟

یہ وعید تو نام ونمود کا قصد کرنے والے کے لیے ہے جس سے ان رسموں میں روپیہ برباد کرنے کا عدم جواز ظاہر ہے، اور اسی سے دوسروں کے لیے بھی ان رسموں کی شرکت ناجائز ہونا معلوم ہوسکتا ہے، کیونکہ وہ معین علی المعصیت ہیں، اگر لوگ ایسے رسموں میں شرکت نہ کریں تو کسی کو ان میں روپیہ برباد کرنے کا موقع ہی نہ ملے ، دوسری ایک حدیث میں شرکت کرنے والوں کے لیے بھی صاف ممانعت وارد ہے حدیث میں ہے کہ۔

نھی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ تعالٰی علیہ وسلم عن طعام المتباریین ان یوکل اخرجہ ابوداؤد مرفوعاًقال محی السنۃ والصحیح مرسل والمتباریان المتفاخران بالطعام قال الخطابی وانما کرہ ذالک لمافیہ من الریاءوالمباھاۃ ولانہ داخل فی جھلۃ مانھی عنہ من اکل المال بالباطل اھاکذافی عون المعبود۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے دوشخصوں کا کھانا کھانے سے منع فرمایا ہے جو باہم فخر کے لیے کھانا کھلاتے ہیں، اور ظاہر ہے کہ ممانعت کی علت فخر وریا کے سوا کچھ نہیں، تو ایسی تقریبات کی شرکت اس سے صراحتاً ممنوع ہوگئی جن میں دعوت وغیرہ سے فخر وریا کا قصد ہو۔

## عورتوں کی فرمائش ہی مردوں کوحرام کام پر مجبور کرتی ہے

اب میں خاص عورتوں کو خطاب کرتا ہوں کہ ذرا وہ بھی دیکھ لیں کہ مال حاصل کرنے میں وہ کیا کیا کچھ گناہ کرتی ہیں، اور نہ خود تو کمانے کہ قابل ہیں مگر

کمانے والوں کو گناہوں پر زیادہ تر یہی مبتلا کرتی ہیں، ان کے منہ میں یہ زبان ایسی ہے کہ چمڑوں سے سب کچھ کرالیتی ہے، بس انہوں نے پہلے سے نیت باندھ لی کہ ایک جوڑا ایسا بڑا بھاری اپنے پاس ہونا چاہیے، اب وہ مزدور گھر میں آیا، یعنی شوہر، اور انہوں نے فرمائش کی، اور کہنے کا طریقہ ان کو ایسا آتا ہے کہ مرد کے دل میں بات گھستی چلی جاتی ہے، اب وہ ان کی فرمائش پوری کرنے کے لیے رشوت ستانی اور ظلم سب کچھ کرتا ہے، کیونکہ حلال آمدنی میں اتنی گنجائش کہاں؟ جو عورتوں کی فرمائشیں پوری ہوسکیں، پس ظاہر میں تو عورتوں کے پاس یہ بات کرنے کو ہے کہ ہم تو کمانے کے قابل نہیں ہیں مرد کماتے ہیں، اور کمانے میں جو کچھ گناہ ہوتا ہے وہ مردوں ہی کے ذمہ ہے، مگر اس کی خبر نہیں کہ مردوں کو حرام کمائی پر کون مجبور کرتا ہے، میں سچ کہتا ہوں کہ زیادہ تر عورتوں کی فرمائش ہی مردوں کو حرام آمدنی اور رشوت ستانی وغیرہ پر مجبور کرتی ہیں، بس مردوں کے ان سب گناہوں کا سبب یہی ہیں، اس لیے یہ بھی اس گناہ سے بچ نہیں سکتیں۔

میں مردوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ عورتوں کی فرمائشوں کے زیادہ تر سبب ان کا باہم ملنا جلنا ہے، جب یہ محفلوں میں جمع ہوتی ہیں تو ایک دوسرے کو دیکھ کر حرص کرتی ہے کہ کاش میرے پاس بھی فلاں جیسا زیور اور کپڑا ہو۔

میں نے ایک کورٹ انسپکٹر کو دیکھا ہے کہ ان کی تنخواہ چارسو پانچ سو روپے تھے، مگر ابتدا میں ان کی یہ حالت تھی کہ اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ اپنے غریب عزیزوں پر صرف کرتے تھے، بہت سے محتاجوں کی انہوں نے ماہوار تنخواہیں مقرر کر رکھی

تھیں، اور اپنے اوپر بہت کم خرچ کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کے گھر میں کھانا پکانے والی کوئی ماما بھی نہ تھی، بی بی اپنے ہاتھ سے گھر کا سارا کام کرتی تھی، نہ بیوی کے پاس کچھ زیور تھا، نہ بڑھیا کپڑے تھے، بیچاری اپنے ہاتھ سے آٹا تک پیستی تھی، آخر ان کی بدلی سہارن پور ہوئی، اور ایک سر رشتہ دار کے پاس کرایہ کا مکان لیا، کچھ دنوں تو وہ اسی حال میں رہے جس میں پہلے سے تھے، پھر ایک دن سر رشتہ دار صاحب کے گھر والوں نے فرمائش کی کہ کورٹ انسپکٹر صاحب کی بیوی ہمارے پاس بہت دنوں سے رہتی ہیں ہمارا ان سے ملنے کو جی چاہتا ہے، اول تو انہوں نے اپنی بیوی کے بھیجنے سے انکار کیا مگر اصرار کے بعد بھیجنا پڑا۔

## عورت شیخ کامل ہوتی ہے

اس نے یہاں آکر دیکھا کہ سر رشتہ دار صاحب کی بیوی اور بچیاں سر سے پیر تک سونے کے زیوروں میں لدی ہوئی ہیں، اور گھر میں فرش فروش اور ساتھ سامان بہت کچھ ہے، کھانا پکانے والیاں ایک چھوڑ دو تین نوکر ہیں، اور بی بی صاحبہ کوئی کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتی، بس بیٹھی بیٹھی سب پر حکومت کرتی ہیں۔

اب اس کی آنکھیں کھلیں کہ تنخواہ تو سر رشتہ دار صاحب کی میرے میاں سے کم، اور پھر ان کے ہاں ایسی اجگری (رونق) ہے، اور میرے میاں کی اتنی بڑی تنخواہ اور میرے اوپر نیستی برستی ہے، وہاں سے آتے ہی اس نے کورٹ انسپکٹر صاحب پر برسنا شروع کیا کہ تم مجھ کو بہت تنگ رکھتے ہو، تم سے کم تنخواہ والوں کی

بیبیاں مجھ سے اچھی حالت میں ہیں، اور میں اس مصیبت میں ہوں مجھ سے کھانا نہیں پکایا جاتا، نہ میں آٹا پیسوں گی، پکانے والی نوکر رکھو! اور مجھے بھی زیور اور لباس عمدہ بنا کر دو، جیسا سر رشتہ دار صاحب کی بیوی کا ہے، آخر بیچارے مجبور ہوئے اور سب کچھ کرنا پڑا۔

واقعی شیخ کامل کی صحبت ایسی ہی ہوتی ہے کہ ایک منٹ میں اپنا اثر دکھا دے، تو یہ عورتیں اس بارہ میں شیخ کامل ہے کہ ذراسی دیر میں دوسروں کو اپنا سا بنا لیتی ہیں۔

اس کے بعد وہ مجھ سے الٰہ آباد ملے تھے، کہنے لگے جناب شیخ کامل کی تھوڑی دیر کی صحبت کا وہ اثر ہوا کہ میری سالہا سال کی صحبت کا اثر دم بھر میں زائل ہو گیا، اب نہ وہ خیرات رہی، نہ صدقات رہے، ساری تنخواہ گھر ہی میں خرچ ہو جاتی ہے، اور پھر بھی پورا نہیں ہوتا، بس رات دن زیوروں کی فرمائش ہے، اور کپڑوں برتنوں کا رونا ہے، چنانچہ آج کل مکان بنانے کی فرمائش کے پورا کرنے میں مشغول ہوں، اسی واسطے میں رائے دیتا ہوں کہ عورتوں کو آپس میں ملنے نہ دیا کرو، خربوزہ سے دوسرا خربوزہ رنگ بدلتا ہے۔

نخست موعظت پرصحبت ایں سخن است

کہ از مصاحب ناجنس احتراز کنید

بلکہ پاس رہنے کی بھی ضرورت نہیں، ایک خربوزہ دوسرے خربوزہ کو دیکھ کر ہی رنگ پکڑ لیتا ہے، ان عورتوں کی نگاہ ایسی تیز ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ، کہیں محفل

میں جائیں گی تو ذرا سی دیر میں سب کے سب زیور اور لباس پر فوراً نظر پڑ جائے گی، اگر دس بیس مرد ایک جگہ بیٹھے ہیں تو وہاں سے اٹھ کر ایک دوسرے کا لباس نہیں بتلا سکتے کہ کون کیسا کپڑا اپن رہا تھا، مگر عورتیں پانچ سو بھی ہوں تو ہر ایک کو دوسرے کی پوری حالت گلے اور کان تک کا زیور سب معلوم ہو جاتا ہے، کچھ تو دیکھنے والی کی نگاہ تیز ہوتی ہے، پھر کچھ دوسری بھی دکھلانے کا اہتمام کرتی ہیں، ہاتھ پاؤں کا زیور تو ہر ایک کو خود ہی نظر آ جاتا ہے، اس کے دکھلانے میں تو اہتمام کی ضرورت نہیں، البتہ گلے اور کان کا زیور دوپٹہ کی وجہ سے چھپا ہوتا ہے تو اس کے لیے کبھی کان کھجلانے کے بہانے سے دوپٹہ کو سرکایا جاتا ہے، کبھی گرمی کے بہانے سے گلا کھولا جاتا ہے، تاکہ سب دیکھ لیں کہ اس کے کانوں میں اتنے زیور ہیں اور گلے میں اتنے۔

اب یہ سب کے زیور اور کپڑے دیکھ بھال کر گھر آئیں تو خاوند کو پریشان کرنا شروع کیا کہ ہمیں بھی ایسا ہی بنا کر دو اور غضب یہ کہ اگر وہ زیور جو دوسری کے پاس دیکھا ہے اپنے پاس بھی ہو لیکن دوسرے نمونہ کا ہو تب بھی پریشان کرتی ہے کہ یہ بھدا بنا ہوا ہے، فلانی کا نمونہ اچھا ہے ویسا بنوا دو، اب اگر خاوند ہزار کہے کہ اس میں پہلی گھڑائی کا نقصان ہے اور دوسری گھڑائی خواہ مخواہ ذرا سے نمونہ کے واسطے دینی پڑے گی تو ایک نہیں سنیں گی۔

حالانکہ عقلاء نے زیور کی تجویز اس لیے نکالی ہے کہ یہ نقد کی قید ہے کہ اس سے رقم محفوظ ہو جاتی ہے، یعنی مثلاً اگر ہم کو کسی وقت چار آنہ کی ضرورت ہو تو اس کے لیے روپیہ تو توڑ لیں گے، مگر پانچ سو روپے کی چوڑیوں کو فروخت نہیں کر سکتے، تو

روپیہ اکثر جمع نہیں رہ سکتا، اور زیور سے رقم محفوظ ہو جاتی ہے، یہ ہے اصلی غرض زیور سے، یہی وجہ ہے کہ قصبات میں زیور زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ دیہاتی لوگ بنک وغیرہ میں رکھنا نہیں جانتے اور جب یہ غرض ہے تو اس کا خوبصورت اور بدصورت ہونا کیسا؟ بلکہ اس غرض کے لیے تو اور بھدا بنوا کر پہننا چاہیے تاکہ کسی کی نگاہ اس پر نہ اٹھے، اور کوئی لاگو نہ ہو جاوے، اور اگر بھدا بھی نہ ہو تو خیر پہلی دفعہ خوبصورت بنوالو پھر جیسا بن جاوے اس پر اکتفا کرو، بار بار توڑ پھوڑ میں علاوہ گھڑھائی ضائع ہونے کے خود سونا بھی ضائع ہو جاتا ہے، کیونکہ سنار ہر دفعہ اس میں کچھ نہ کچھ کھوٹ ضرور ملاتا ہے جس سے دو تین دفعہ میں زیور کی مالیت آدھی رہ جاتی ہے، مگر عورتوں کی بلا سے، وہ جانتی ہیں کہ ضرور لا لا کر دے گا جو چاہے فرمائش کرلو۔

پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مجبوراً خاوند کو رشوت لینی پڑتی ہے تو اکثر رشوت لینے کا سبب یہ عورتیں ہی ہوتی ہیں، تو وہ یہ نہ سمجھیں کہ کمانے میں سارا گناہ مرد ہی کو ہوتا ہے، بلکہ یہ بھی اس کے ساتھ عذاب بھگتیں گی۔

اب رہے حفاظت کے متعلق سو ان کی تفصیل یہ ہے کہ اول تو اکثر عورت زکوٰۃ نہیں دیتی، کیونکہ روپیہ خرچ ہوگا، بعض دفعہ زیور کی زکوٰۃ نہ مرد دیتا ہے نہ عورت، مرد کہہ دیتا ہے کہ زیور عورت کا ہے، اور عورت کہہ دیتی ہے کہ زیور مرد کا ہے، میں کیوں زکوٰۃ دوں؟ جس کا مال ہے وہ خود دے، مگر اس بہانہ سے خدا کے یہاں نہیں چھوٹ سکتے، آخر دونوں میں سے کسی کا تو ہے ہی، بس اسی کے ذمہ زکوٰۃ ہے، اور اگر دونوں کا ہے تو ہر ایک اپنے اپنے حصہ کی زکوٰۃ ادا کرے، اور اگر واقعی

نہ اس کا ہے نہ اس کا تو پھر یہ مال خدا کا ہے اس کو وقف کے مصارف میں کسی مسجد یا مدرسہ میں لگا دینا چاہئے، یا غریبوں کو بانٹ دینا چاہئے۔

## بیوی کیلئے یہ جائز نہیں کہ شوہر سے چھپا کر روپیہ رکھے

بعض عورتیں مرد سے چھپا کر روپیہ جوڑا کرتی ہے اس خیال سے کہ شاید مرد پہلے مرجاوے تو یہ رقم بعد میں میرے کام آئے گی، اب اگر اس کو مثلاً چالیس روپے ماہوار دیے گئے تو اس میں سے ۲۰ خرچ کرتی ہیں اور ۲۰ کو اٹھا کر جمع کر رکھتی ہیں، پھر اگر اتفاق سے مرد پہلے مرجاوے تو یہ جمع خالص انہی کے پاس رہتی ہے اس کی کسی کو خبر نہیں کرتی، یاد رکھو یہ ناجائز ہے، اگر کچھ جمع کرنا ہو تو مرد کو اس کی اطلاع کر دو اور اس سے یہ رقم اپنے واسطے مرض موت سے پہلے ہبہ کر لو، اس طرح تو یہ رقم تمہاری مِلک ہو جاوے گی ورنہ اس میں سب وارثوں کا حق ہے، اور تنہا عورت کو اس کا مالک بننا حرام ہے۔

## شوہر کے مال میں بیوی کے عزیزوں کا

### شرعاً کوئی حق نہیں

بعض عورتیں رقمیں جوڑ جوڑ کر خاوند سے چھپا کر اپنے گھر والوں کو بھرا کرتی ہیں، کسی بہانہ سے باپ کو دے دیا، کسی بہانہ سے ماں بہن کو دے دیا، یہ بھی سخت گناہ ہے، مرد کے مال میں عورت کے عزیزوں کا شرعاً کوئی حق نہیں، اگر ان کو دینا ہو تو مرد سے پوچھ کر دینا چاہیے، اور اگر تم پوچھو گی تو مرد ایسے عالی حوصلہ ہوتے ہیں

کہ ضرورت کے موافق دینے سے اکثر انکار نہ کریں گے، خاوند جو مال عورت کو بالکل بطور مِلک کے دے ڈالے اس میں سے بلا اجازت صرف کرنا تو عورتوں کو جائز ہے، اور جو مال اس کو ہبہ نہ کرے بلکہ گھر کے خرچ کے واسطے دے یا جمع کرنے کے لیے دے اس میں سے بلا اجازت صرف کرنا ہرگز جائز نہیں، حتیٰ کہ سائل کو دینا بھی جائز نہیں، ہاں اگر اس نے اجازت دے رکھی ہو کہ تھوڑا بہت سائلوں کو دے دیا کرو تو اس وقت اتنی مقدار کا دینا جائز ہے، جو عرفاً سائلوں کو دی جایا کرتی ہے۔

میں نے دیکھا ہے کہ عورتیں چندہ کے بارے میں بہت سخی ہوتی ہیں، جہاں انہوں نے صدقہ کے فضائل کسی کے وعظ میں سنے اور زیور نکالنا شروع کیا تو یاد رکھو جو زیور خاص تمہاری مِلک ہو اس میں سے دینے کا تو مضائقہ نہیں، مگر جو زیور شوہر نے محض پہننے کے لیے دیا ہو اس کو چندہ میں دینا بدون خاوند کے اجازت کے جائز نہیں، مگر عورتیں اس باب میں بہت سخی ہیں، اور لینے والے بھی اس کی پرواہ نہیں کرتے، بلکہ قصداً عورتوں میں اس لیے وعظ کہتے ہیں تا کہ زیور وصول ہو۔

میں نے اب کی مرتبہ اپ نے یہاں جو مستورات میں چندہ بُلقان کے لیے وعظ کہا تو یہ کہہ دیا تھا کہ عورتوں سے زیور نہ لیں گے، اور اگر کوئی مرد زیور لایا تو اس میں خوب کھود کرید کی کہ یہ زیور تمہاری مِلک ہے یا بیوی کی، اور اگر بیوی کی ہے تو اس کی خوشی سے دیا ہے یا تمہارے کہنے سے، اور اگر اس نے از خود دیا ہے تو تمہاری بھی رائے ہے یا نہیں؟ جب اچھی طرح معلوم ہو جاتا کہ میاں بیوی دونوں کی رضامندی سے دیا جا رہا ہے اس وقت قبول کیا جاتا۔

عورتیں بعض دفعہ خاوند کے مال میں تصرف کرتے ہوئے یہ سمجھتی ہیں کہ وہ اجازت دے دے گا، اور بعض دفعہ وہ خاموش ہو بھی جاتا ہے، مگر بعض مرتبہ خوب خفا ہوتا ہے، اور میاں بیوی میں اچھی طرح تو تو میں میں ہوتی ہے، کانپور میں ایک دفعہ کسی بی بی نے مراد آبادی حقہ ایک مدرسہ کے جلسہ میں عاریۃً دے دیا، خاوند نے بے حد سختی کی غرض جب تک اجازت صراحۃً نہ ہو یا ظن غالب نہ ہو اس وقت تک عورتوں کو چندہ میں کچھ نہ دینا چاہیے، اور یہ تو اس صورت میں تفصیل ہے کہ خاوند کا مال دیا جائے۔

اگر خاص عورت ہی کا مال ہو تو وہ اس میں اجازت خاند کی ضرورت نہیں، مگر اس سے مشورہ کر لینا ضرور چاہیے، نسائی میں ایک حدیث ہے۔ ان رسول الله صلی الله علیه وسلم قال لا یجوز لامراة هبة في مالها اذا ملك زوجها عصمتها الا باذن زوجها۔

یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح کے بعد عورت کو اپنے مال میں سے ہبہ کرنا بدون اجازت زوج کے جائز نہیں، اس میں بعض علماء نے اضافت بادنیٰ ملابست مانی ہے اور مالہا سے مراد مال زوج لیا ہے، لیکن اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کو اس پر محمول کیا جاوے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اگر یہ اپنے مال میں خود مختار ہوں گی تو نا معلوم کہاں کہاں روپیہ برباد کریں گی، اس لیے آپ ناقص العقل طبقہ کو حکم فرماتے ہیں کہ تم اپنے مال میں بھی جو تصرف کرو اس میں اپنے مرد سے مشورہ کر لیا کرو، تو یہ بات جی کو لگتی ہے اور اس میں بڑی مصلحت یہ ہے

کہ اس طرح برتاؤ کرنے میں میاں بیوی میں اتحاد بڑھتا ہے اور مرد کو عورت سے محبت زیادہ ہوتی ہے، کہ اس کو مجھ سے اتنا تعلق ہے کہ اپنے مال میں بھی کوئی کام بغیر میرے مشورہ کے نہیں کرتی ، اور اگر عورت اپنی جمع کو الگ رکھ کر اس میں اپنی رائے سے تصرف کرے تو اس صورت میں ایک قسم کی اجنبیت معلوم ہوتی ہے اس وجہ سے میرے نزدیک حدیث اپنے ظاہر پر محمول ہے اور ما لھا سے مال زوج مراد لینے کی کوئی ضرورت نہیں۔

قلت قال السندي في تعليقه على النسائى وهو عند اكثر العلماء على معنى حسن العشرة واستطابة نفس الزوج واخذ مالك بظاهره في مازاد وعلى الثلث۔

تو جب اس تفسیر کی بنا پر عورت کو اپنے مال میں بھی مرد سے مشورہ لینے کی ضرورت ہے تو شوہر کے مال میں تو کیسے ضرورت نہ ہوگی، البتہ اگر کوئی ایسی معمولی چیز ہو جس میں غالب احتمال اجازت کا ہو تو خیر اور یہ بھی سائلوں کو دینے کے متعلق ہے، جب معمولی چیز دینے کہ متعلق بھی اتنی احتیاط شرط ہے کہ غالب ظن اجازت کا ہو تو بھلا باپ ماں اور بہن بھائی کا گھر بھرنے کی کب اجازت ہوگی ، کیونکہ ان کو تو معمولی چیزیں نہیں دی جاتیں، ان کو ایک روٹی یا روٹی کا ٹکڑا کون دیتا ہے؟ وہاں تو نقد روپے یا کپڑوں کے جوڑے بھیجے جاتے ہیں، جس میں غالب ظن یہ ہے کہ خاوند کو اطلاع ہو تو شاید اسے نا گوار ہو، اور اسی وجہ سے اپنے عزیزوں کو عورتیں خفیہ خفیہ بھرتیں اور خاوند کو ذرا بھی خبر نہیں ہونے دیتیں، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غریب جتنا کچھ کماتا ہے سب دوسروں کو لگ جاتا ہے۔

# اپنے برابر ہی کی لڑکی سے شادی کرو

اسی وجہ سے پہلے تو عقلاء کی یہ رائے تھی کہ غریب کی لڑکی سے شادی کرنا چاہیے، مگر ان واقعات کی وجہ سے اب بہت لوگوں کی رائے یہ ہے کہ غریب کی لڑکی ہرگز نہ لینی چاہیے، کیونکہ وہ اپنے ماں باپ کو غریب دیکھ کر شوہر کا سارا مال لگا دیتی ہے، خیر میں تو یہ رائے نہیں دیتا، لیکن مجھ کو بتلانا یہ ہے کہ عورتوں کی بداحتیاطی کی وجہ سے یہ نوبت پہنچ گئی کہ اب بہت سے عقلاء غریب کی لڑکی لینے کو بُرا سمجھتے ہیں، میری رائے تو یہ ہے کہ آدمی اپنے برابر کی لڑکی سے شادی کرے، کیونکہ اگر اپنے سے زیادہ امیر کی لڑکی سے نکاح کیا تو گو وہ حریص نہ ہوگی، نہ اپنے گھر والوں کو بھرے گی، مگر بد دماغ ہوگی، اور شوہر کی اس کی نگاہ میں کچھ قدر نہ ہوگی، اور غریب کی لڑکی سے کیا تو وہ حریص بھی ہوگی، ہر ایک چیز کو دیکھ کر اس کی رال ٹپکے گی، اور اپنے عزیزوں کو بھی بھرے گی۔

خیر یہ بات تو تجربہ کے متعلق ہے، میرا مطلب یہ ہے کہ عورتیں مال کے صرف کرنے میں ایسی بے احتیاطیاں کرتی ہیں جن کی وجہ سے عقلاء کو یہ سوچ پیدا ہوگئی کہ امیر کی لڑکی لینا چاہیے، یا غریب کی، یا برابر کی۔

## عورت کو مال پر قبضہ نہ دیا جائے ضرورت

### کے مطابق ان کو تھوڑا سا روپیہ دے دیا جائے

اور بڑا گُر عورتوں کو فضول خرچی سے روکنے کا یہ ہے کہ مال اور زیور پر ان کو قبضہ نہ دیا جائے، بس ضرورت کے موافق تھوڑا سا روپیہ ان کو دے دیا جائے، باقی کو مرد اپنے قبضہ میں رکھیں، اسی طرح زیور اتنا دیا جائے جس سے اس کا ناک کان ڈھک جاوے، باقی سب شوہر کو اپنے پاس رکھنا چاہیے، جب کبھی ضرورت پہننے کی ہو دے دیا جائے، اور اس کے بعد پھر واپس لے کر رکھ لیا جائے، اس طرح کرنے سے وہ فضول خرچی نہ کر سکے گی، نہ چرا کر کسی کو دے سکے گی، پھر چاہے غریب کی لڑکی سے شادی کر و یا امیر کی لڑکی سے، کسی سے کچھ خطرہ نہ ہوگا۔

ایک بے جا خرچ جو عورتوں اور مردوں سب کی شرکت سے ہوتا ہے، بیاہ شادی کا خرچ ہے، گو یہ ہوتا ہے سب کی شرکت سے مگر اس میں بھی امام اور مقتدی عورتیں ہی ہیں، مردوں کو کچھ خبر نہیں ہوتی، کہ شادی کے متعلق کیا کیا خرچ ہوتے ہیں، بس عورتوں سے پوچھ پوچھ کر سب کچھ کیا جاتا ہے، اس میں یہی حاکم ہوتی ہے، بھلا کیا مجال جو ان کی منشاء کے خلاف کچھ بھی ہو سکے۔

## شادی میں زیادہ دھوم دھام کرنے سے ناک کٹتی ہے

میں نے کانپوری میں دیکھا ہے کہ ایک صاحب کے یہاں بارات آئی مگر جب تک بی بی نے اجازت نہ دی اس وقت تک بارات کو ٹھہرایا نہیں سکے، مردوں

میں تو ان حضرات کی بڑی ذلت ہوئی، مگر وہ بیوی پھولی نہیں سماتی تھی کہ دیکھا ہماری اجازت کے بغیر بارات بھی نہیں ٹھہر سکی، پھر اس کے بعد شادی میں یہ عورتیں ایسے بے تکے خرچ نکالتی ہیں جن سے مرد کا پڑا ہوجاتا ہے اور اگر کسی وقت کہتا بھی ہے کہ ذرا سنبھل کر دیکھ بھال کر خرچ کرو تو بیوی صاحبہ کہتی ہیں کہ بہت اچھا، میرا کیا حرج ہے میں کفایت شعاری سے کام کرنے لگوں گی، مگر پھر دیکھیے میں نہ جانوں کہیں برادری میں ناک کٹ جائے، بس ناک کٹنے کے خوف سے مرد بھی خاموش ہوجاتے ہیں، اور عورتیں اندھا دھن یہ روپیہ برباد کرتی ہیں، حالانکہ یہ محض ان کا خیال ہی خیال ہے، کہ سادگی کے ساتھ بیاہ کرنے سے ناک کٹتی ہے، ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ سادگی میں کچھ بھی ناک نہیں کٹتی، اور زیادہ دھوم دھام کرنے میں ہمیشہ کٹتی ہے۔

حضرت مولانا مملوک علی صاحب رحمت اللہ علیہ نے اپنی بیوہ لڑکی کی شادی اس طرح کی تھی جیسے کنواری کی کرتے ہیں، یہ وہ زمانہ تھا کہ بیوہ کے نکاح کو ناک کٹی سمجھتے تھے، بعد نکاح کے مولانا نے نائی کو حکم دیا کہ آئینہ تمام برادری کو دکھلا دے سب اپنی اپنی ناکوں کو دیکھ لیں کہ کٹی تو نہیں۔

تو اس رسم بد کی مخالفت سے مولانا کی عزت میں کیا فرق آیا، ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ اس دھوم دھام کو دیکھ کر دوسرے مالداروں کے دل میں حسد پیدا ہوتا ہے کہ یہ تو ہم سے بھی بڑھنے لگا، اب وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح انتظام میں کوئی عیب نکالیں، اگر کچھ بھی انتظام میں کمی رہ گئی تو پھر کیا ٹھکانہ ہے ہر طرف ان کا چرچہ سن لیجئے، کوئی کہتا ہے میاں کیا ہمیں تو حقہ بھی نصیب نہ ہوا، دوسرا کہتا میاں

ہمیں پان کے پتے سے بھی کسی نے نہ پوچھا، تیسرا کہتا میاں بھوکے مر گئے رات کے دو بجے کھانا نصیب ہوا، جب انتظام نہیں ہوسکتا تھا تو اتنے آدمیوں کو بلایا ہی کیوں تھا، غرض اس کمبخت کا تو روپیہ برباد ہوا اور ان کی ناک بھی سیدھی نہ ہوئی بعض دفعہ حسد میں کوئی یہ حرکت کرتا ہے کہ پکتی دیگ میں ایسی چیز ڈال دیتا ہے جس سے کھانا خراب ہوجائے، پھراس کا ہر محفل میں چرچا ہوتا ہے اور اچھی طرح ناک کٹتی ہے اور اگر سارا انتظام عمدگی سے بھی ہوگیا تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی بُرا نہ کہے تو بھلا بھی نہیں کہتا۔

## شادی میں کتنا ہی مال خرچ کرلو نام کچھ نہیں ہوتا

حضرت مولانا گنگوہیؒ نے ایک مہاجن کی حکایت بیان فرمائی تھی کہ اس نے اپنی لڑکی کی شادی میں بہت دھوم دھام کی تھی، اور سارا انتظام بہت اچھا کیا، اور جب بارات رخصت ہونے لگی تو ہر باراتی کو ایک ایک اشرفی دی، اور اپنے دل میں خیال کیا کہ آج سارے بارات والے میری ہی تعریف کرتے جائیں گے، چنانچہ وہ اپنی تعریف سننے کے لیے اس راستے میں جس سے بارات گزرنے والی تھی ایک جھاڑ کی آڑ میں جا بیٹھا۔

تھوڑی دیر میں بہلیاں گزرنا شروع ہوئیں، پہلے ایک گزری، پھر دوسری، پھر تیسری، مگر سب میں سناٹا تھا، کسی نے بھی لالا صاحب کی تعریف میں ایک لفظ نہ کہا، آخر اسی طرح بہت سی بہلیاں خاموشی کے ساتھ نکل گئیں، لالہ جی کو بڑا غصہ آیا کہ یہ لوگ بھی عجب نمک حرام ہیں بلکہ اشرفی حرام کہنا چاہیے کہ میں نے اتنا روپیہ ان پر خرچ کیا اور کسی نے منہ سے ایک لفظ بھی تعریف کا نہ نکالا۔

آخراس نے تھک کر گھر لوٹنے کا ارادہ کیا تو آخر کی بہلیوں میں سے ایک شخص کی آواز آئی جو دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ بھائی لالا جی نے تو بڑی ہمت اور حوصلہ کا کام کیا کہ ہرآدمی کوایک ایک اشرفی دی، لاجی کی ذرا جان میں جان آئی کہ کچھ تو محنت اصول ہوئی، دوسرا بولا سُسر ے نے کیا کیا، اس کے گھر میں تو اشرفیوں کے کوٹھے بھرے ہوئے تھے اگر دو دو بانٹ دیتا تو اس کے یہاں کیا کمی آجاتی، سُسر ے نے بانٹی بھی تو ایک ایک اشرفی، بس لالا جی یہ جواب سن کر اپنا سامنہ لے کر واپس چلے آئے۔

تو صاحبو! کتنا ہی خرچ کیجئے نام کچھ بھی نہیں ہوتا، اول تو حسد کی وجہ سے لوگ الٹا بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور جو یہ بھی نہ ہوا تو یہ ہوتا ہے جو لالا جی کے ساتھ کے ایک ایک اشرفی بانٹی اور سُسر ے ہی کہلائے، اور یہ بھی نہ ہو تو یہ ہوتا ہے کہ جب کہیں تذکرہ ہوتا ہے تو لوگ کہتے ہیں میاں کیا کیا جن کے پاس روپیہ ہوتا ہے وہ کیا ہی کرتے ہیں، تو میں کہتا ہوں کہ جب اس قصہ سے کچھ حاصل نہ ہو وصول تو ان سب کو چھوڑ دینا چاہیے اور یہ حال ہونا چاہیے۔

ترکت اللات والعزی جمیعا

کذلك یفعل الرجل البصیر

عورتوں میں ایک مرض یہ ہے کہ جب یہ شادی بیاہ کے خرچ مردوں کو بتلاتی ہیں اور خاوند پوچھتا ہے کہ اتنا خرچ میں کہاں سے کروں مجھ میں تو اتنی گنجائش نہیں ہے، تو وہ کہتی ہے قرضہ لے لو، شادی کا قرضہ رہا نہیں کرتا، سب ادا ہو جاتا ہے، خدا

جانے یہ انہوں نے کہاں سے سمجھ رکھا ہے کہ شادی اور تعمیر کا قرضہ ادا ہو ہی جاتا ہے، چاہے وہ سودی ہی قرضہ ہو، اور چاہے خرچ بے تکا ہی ہو، صاحبو! ہم نے تو ان قرضوں میں جائیدادیں نیلام ہوتے دیکھی ہیں اور جب یہ نوبت پہنچ گئی تو اب لوگ خود بھی ان کی بُرائی کچھ سمجھ گئے ہیں مگر پھر بھی پوری عقل نہیں آئی ہنوز بہت کچھ رسوم باقی ہیں، یعنی گو آج کل شرک و بدعت کی رسمیں تو کم ہو گئیں ، لیکن تفاخر کی رسمیں بڑھ گئی ہیں، چنانچہ زیور اور لباس میں آج کل پہلے سے زیادہ خرچ کیا جاتا ہے، پہلے تو سب سے بڑھیا کپڑا مشروع کا سمجھا جاتا تھا، اور اب تو اطلس، کمخواب، زری اور ٹسرا اور سرج وغیرہ نامعلوم کتنی قسم کے کپڑے بڑھیا بڑھیا ایجاد ہو گئے ہیں، اسی طرح برتنوں اور فرش وفروش میں قسم قسم کے تکلف پیدا ہو گئے ہیں، پہلے تو یہ حالت تھی کہ اس قسم کی بڑھیا چیزیں کسی ایک دو شخص کے یہاں ہوتی تھیں، شادی بیاہ میں سب لوگ ان سے مانگ کر کام نکال لیا کرتے تھے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۷۷ ۴ تا ۵۰۰)

## حضرت گنگوہیؒ کی صاحبزادی کا عبرت آموز واقعہ

حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی کا جب نکاح ہوا تو ان کے خاوند مولوی ابراہیم صاحب اس وقت ڈپٹی نہ تھے، تنخواہ بھی زیادہ نہ تھی، اس لیے بالائی آمدنی کی بھی کچھ احتیاط نہ تھی، حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی صاحبزادی نے پہلے ہی دن ان سے صاف کہہ دیا کہ میں تمہارے گھر اس وقت تک کھانا نہ کھاؤں گی جب تک بالائی آمدنی سے تم توبہ نہ کرو گے، غرض اُن اللہ کی بندی نے جاتے ہی خاوند سے توبہ کرائی اور عہد لیا کہ آئندہ سے رشوت کبھی نہ لی جائے۔

صاحبزادی صاحبہ کے متعلق ہمارے حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے پیشین گوئی کی تھی کہ یہ لڑکی بہت زاہدہ ہوگی ،حضرت حاجی صاحبؒ ایام غدر میں ایک مرتبہ گنگوہ تشریف لائے تھے،مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ اس وقت موجود نہ تھے،حاجی صاحبؒ نے قیام مولانا کے یہاں فرمایا،اور صاحبزادی صاحبہ کو بلا کر ایک روپیہ دیا، انہوں نے لے کر اُسے حاجی صاحبؒ کے پیروں میں ڈال دیا ،حضرت نے پھر دیا انہوں نے پھر ایسا ہی کیا،کئی دفعہ یہی قصہ ہوا،اور انہوں نے نہیں لیا،توحضرتؒ نے فرمایا کہ یہ لڑکی بہت زاہدہ ہوگی۔

چنانچہ واقعی بہت زاہدہ ہیں،ان کا ایک زہدتو یہی ہے کہ پہلے ہی دن خاوند کو رشوت سے روک دیا،حالانکہ اس وقت عورت کو روپیہ کا لالچ ہوا کرتا ہے،خصوصاً اس کو جسے ماں باپ کے یہاں سے بھی زیور کپڑا امیرانہ نہ دیا گیا ہو،مگر بایں ہمہ ان کو دنیا کی متعلق حرص نہ ہوئی، بلکہ دین کا خیال غالب ہوا۔

اسی طرح کاندھلہ میں ایک بی بی تھیں،ان کے خاوند تحصیلدار تھے،جن کے متعلق آبکاری کا انتظام بھی تھا،ان بی بی نے اپنے خاوند کی آمدنی کو ہاتھ تک نہیں لگایا،نہ اس میں سے زیور بنایا،نہ کپڑا،اور کمال یہ کیا کہ مقام ملازمت پر رہنے کے زمانہ میں غلہ اور نمک اور ہر چیز اپنے میکہ سے منگاتی تھیں،اور شرافت یہ کہ شوہر کو اطلاع تک نہیں کی کہ ان کو رنج نہ ہو۔

ہمارے یہاں ایک کاندھلہ کی بیوی تھی ان کے شوہر کے یہاں کچھ زمین رہن تھی،جس کی آمدنی وہ اپنے صرف میں لاتے تھے،مگر ان کی بیوی نے رہن کی آمدنی میں سے کبھی ایک حبہ بھی نہیں کھایا۔

میں سچ کہتا ہوں کہ بعضی عورتیں مردوں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتی ہیں، اس لیے جو عورت ہے یہ کہتیں ہیں کہ ہم مجبور ہیں، جو خاوند لاتا ہے وہی کھانا پڑتا ہے، یہ محض ان کے لچر بہانے ہیں، اگر یہ زیور اور کپڑوں کی فرمائش نہ کیا کریں تو بہت سے مرد تو خود ہی رشوت سے توبہ کرلیں، اور اگر جو کوئی پھر بھی لے تو عورت ہمت کر کے ان سے کہہ دے کہ ہمارے پاس رشوت کا مال نہ لانا، صرف حلال تنخواہ کا روپیہ لانا، ورنہ آخرت میں ہم تمہارے دامن گیر ہوں گے، دیکھئے پھر مردوں کی کتنی جلدی اصلاح ہوتی ہے۔

## حضرت تھانویؒ کی والدہ کا قصہ

میں نے اپنے خاندان کے بزرگوں سے سنا ہے کہ میری والدہ صاحبہ (مرحومہ نے) سارا زیور اتار کر والد صاحب کے سامنے پھینک دیا تھا، اور یہ فرمایا کہ یا تو اس کی زکوٰۃ دو، ورنہ اس کو اپنے پاس رکھو، میں نہ پہنوں گی، آخر مجبور ہو کر والد صاحب نے سب کی زکوٰۃ دی، جب وہ زیور پہنا گیا۔

## کون زوجۂ صالحہ کہلاتی ہے

ذرا عورتیں اس طرح کر کے تو دیکھیں، انشاءاللہ خود بخود مردوں کی اصلاح ہو جائے گی، کیونکہ جس طرح بعض دفعہ مرد سے عورت کی اصلاح ہوتی ہے اسی طرح عورت سے بھی مرد کی اصلاح ہوتی ہے، اور زوجۂ صالحہ تو وہی ہے جو مرد کو دین میں محتاط بنادے، نہ یہ کہ پہلے سے بھی زیادہ اور بے احتیاط بنادے۔

یہ گفتگو تو مال کے متعلق تھی، اب دوسرا جزو قابل بیان رہ گیا یعنی اولاد کے متعلق اولاد میں بھی تین درجے ہیں اور ان میں بھی ہر درجہ میں ہم سے مختلف گناہ ہوتے ہیں، مختصر طور پر ان کو بھی سن لیجئے۔

سب سے پہلے تو اولاد کے پیدا ہونے میں اکثر لوگوں کی اور خصوصاً عورتوں کی عادت ہے کہ کہیں منتر کراتی ہیں، کہیں گنڈے، اور اس کی بھی پرواہ نہیں کرتیں کہ یہ شریعت کے موافق ہے یا نہیں، اس میں بعض عورتیں یہاں تک بے باک ہیں کہ اگر کوئی ان سے یہ کہہ دے کہ تم فلانی کے بچہ کو مار ڈالو تو تمہارے اولاد ہو جائے گی، تو وہ اس سے بھی دریغ نہیں کرتیں، بعض دفعہ کسی کے بچہ پر ہولی دیوالی کے دنوں میں جادو کرا دیتی ہیں یا خود کر دیتی ہیں، بعضی جاہل عورتیں سیتلا پوجتی ہیں، کہیں چوراہے پر کچھ رکھ دیتی ہیں، محض اس غرض سے کہ اولاد پیدا ہو، پھر وہ اولاد بعض دفعہ ایسی خبیث پیدا ہوتی ہے کہ بڑے ہو کر باپ ماں کو اتنا ستاتی ہے کہ وہ بھی یاد ہی کرتے ہیں، اس وقت وہ ایسی اولاد کو جس کی تمنا میں سینکڑوں گناہ کیے تھے ہزاروں کوسنے دیتے ہیں۔

## اولاد کے خبیث ہونے کی وجہ کیا ہے؟

زیادہ وجہ اولاد کے خبیث اٹھنے کی یہ بھی ہے کہ تمنا کی اولاد کے لاڈ پیار بہت کیے جاتے ہیں، بچپن میں ان کے اخلاق خراب کر دیے جاتے ہیں کہ چاہے وہ کسی کو گالی یا کسی کو مار پیٹ لے، لاڈ کی وجہ سے کوئی اسے کچھ نہیں کہتا، اور کہنا سننا کیسا؟ بعض عورتیں تو اس کی تمنا کرتی ہیں کہ ہمارا بچہ گالی دینے کے قابل ہو جاوے۔

# بعض عورت کی یہ بھی گھٹیا تمنا ہوتی ہے

چنانچہ ایک عورت نے منت مانی تھی کہ اگر میرے لڑکا ہوا اور وہ ماں کی گالی کھا کر گھر میں آئے تو میں اللہ واسطے پانچ روپیہ کی مٹھائی تقسیم کروں گی، تو بھلا ایسی عورت اولاد کو گالی دینے سے کیا خاک روکیں گی، پھر وہ اولاد بڑے ہو کر ان کو بھی گالیوں سے یاد کرتی ہے، اور بعض لڑکے تو ایسے جلاد ہوتے ہیں کہ بیوی کے مقابلہ میں ماں کو لاٹھیوں سے کوٹتے ہیں، اس وقت یہ ساری تمنائیں خاک کے رستہ سے نکل جاتی ہیں، خیر یہ گناہ تو بچہ کے پیدا ہونے میں کیے جاتے ہیں۔

# تو کیا نماز کیلئے اتنا بھی تم سے نہیں ہوسکتا

### جتنا پیشاب پاخانہ کیلئے کرتی ہو

اب وہ پیدا ہو گیا تو یہ حالت ہے کہ آج کان دکھ رہا ہے، آج ناک میں تکلیف ہے، آج کھانسی ہے، آج بخار ہے، گو ان امراض میں سب ہی مبتلا ہوتے ہیں، مگر بچوں کی زیادہ نگہداشت کی جاتی ہے، ان کے لیے بلایا جاتا ہے کہیں عامل کو، اور بات بات کے لیے ٹونے ٹوٹکے کیے جاتے ہیں، اور یہ بھی کسی نے نہ کیا تو اس گناہ میں تو قریب قریب سبھی عورتیں مبتلا ہیں کہ بچہ ہونے کے بعد اکثر نماز نہیں پڑھتیں، اور جو کوئی نماز کو کہتا ہے تو جواب دیتی ہیں کہ بچوں کے ساتھ نماز پڑھنا کہاں ممکن ہے؟ ہر وقت تو کپڑے ناپاک رہتے ہیں، کبھی پاخانہ کر دیا، کبھی پیشاب کر دیا، پھر کپڑے بھی بدل لیں تو بچے گود سے نہیں اترتے، نماز کے لیے ان کو الگ

کریں تو روتے ہیں، چیختے چلاتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ مولویوں کے تو بچے نہیں ہوتے، انہیں اس مصیبت کی کیا خبر؟ ان کو تو بس نماز کے لیے تاکید کرنا آتا ہے۔

میں کہتا ہوں کہ مولویوں کے بچے نہیں ہوتے تو مولونوں کے تو ہوتے ہیں، پھر ذرا جا کر دیکھ لو کہ وہ کس پابندی سے پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتی ہیں، اور بعضی اللہ کی بندیاں نماز کے بعد تلاوت قرآن اور مناجات مقبول اور اشراق تک کی بھی پابند ہیں، کیا ان کی اولاد نہیں، ایسی انوکھی اولاد تمہاری ہی ہے جس کے ساتھ نماز پڑھنا محال ہے۔

پھر میں کہتا ہوں کہ جس وقت تمہارا بچہ روتا ہو اور گود سے ہرگز نہ اترتا ہو، اگر اس وقت تم کو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا لگے تو بتلاؤ تم کیا کرو گی، کیا اس کو پلنگ پر روتا ہوا ڈال کر پاخانہ میں نہ جاؤ گی؟ یقیناً سب جاتی ہیں، اور وہاں جا کر بعض دفعہ خوب دیر لگتی ہے، اور بچہ کی رونے کی کچھ پرواہ نہیں کی جاتی، تو کیا نماز کے لیے تم سے اتنا بھی نہیں ہوسکتا، جتنا پیشاب پاخانہ کے لیے کرتی ہو، افسوس! بس معلوم ہوا کہ یہ سب مہمل عذر ہیں۔

## ارادہ ایسی قوت کا نام ہے جس پر حق تعالیٰ

### نے امداد کا وعدہ فرمایا ہے

تیسری بات یہ ہے کہ آدمی جس کام کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے اللہ تعالیٰ اس میں ضرور مدد فرماتے ہیں، تو جو عورتیں ایسے بہانے کرتی ہیں وہ ذرا نماز شروع کر کے تو دیکھیں، انشاء اللہ پھولوں ملکی ہوجائیں گی، مگر اب تو ارادہ ہی نہیں کرتیں، اس

لیے نہ کرنے کے سو بہانے ہیں ورنہ ارادہ وہ چیز ہے کہ ایک وہ شخص جس سے بارش یا سردی میں خود اٹھ کر پانی بھی نہیں پیا جاتا، اگر صاحب کلکٹر کا حکم اس حالت میں اس کے پاس پہنچ جائے کہ فلاں مقام میں ہم سے آ کر ملو تو وہ دو میل پیادہ چلا جاتا ہے، لوگ حیرت کرتے ہیں کہ اس میں یہ قوت کہاں سے آ گئی، میں کہتا ہوں یہ ارادہ کی قوت ہے، جس پر حق تعالیٰ نے امداد کا وعدہ فرمایا ہے۔

## اس تدبیر سے تم نماز کی پابند ہو جاؤ گی

تو جناب یہ عورت نماز کا ارادہ ہی نہیں کرتیں، ورنہ کچھ مشکل بات نہ تھی لیجیے! میں ایک تدبیر بتلاتا ہوں جس سے بہت جلد نماز کی پابندی حاصل ہو جائے گی، وہ یہ کہ جب ایک وقت کی نماز قضا ہو تو ایک وقت کا فاقہ کرو، پھر دیکھیں نماز کیسے قضا ہوتی ہے، اگر کوئی کہے کہ نماز کی پابندی تو فاقہ سے ہوگی مگر فاقہ کی پابندی کیوں کر ہوگی؟ اس کو بھی تو کوئی ترتیب بتلاؤ، کیونکہ یہ تو نماز سے بھی زیادہ مشکل ہے، فاقہ کس سے ہوسکتا ہے؟ تو میں کہتا ہوں کہ فاقہ میں تو کچھ کرنا ہی نہیں پڑتا، بلکہ چند کاموں سے اپنے کو روکنا پڑتا ہے، اور یہ اختیاری بات ہے کہ ایک کام مت کرو، کسی کام کا کرنا تو مشکل ہوتا ہے مگر نہ کرنا کیا مشکل ہے۔

اگر کسی سے یہ نہ ہوسکے تو وہ اپنے ذمہ کچھ جرمانہ مالی مقرر کرلے کہ اتنے پیسے فی نماز ادا کیا کروں گی، یا کچھ نمازیں مقرر کرلیں کہ ایک نماز قضا ہوئی تو مثلاً دس رکعت نفل جرمانہ کی پڑھا کروں گی، اس طرح چند روز میں نفس ٹھیک ہو جائے گا انشاءاللہ تعالیٰ، ذرا عمل کر کے تو دیکھو۔

# اولاد کیلئے مستقبل کی فکر کرتے ہوئے

## جائداد جمع کرنا کیسا ہے؟

تیسری غلطی اولاد کی آئندہ کے لیے فکر کرنے میں کی جاتی ہے، اس میں لوگ بڑی خرابیاں کرتے ہیں، اول تو تمام جائیداد ان کے نام کر دیتے ہیں، اور لڑکیوں کو محروم کر دیتے ہیں، اس کا سخت وبال ہے، پھر مزہ یہ کہ وہ جائیداد حرام طریقہ سے حاصل کی جاتی ہے، کہیں دشمن سے کہیں سود سے، یہ وبال الگ رہا، پھر زندگی ہی میں اولاد کے نام داخل خارج کرا دیتے ہیں، اس کا نتیجہ وہ دنیا ہی میں دیکھ لیتے ہیں کہ بعض دفعہ اولاد جائیداد کی مالک بن کر ماں باپ کو ایک دانہ بھی نہیں دیتی، اور پیچھے تو ان کو ثواب کون پہنچاتا ہے؟ کوئی بھول کر نام بھی نہیں لیتا، ہاں دو چار دن برادری کے دکھانے کو کچھ کر دیتے ہیں، سو اس سے والدین کو کچھ نفع نہیں ہوتا، کیونکہ نیت ریاء کی ہے، اور اپنے اوپر سے الزام اور طعن کا دفع کرنا مقصود ہوتا ہے۔

# اپنی اولاد کیلئے کچھ جمع نہ کرو!

پھر اس بے اعتنائی کے ساتھ یہ بھی تو نہیں کرتے کہ ماں باپ کو بھلا کر ان کی جمع ذخیرہ جائیداد سے خود ہی راحت اٹھالیں، اگر اتنا بھی کریں تو خیر والدین کا کچھ مقصود تو حاصل ہو جائے، مگر وہاں یہ ہوتا ہے کہ ماں باپ کی رقم اور جائیداد کو دل کھول کر اڑایا جاتا ہے، اور کہاں رنڈی، بھڑووں بھڑوں میں، یار دوستوں میں ماں باپ نے تو مصیبت جھیل کر پیٹ اور تن کاٹ کر اور ایمان کھو کر گناہ سر پر لاد کر

مال وجائیداد جمع کی تھی، صاحبزادہ نے اس کی قدر کی کہ سب کے سب رذیل لوگوں میں اڑادی، کیوں نہ ہو مال حرام بود بجائے حرام رفت۔

اسی لیے ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ اپنی اولاد کے لیے کچھ جمع نہ کرے اور اس کی وجہ یہ فرمائی کہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ اولاد خدا کی دوست اور مطیع ہوگی، یا دشمن ونافرمان، اگر دوست اور مطیع ہوگی تو خدا تعالیٰ اپنے دوستوں کو ضائع نہیں کیا کرتے، اس صورت میں تم کو ان کی فکر کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر یہ خدا کے دشمن وہ نافرمان ہوئے تو خدا کی نافرمانی میں ان کو امداد دینا یہ کیا مناسب ہے۔

واقعی بات تو خوب فرمائی لیکن میرا یہ مطلب نہیں کہ سب لوگ ایسے ہی بن جاویں، ان کی خاص حالت تھی، جس میں سب کو اس حال کی تعلیم کی ہے، بلکہ حدیث شریف میں تو اس کی ترغیب ہے کہ اپنے عیال کو غنی چھوڑنا اس سے اچھا ہے کہ ان کو بالکل خالی ہاتھ چھوڑ جاؤ، تو اولاد کے لیے کچھ ان دوختہ چھوڑ جانا برا نہیں، مگر یہ تو نہ ہو کہ دوسرے کا گلا کاٹ کر ان کا کُرتہ سیا جائے کہ رشوت اور سود سے ذخیرہ جمع کیا جائے، غریبوں کی زمین ناحق دبا کر اپنی جائیداد کو بڑھایا جاوے، اور کسی نے اگر یہ ظلم بھی نہ کیا تو دوسرا ظلم یہ کیا کہ بیٹوں کو محروم کر کے سب زمین بیٹیوں کے نام کر دی۔

یہاں کیا اچھا لفظ ارشاد فرمایا ہے: فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ، جس میں جیسا کہ ابھی مذکور ہوتا ہے اس طرف اشارہ ہے کہ ایسا شخص نفع کی چیز میں ٹوٹا اٹھانے والا ہوگا، جس سے یہ معلوم ہو گیا کہ مال واولاد فی نفسہ ضرر کی چیز نہیں، بلکہ اگر معصیت کا سبب نہ بنیں تو واقعی میں نفع کی چیز ہیں، اور یہ اشارہ اس وجہ سے ہے کہ

خسارہ مطلق نقصان کو نہیں کہتے، بلکہ نفع کی چیز میں نقصان ہونے کو خسارہ کہا کرتے ہیں، بہر حال ایسے لوگ خسارہ میں ہیں اور زیاں کار ہیں۔

اطلاق خسارہ سے اس پر بھی دلالت ہے کہ صرف آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی یہ لوگ خسارہ ہی کے اندر ہیں، کیونکہ مال واولاد کی ایسی محبت وبال جان ہو جاتی ہے، اور مال واولاد ایسے ہی شخص کے لیے معصیت کا سبب ہو جاتے ہیں، جس کو اُن سے ایسی محبت ہو، تو محبت مال کا وبال جان ہونا تو ظاہر ہے کہ ہر وقت آدمی کو اسی کی فکر رہتی ہے کہ آج اتنے روپے ہیں، تو کل کو اتنے ہو جاویں، چنانچہ اپنی جان پر مصیبت ڈال ڈال کر روپیہ جوڑا جاتا ہے، پھر رات کو اُسے بار بار دیکھا جاتا ہے کہ اپنی جگہ پر ہے بھی یا نہیں، چوروں کے کھٹکے سے راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے، اور اولاد کا وبال جان ہونا آپ کو اس حکایت سے معلوم ہو جائے گا کہ میں نے ایک والیٔ ملک کی بیٹی کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنے بیٹوں سے اس قدر محبت تھی کہ رات کو وہ سب کو ساتھ لے کر بیٹھی تھیں، جدا کر کے ان کو چین ہی نہ آتا تھا، پھر جب بچے زیادہ ہو گئے اور ایک پلنگ پر نہ آسکے تو انہوں نے پلنگ پر سونا چھوڑ دیا، سب کو لے کر نیچے زمین میں فرش پر سویا کرتی تھیں، اور اس پر بھی اعتبار نہ آیا بلکہ کسی پر ہاتھ رکھ لیتیں اور کسی پر پیر، اور رات کو بار بار آنکھ کھلتی اور بچوں کو ٹٹول کر دیکھ لیا کرتیں۔

واقعی یہ محبت تو عذاب ہی ہے، پھر اگر ایمان بھی نہ ہوا تو دونوں عالم میں معذّب ہے، اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

فَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كَافِرُونَ۔

کیونکہ ان کو نہ دنیا میں چین ملا، نہ آخرت میں، اور اگر ایمان ہوا تو خیر دنیا ہی بے لذت ہوئی، آخرت انجام کار انشاء اللہ پُر لطف ہو جائے گی، غرض ثابت ہو گیا کہ محبت مال و اولاد کبھی معصیت کا سبب ہو جاتی ہے، اور اس سے دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ ہو جاتا ہے، خواہ خسارہ محدود ہو یا غیر محدود، البتہ جو لوگ اعتدال کے ساتھ محبت کرتے ہیں اور حقوق الٰہیہ کو غالب رکھتے ہیں ضائع نہیں کرتے، وہ ہر وقت لطف میں ہیں۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/۵۰۱ تا ۵۱۱)

## دنیا آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں جیسے ستارے آفتاب کے سامنے

اپنے مقصود کو صاف الفاظ میں کہتا ہوں کہ دنیا آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں ہیچ ہے، لا شے ہے، جیسے ستارے آفتاب کے سامنے کچھ نہیں، اور کانسٹیبل وائسرائے کے سامنے کچھ نہیں، واللہ دنیا کے لیے یہی فخر کافی ہے کہ وہ آخرت کے ساتھ ذکر ہوتی ہے۔

فی الجملہ نسبتے بتو کافی بود مراد
بلبل ہمیں کہ قافیۂ گل شود بس ست

کانسٹیبل کے لیے یہی وقعت کافی ہے کہ وہ ملازمانِ سرکاری میں وائسرائے کے ساتھ ذکر ہوتا ہے، کیا اہل دنیا چاہتے ہیں کہ ہم دین کا نام ہی نہ لیں، اور دنیا ہی کا ذکر رات دن کیا کریں، یہ تو ہم سے نہیں ہوسکتا، ہاں ان کی خاطر سے کبھی کبھی دنیا کا ذکر بھی کر دیتے ہیں، وہ بھی کون سی دنیا؟ دنیائے محمود، جو معین آخرت ہو، کیونکہ دنیائے

مذمومہ تو نہ انفرادی قابل ذکر ہے نہ انضماماً، نہ مدماً حاۃً، نہ ذماً گومذموم ہے، کیونکہ خدا تعالیٰ سے دور کرنے والی ہے، مگر بلا ضرورت ذم کے ساتھ بھی قابل ذکر نہیں۔

اسی وجہ سے حضرت رابعہ بصریہ رضی اللہ عنہ نے چند زاہدوں کو تنبیہ فرمائی تھی جو ان کے سامنے دنیا کی مذمت کر رہے تھے: قُوْمُوْا عَنِّیْ فَاِنَّکُمْ تُحِبُّوْنَ الدُّنْیَا، میرے پاس سے اٹھ جاؤ، تم دنیا سے محبت رکھتے ہو، حالانکہ وہ دنیا کے مذموم ہونے کا ذکر کر رہے تھے، مگر بلا ضرورت کر رہے تھے اور اس وقت کے مسلمانوں کو اس مردار سے ایسا تعلق ہے کہ اس کے ساتھ وہ معاملہ کر رہے ہیں جو خدا سے کرنا چاہیے تھا، یعنی خدا تعالیٰ کی طلب کی یہ شان ہونا چاہئے تھی۔

اے برادر بے نہایت در گہیست
ہرچہ بروے می سی بروے مالیست

مگر آج کل طلب دنیا کے ساتھ بعینہ یہ معاملہ ہو رہا ہے کہ اس کی کسی حد پر بس نہیں کرتے، لاینتھی ارب الاالیٰ ارب، ایک کام کو ختم کرتے ہیں، دوسرے میں لگ جاتے ہیں، ہزار روپے جمع ہو گئے تو دو ہزار کی فکر ہے، کسی کے پاس ایک لاکھ جمع ہے تو وہ دو لاکھ کی تمنا کر رہا ہے، بس اس مردار کو یوں سمجھ لیا ہے کہ

بحر لیست بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست
آں جاجز اینکہ جاں بسپارند چارہ ایست

چنانچہ آج اس پر فخر ہوتا ہے کہ ہم تو دنیا میں کھپ گئے ہیں، ہم کو سوائے کمانے کے اور کوئی دھندا نہیں، ایک کہتا ہے کہ مجھ کو اتنا نفع ہوا، دوسرا کہتا ہے کہ

میرے پاس اتنا ہے جمع ہے، تیسرا کہتا ہے میرے پاس اتنی دکانیں ہیں، اور ہر ایک کی اتنی آمدنی ہے ان باتوں کو فخر کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو بھنگی آپس میں فخر کریں، ایک کہے کہ میں نے اتنے گندگی کے ٹوکرے کمائے، دوسرا کہے میں نے تجھ سے زیادہ کمائے ، یہ ہے دنیائے مذموم جس نے خدا تعالیٰ سے غافل کر رکھا ہے، باقی دنیا محمودہ کو منع نہیں کیا جاسکتا۔

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کہ اعقل الناس ہیں، اور صرف ہمارے ہی نزدیک نہیں ہم تو غلاماں غلام ہیں ،ہم تو آپ کو آخر الناس ،افضل الناس، اکمل الناس ،سب کچھ مانتے ہی ہیں،لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ایسے عاقل ہیں کہ کفار بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لوہا مان گئے، بلکہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم سے بھی زیادہ عاقل مانتے ہیں ، کیوں کہ ہم تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امداد الٰہی کی وجہ سے مقاصد میں کامیاب مانتے ہیں اور کفار یہ دیکھ کر کے نور اسلام روز بروز بڑھتا جاتا ہے، اس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عقل وفہم کا ثمرہ سمجھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے رسول اس قدر عاقل تھے کہ ایسی تدبیریں کر گئے جس سے تمام عالم کو اسلام کا گرویدہ بنا دیا،تو جس چیز کو ہم قدرت نبویہ سے خارج اور تائید الٰہی کا ثمرہ سمجھتے ہیں، وہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عقل کا نتیجہ سمجھتے ہیں،تو اس طرح گویا کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہم سے بھی زیادہ عاقل سمجھا،تو اعقل الناس فرماتے ہیں۔ کَسْبُ الْحَلَالِ فَرِیْضَۃٌ بَعْدَ الْفَرِیْضَۃِ۔

یعنی دنیا کی ضروری مقدار حاصل کرنے کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرض فرمارہے ہیں، آپ لوگ تو دنیا کے طلب کو محض واجب عقلی ہی کہہ رہے ہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کو فرض شرعی فرماتے ہیں، جس کے ترک پر عذاب آخرت ہوگا، غرض بقدر ضرورت قسم دنیا ممنوع نہیں، البتہ اس کی محبت اور دل میں اس کی وقعت کرنا ممنوع ہے، خواہ پیرایۂ مذمت ہی میں ہو۔

اسی لیے حضرت رابعہؒ نے فرمایا تھا اس پر ان زاہدوں نے عرض کیا کہ حضرت ہم تو دنیا کی مذمت کررہے ہیں، ہم محب دنیا کدھر سے ہو گئے؟ فرمایا: من احب شئ اکثرذکرہ، جس کو جس چیز سے محبت ہوتی ہے وہ اس کا ذکر بہت کیا کرتا ہے، تمہارے دل میں دنیا کی کچھ تو وقعت ہے جو اس کی مذمت کرنے بیٹھے، کیونکہ قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کی دل میں کچھ بھی وقعت نہ ہو اس کا ذکر مذمت سے بھی نہیں کیا جاتا۔

چنانچہ جب ہم لوگ مجلس میں بیٹھے ہیں تو عہدہ داروں کی مذمت کرتے ہیں، چمار کی مذمت نہیں کرتے، کیونکہ چمار کی ہماری نظر میں کوئی وقعت نہیں، اور عہدہ داروں کی وقعت ہے۔

یہاں ایک طالب علمانہ اشکال ہوسکتا ہے، شاید کسی طالب علم کے ذہن میں یہ اشکال آیا ہو، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی تو دنیا کی مذمت کی ہے، تو کیا نعوذ باللہ! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں بھی اس کی وقعت تھی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر میں تو اس کی وقعت نہ تھی مگر امت میں بعض لوگ اس کے رنگ وروپ پر فریفتہ ہونے والے اور اس کی وقعت کرنے

والے ضرور تھے، اس لیے آپ کو اس مذمت کی ضرورت ہوئی، اگر امت میں بھی کوئی اس کی وقعت کرنے والا نہ ہوتا تو حضور ﷺ کبھی بھی اس کی مذمت نہ فرماتے، چنانچہ پیشاب اور پاخانہ کی مذمت آپ نے نہیں فرمائی، کیونکہ اس سے سب کو نفرت ہے، اور شراب کی مذمت فرمایا کیونکہ اس سے سب کو نفرت نہیں ہے، بلکہ بعض اس کے فریفتہ ہیں، گو حضور ﷺ کی نظر میں یہ بھی پیشاب پاخانہ ہی کہ مثل تھی، مگر بعض افراد امت کی رغبت کی وجہ سے مذمت خمر کی ضرورت ہوئی۔

غرض دنیا کی آپ نے ضرور مذمت فرمائی ہے اور جو لوگ حضرت رابعہ بصریہؒ کے پاس حاضر تھے ان کو کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ وہاں دنیادار کون تھا، سارے زاہد ہی جمع تھے، مگر زاہدین بعض دفعہ امراء سے اعتراض کرنے اور ان کے ہدایہ واپس کرنے کا تذکرہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اپنا کمال ظاہر ہو، اس پر تفاخر مقصود ہوتا ہے، تو وہ بظاہر اس تذکرہ میں دنیا کی مذمت ہی کی جاتی ہے، مگر حقیقت میں یہ شخص طالب دنیا ہے، کیونکہ طالب جاہ ہے اور طلب جاہ بھی طلب دنیا ہی ہے، محقق اس مذمت سے بھی تاڑ لیتا ہے کہ اس کے دل میں دنیا کی وقعت ہے۔

بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش
من انداز قدت رامی شناسم

غرض مذمت دنیا تین وجہ سے ہوتی ہے، یا بغرض محمود، یا بغرض مذموم، یا بلا فائدہ مذمت، بغرض محمود تو دین ہے جیسا کہ انبیاء علیہم السلام اور کاملین کے کلام میں دنیا کی مذمت ہے، اور بغرض مذموم، جیسے مذمت کر کے اپنا کمال ظاہر کرنا مقصود ہو،

یہ مذمت نہیں بلکہ حقیقت میں طلب دنیا ہے، اور مذمت بلا فائدہ یہ گو طلب دنیا نہ ہو مگر محبت دنیا کی علامت ہے کیونکہ ؎

گرایں مدعی دوست بشناختے
بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

جس کو خدا تعالیٰ سے تعلق ہو جاتا ہے وہ محبوب کے ذکر میں مشغول ہوتا ہے، بلا فائدہ دشمن کا ذکر نہیں کیا کرتا، غالباً حضرت رابعہ کے پاس والے بلا فائدہ مذمت کر رہے تھے، اس لیے ان کو تنبیہ فرمائی، اسی اصل پر حضرت رابعہ کی یہ بھی عادت تھی کہ شیطان پر لعن کبھی نہ کرتی تھیں، اور یہ فرماتیں کہ میں دوست کا ذکر چھوڑ کر دشمن کا ذکر کیوں کروں، مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تلاوت قرآن کے وقت اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم بھی نہ پڑھا جائے، جیسے بعض بزرگوں کی حکایت سے یہ شبہ ہوسکتا ہے۔

وہ حکایت یہ ہے کہ ایک بزرگ کسی دوسرے بزرگ کی زیارت کو گئے، مگر دفعتاً سامنے حاضر نہیں ہوئے، بلکہ حجرہ سے باہر ٹھہرے، اور توقع کر کے یہ معلوم کرنا چاہا کہ کس شغل میں ہے، اس وقت دوسرے بزرگ تلاوت قرآن کا قصد کر رہے تھے، حسب معمول انہوں نے اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم پڑھا اور فوراً ہی فرمایا کہ اے شیطان میں تجھ سے پناہ اس واسطے نہیں چاہتا کہ میں تجھ سے کچھ ڈرتا ہوں، میں جانتا ہوں کہ بدون حکم الٰہی کے تو کچھ نہیں کرسکتا، مگر بوجہ امر الٰہی کے تجھ سے پناہ چاہتا ہوں کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

فَإِذَا قَرَأْتَ الْقُرْآنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ۞ إِنَّهُ لَيْسَ لَهُ سُلْطَانٌ عَلَى الَّذِيْنَ آمَنُوْا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۞ إِنَّمَا سُلْطَانُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهُ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهِ مُشْرِكُوْنَ۔

اس میں حق تعالیٰ نے یہ بھی بتلا دیا کہ مومنین متوکلین پر شیطان کا قابونہیں چل سکتا، مگر پھر بھی سید المتوکلین صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ تلاوت قران کے وقت اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم کہہ لیا کیجئے کہ عبدیت اور عجز کا اظہار ہو کہ ہم ایسے عاجز ہیں کہ بے حقیقت شے سے بھی پناہ چاہتے ہیں، یہ سن کران زائر بزرگ کو حیرت ہوگئی کہ اللہ اکبران کا کیا عالی مقام ہے، سواس حکایت کے اول جزو سے تو تعوذ کا شبہ ہوسکتا تھا، مگر اسی کے دوسرے جزو میں اس کا جواب بھی مذکور ہے۔

میں کہتا ہوں کہ ان بزرگ کو جو یہ حالت نصیب ہوئی کہ ایسے مقام پر پہنچ گئے جہاں شیطان سے بے خطر ہو گئے، یہ بھی اعوذ باللہ پڑھنے ہی کا اثر تھا، یعنی پہلے سے جو اعوذ باللہ پڑھتے آئے ہیں اس کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے یہ حالت عطا فرمائی کہ شیطان سے بے خوف ہو گئے، اگر وہ ساری عمر اس کو نہ پڑھتے تو یہ حالت نصیب نہ ہوتی، تو اس کا بھی مقتضی یہی ہے کہ اس کی اور کثرت کریں۔

## پتھر کے رونے کا واقعہ

جیسے موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ ایک دفعہ ان کا گزر ایک پتھر پر ہوا، جو بہت رو رہا تھا، موسیٰ علیہ السلام نے رونے کا سبب پوچھا، تو کہنے لگا کہ جب سے میں نے یہ سنا ہے: وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ کہ جہنم میں پتھر بھی جائیں گے، اس

وقت سے مارے خوف کے رورہا ہوں، موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی کہ اے اللہ اس کو جہنم میں نہ ڈالا جائے، وحی نازل ہوئی کہ دعا قبول ہوگئی، اس کو تسلی کردیجئے کہ اس کو جہنم میں نہ ڈالا جائے گا، موسیٰ علیہ السلام نے اس کو بشارہ سنادی بہت خوش ہوا، اور رونا موقوف کردیا، موسیٰ علیہ السلام آگے تشریف لے گئے، واپسی میں پھر اس پر گزر ہوا تو دیکھا کہ اب بھی رورہا ہے، پوچھا اب کیوں روتا ہے؟ کہا اے موسیٰ رونے ہی کی بدولت تو یہ بشارت نصیب ہوئی تھی، تو جس چیز سے مجھے یہ دولت ملی اسے کیوں کر چھوڑ دوں۔

## تسبیح کی کیا ضرورت ہے؟

اسی طرح حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے دیکھا کہ تسبیح ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں، کہا حضرت آپ کو تسبیح کی کیا ضرورت ہے؟ آپ تو کامل ومنتہی ہیں، آپ کے تو رگ وروپ میں ذکر سرایت کر چکا ہے، فرمایا تسبیح ہی کی بدولت تو یہ حالت حاصل ہوئی ہے، تو کیا ایسے رفیق کو چھوڑ دوں، جس سے یہ دولت ملی، سبحان اللہ خوب فرمایا، اہل حواس کی حقیقت سمجھتے ہیں وہ اس میں سہو نہ کریں گے، گو اہل سکر یہی کہتے ہیں کہ ہم کو تسبیح کی کیا ضرورت؟۔

خیر یہ جواب تھا درمیان میں ایک شبہ کا بغور جملہ معترضہ کے اب پھر عود کرتا ہوں اصل مضمون کی طرف، وہ یہ کہ بزرگوں نے بے فائدہ باتوں سے یہاں تک کہ احتراز کیا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہؒ بے ضرورت شیطان پر بھی لعنت نہ کرتی تھیں، پھر دنیا کی مذمت بے فائدہ کو وہ کیسے گوارا کرتیں۔

اسی لیے میں نے کہا تھا کہ دین کے ساتھ ہم دنیائے مذموم کا ذکر بھی کرنا نہیں چاہتے، البتہ کبھی کبھی دنیائے محمود کا ذکر کر دیتے ہیں، بس دنیا کے لیے اتنا ہی فخر کافی ہے، باقی وہ اس قابل تو ہے ہی نہیں کہ اس کا انفرادی ذکر کیا جائے، کیونکہ وہ ہیچ اور لاشے ہے، اور اس مضمون کو عجیب نہ سمجھو، کیوں کہ قوی کے سامنے ضعیف شے بے حقیقت ہی ہوتی ہے، اسی طرح آخرت کے سامنے دنیا بے حقیقت ہے، جو انفراداً تو کسی طرح ہرگز قابل ذکر ہے ہی نہیں، اور وہ یہ مضمون پرانا ہے مگر میں کہہ چکا ہوں کہ پرانا ہونے سے مضمون بے وقعت ہو سکتا۔

اس پر شاید یہ سوال ہو کہ مضمون تو بے وقعت نہیں مگر اس کے بیان کی ضرورت کیا ہے، کیونکہ یہ تو بارہا کا سنا ہوا ہے پھر تکرار فضول ہے، میں کہتا ہوں کہ ہر چیز کا تکرار فضول اور بے ضرورت نہیں ہوتا، اس کی مثال میں یہ دیا کرتا ہوں کہ جیسے کھانا کھایا کرتے ہیں جو ہر دن مقرر ہوتا ہے، بلکہ دن میں چار دفعہ ہوتا ہے، چنانچہ اول تو صبح ہی یار دوست جمع ہو کر چائے نوشی کرتے ہیں، جو بقول حضرت مولانا دیوبندیؒ ثقہ لوگوں کی بھنگ ہے، تو صبح ہی یہ بھنگ یعنی چائے اڑائی جاتی ہے، جس کے ساتھ بسکٹ اور انڈے وغیرہ بھی ہوتے ہیں جو خاصی غذا ہے، پھر دوپہر کو اور اس کے بعد شام کو کھانا کھایا جاتا ہے، پھر رات کو دودھ یا چائے پی کر سوتے ہیں، اور چائے کو میں نے کھانا اس لیے شمار کیا کہ اگر یہ نہ ہو تو ایسی بے چینی ہوتی ہے گویا کھانا ہی نہیں کھایا۔

جیسا کہ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت ہے کہ آپ کے یہاں ایک بنگالی مہمان ہوا تھا، مولانا گھر والوں کو کھانا کھلانے کی تاکید فرما کر

مدرسہ وغیرہ میں چلے گئے، واپسی پر مہمان سے پوچھا کہ آپ نے کھانا کھالیا؟ کہنے لگے نہیں، مولانا گھر میں آکر ناخوش ہونے لگے، گھر والوں نے کہا ہم تو کھانا کھلا چکے، مولانا کو حیرت ہوئی، سوچنے سے یہ بات سمجھے کہ یہ لوگ چاول کو کھانا کہتے ہیں پوچھا تو معلوم ہوا کہ روٹی گئی تھی، چاول نہ تھے، وہ لوگ چاول ہی کو کھانا کہتے ہیں۔

اسی طرح جب چائے کے بدون کھانے سے قناعت نہیں ہوتی تو ان کا کھانا چائے ہی ہوئی، اس طرح سے چار بار کھانا کھاتے ہیں، غرض کھانے کی ضرورت ہمیشہ ہوتی ہے، تکرار کی وجہ سے کوئی اس کو بے ضرورت نہیں کہتا، نیز نئی شادی والے سوچیں کہ وہ روز روز بیوی کے پاس کیوں لیٹتے ہیں، چاہئے کہ ہر دن نئی شادی کیا کریں، ایک دن کے بعد پھر پہلی بیوی کے پاس نہ جایا کریں، کیونکہ اب تو وہ مکرر رہے، مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ بیوی سے مل کر اس کے پاس سے اٹھنے کو جی نہیں چاہتا۔

اللہ ایک ادنیٰ سے جمال سے تو سیری نہ ہوا، اور حضرت حق سے سیری ہوگئی کہ ان کے احکام ایک دفعہ سن کر پھر بے ضرورت ہو گئے، شاید تم یہ کہو کہ یہاں تو بار بار شوق بڑھتا ہے، اور وہاں کیا بڑھتا ہے، ارے جن پر حضرت حق کی محبت کا غلبہ ہے ان سے پوچھو، کیا بڑھتا ہے اسی کی تو شکایت ہے کہ ہم کو حضرت حق کے ساتھ تعلق نہیں، جن کو تعلق ہے ان کی تو یہ حالت ہے ؎

دیدہ از دیدنش نگشتے سیر
ہمچناں کز فرات مستسقی

بلکہ محققین کا قول ہے کہ ترقی معرفت جنت میں بھی ختم نہ ہوگی، وہاں بھی ترقی ہوتی رہے گی، حتیٰ کہ بعض اہل حال کا قول ہے کہ جنت میں ایک جماعت ہوگی

جو نہ قصور پر توجہ کریں گے نہ حوروں پر، بلکہ وہ ہر دم، اَدِنِیْ اَدِنِیْ کہیں گے، کیونکہ وہاں انکشاف متزائد ہے، اس لیے ہر تجلی کے بعد دوسری تجلی کا اشتیاق ہوگا، اور اس کی لذت کے سامنے حور وقصور سب ہیچ معلوم ہوں گے۔

ہم نے دنیا میں خود بھی ایسے لوگ دیکھے ہیں جو حوروں کے طالب نہ تھے محض خدا تعالیٰ کے طالب تھے، مگر یہ باتیں ان لوگوں سے معلوم ہوتی ہیں جو کسی قدر مجذوب بھی ہوں یعنی جن پر جذب کا غلبہ ہو، عارفین کاملین ایسی باتیں نہیں ظاہر کرتے۔

اسی لیے عارف فرماتے ہیں۔

راز درونِ پردہ زرندان مست پُرس
کیں حال نیست صوفئ عالی مقام را

وجہ یہ کہ صوفی عالی مقام اپنے حال پر غالب ہوتا ہے، اس لیے وہ ضبط کیے ہوئے رہتا ہے اسرار کو ظاہر نہیں کرتا۔

غیرت از چشم برم روتے تو دین نہ دہم
گوش رانیز حدیث توشنیدن نہ دہم

اسی لیے ہمارے حضرات تو ان باتوں کی رسید ہی نہیں دیتے گو وہ خود رشید ہی ہوں، اور اگر بعضے کسی وقت ظاہر بھی کرتے ہیں تو ہر ایک کے سامنے نہیں ظاہر کرتے، بلکہ مجمع خاص میں کچھ کہہ دیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بار مولانا فضل الرحمن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس میں حاضر تھا تنہائی کا وقت تھا خاص مجمع تھا ہر ایک کو آنے کی اجازت نہ تھی، جب کوئی آتا تو اس پر

ڈانٹ پڑتی ،ضرورت ہے ایسے بزرگوں کی بھی جو کبھی کبھی مریدوں کو ڈانٹ دیا کریں بعضے تو بہت ہی سختی کرتے ہیں ، ایسی سزائیں اور قاعدے مقرر کرتے ہیں جیسے سلاطین کے یہاں انتظام ہوتا ہے ، یہ تو اچھا نہیں کہ خلاف سنت ہے ، اور بعض بہت نرمی کرتے ہیں کہ مریدوں کو کسی بات پر تنبیہ ہی نہیں کرتے ، یہ بھی زیبا نہیں ، بس نرمی اور گرمی دونوں چاہیے ، اس سے اعتدال ہو جائے گا۔

جیسے ایک بزرگ سے کسی سانپ نے بیعت کر لی تھی انہوں نے اس سے یہ عہد لیا کہ کسی کو ڈسنا نہیں ، جانوروں نے جو دیکھا کہ یہ کسی کو کچھ نہیں کہتا تو نڈر ہو کر سب نے اس کو مارنا اور تنگ کرنا شروع کیا ، چند روز کے بعد وہ بزرگ کے پاس آیا تو دیکھا بہت ہی بُری حالت میں ہے ، پوچھا کیا حال ہے؟ کہا حضور نے کاٹنے سے منع کیا تھا ، جانوروں کو جو یہ خبر لگی تو اب سب مجھے تنگ کرنے لگے ، فرمایا میں نے کاٹنے ہی سے تو منع کیا ہے ، پھنکارنے سے تو نہیں منع کیا ، بس اب سے جو جانور پاس آئے فوراً پھنکار دے دیا کر وہ بھاگ جائے گا ، اس روز سے غریب کو چین ملا ، اسی طرح بزرگوں کو بھی چاہیے کہ کبھی کبھی پھنکار دیا کریں۔

غرض اس وقت ایسی تنہائی تھی کہ حضرت مولانا نے ایسی خاص باتیں فرمائیں جو لوگوں کے سامنے کہنے کی نہ تھی ، منجملہ ان کو ایک یہ بات بھی فرمائی کہ جب ہم جنت میں جائیں گے گویا اس کا تو اطمینان تھا اور حوریں ہمارے پاس آئیں گی تو ہم کہہ دیں گے کہ جی اگر قرآن سناؤ تو ہمارے پاس بیٹھو ورنہ بس جاؤ۔ مگر مولانا نے یہ بات یہاں کی حالت کے اعتبار سے فرمائی جس کو میں غلبہ

حال پر محمول کرتا ہوں اس وقت مولانا کی نظر اس پر نہ تھی کہ جنت میں معرفت ایسی کامل ہوگی کہ حور کی طرف التفات کرنے سے بھی توجہ الی الحق میں کمی نہ آئے گی۔

عارفین کاملین حور سے بھی نظر خدا تعالیٰ ہی پر کریں گے اسی کو عارف فرماتے ہیں ؎

حسن خویش از روئے خوباں آشکارا کردۂ
پس بچشم عاشقاں خودرا تماشا کردۂ

اس کی ایسی مثال ہے کہ محبوب نے ایک وقت مقرر کر دیا ہو کہ اس وقت میں بلاواسطہ رویت ہوگی اور دوسرے وقت میں ایک آئینہ دے دیا کہ ہم کو اس میں سے دیکھو، اسی طرح حور عارفین کاملین کے لیے مراد جمال حق ہوں گی۔

تو جنت میں دو قسم کے لوگ ہوں گے ایک کاملین وہ تو دونوں صورتوں میں جمال حق ہی کا مشاہدہ کریں گے، دوسرے ناقصین وہ ایک رخے ہوں گے کہ صرف، اَرِنِیْ اَرِنِیْ پکاریں گے، ان کو کسی چیز کی طرف توجہ نہ ہوگی، مگر یہ ناقصین کاملین کے سامنے ناقص ہیں ہم سے آپ سے تو بہت بڑھے ہوئے ہیں ؎

آسماں نسبت بعرش آمد فرود
لیک بس عالی ست پیش خاک تود

غرض خدا تعالیٰ کے شوق میں مست ہو جانا جنت میں تو ہو ہی گا ہم نے تو یہاں بھی ایسے بزرگ دیکھے ہیں جو حسن و جمال حق میں ایسے مست تھے کہ حوروں کی طرف بھی التفات نہ کرتے تھے، مگر تم نے حسن حق کو سمجھا کیا ہے، رب تعالیٰ شانہ کا

حسن کوئی چراغ جیسی روشنی نہیں ہے، بہت لوگ یہی سمجھے ہوئے ہیں یہ غلط ہے، انہوں نے حق تعالیٰ کے حسن کی قدر ہی نہیں کی، وہ حسن تو ایسا ہے کہ اس کی حقیقت یہاں سمجھ میں آہی نہیں سکتی، اس لئے بزرگوں کا ارشاد ہے۔

من خطر ببالك فهو هالك والله اجل من ذلك۔

کہ اس وقت جو کچھ دل میں انوار وتجلیات نظر آتے ہیں وہ سب ہالک وفانی ہیں، حق تعالیٰ ان سب سے بالا وبرتر ہیں۔

یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو انوار قلب کو یا انوار ذکر کو نور حق سمجھ لیتے ہیں، اس غلطی میں بہت لوگ مبتلا ہیں، ایک سالک تجلی روح کو تیس برس تک تجلی ذات حق سمجھتے رہے، بعد میں تنبیہ ہوئی تو اس سے توبہ کی، غرض یہاں حسن و جمال حق کی حقیقت اور کیفیت معلوم نہیں ہوسکتی، اور حقیقت تو آخرت میں بھی معلوم نہ ہوگی، مگر وہاں انکشاف صحیح ہوگا اسی کو سعدی فرماتے ہیں۔

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
وز ہرچہ گفتہ اندوشنیدم وخواندہ ایم
دفتر تمام گشت وبپایاں رسید عمر
ماہمچناں دراوّل وصف تو ماندہ ایم

ہاں جب انکشاف کا وقت آئے گا اس وقت یوں ترنم کیجئے گا۔

## دل میں غیر اللہ کے ہوتے ہوئے حق تعالیٰ
## کی تجلی کسی دل پر نہیں ہوسکتی

بے حجابانہ در آزور کا شانہ ما
کہ کسے نیست بجز دردتو درخانۂ ما

اس میں وجہ بھی بتلادی کہ اس وقت بے حجابانہ رویت کی درخواست اس لیے کریں گے کہ اس وقت غیر دل میں نہ ہوگا، اوراب غیر دل میں گھسا ہوا ہے اور حق تعالیٰ کی تجلی غیر کے ساتھ کسی دل پر نہیں ہوسکتی، اس کی تو شان یہ ہے۔

چوں سلطان عزت علم برکشد
جہاں سر بجیب عدم درکشد

اوراس سے معلوم ہوگیا کہ معنی ادھر سے ہے اُدھر سے معنی کوئی نہیں، اس لیے حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے، لَنْ تَرَانِیْ فرمایا تھا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے، فرمایا کہ میں نظر نہیں آسکتا وہ تو ہر وقت نظر آسکتے ہیں، مگر یہاں ہمارے آنکھوں میں تجلی دیدار کی طاقت نہیں۔

شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردۂ چشم
بے پردہ ورنہ ماہے چوں آفتاب دارم

بس یہاں پر تو ان کے دیکھنے کی سب سے اکمل یہ صورت ہے کہ قرآن کے اندران کے جمال وجلال کا مشاہدہ کرلیا جائے اس پر مجھے مخفی کا شعر یاد آتا ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ ویدن میل دارد در سخن بیندمرا

اسی طرح گویا دنیا کے اعتبار سے تعلق فرمارہے ہیں کہ ۔

ہر کہ ویدن میل دارد در سخن بیند مرا

ابھی قرآن پڑھا گیا تھا اس وقت سامعین کی کیا حالت تھی اگر کوئی یہ کہے کہ یہ اثر لہجہ اور آواز کا تھا تو میں کہتا ہوں کہ ذرا انہی قاری صاحب کو قافیہ دے دیا جائے اور ان سے کہئے یہ کہ اس کو اسی لہجہ کے ساتھ پڑھیں یقیناً خاک بھی اثر نہ ہوگا ، یہ شہادت کافیہ ہے اس امر کی کہ دراصل قرآن کا اثر ہے، البتہ لہجہ اور آواز سے بھی اس میں کچھ خوبی آجاتی ہے دوسرے لہجہ اور آواز کا اثر ایک دفعہ کے بعد نہیں رہا کرتا اور قرآن میں ایسی حلاوت ہے کہ جتنا بھی سنا جائے اس سے سیری نہیں ہوتی ، کسی حسین صورت سے ایک عمدہ سی غزل سنیے، پہلی بار تو اثر ہوگا مگر تکرار میں جی بھر جائے گا ، کیونکہ وہ کلام انسانی ہے، جب متکلم فانی ہے تو اس کے کلام کی لذت بھی فانی ہے، اور قرآن کا چاہے کتنا ہی تکرار کیا جائے اس سے جی نہیں بھرتا، بشرطیکہ پڑھنے والا بے تکلف اور صحیح پڑھتا ہو کیونکہ یہ خدا تعالیٰ کا کلام ہے جیسے وہ خود باقی ہے ایسے ہی ان کے کلام کی لذت بھی باقی ہے، لایخلق من کثرۃ الرد۔ بار بار پڑھنے سے کلام الٰہی نہیں ہوتا۔

گوقرآن یعنی کلامِ لفظی بدرجۂ کلام نفسی بناء بر تحقیق متکلمین حق تعالیٰ کی صفت ذاتیہ نہ ہو مگر ذات حق سے اس کو ایسی نسبت ہے، جیسے شعاع کو آفتاب سے

پس ایک قرص آفتاب ہے کہ وہ اس کی ذات ہے، دوسری اس کی صفت نور جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے، تیسری شعاع چوتھی زمین منور، یہ شعاع نہ نور قائم بالشمس کی طرح ہے، نہ شمس سے متصل ہے اور نہ زمین کی طرح شمس سے بالکل منفصل۔

اسی طرح کلام لفظی نہ صفات ذاتیہ کی طرح ذات کے ساتھ قائم اور نہ دوسرے حوادث کی طرح بعید التعلق بلکہ باوجود حادث ہونے کے دوسرے حوادث سے زیادہ شدید التعلق اور اسی شدت تعلق کے سبب اس کو کلام اللہ کہا جاتا ہے، دوسرے کلام حادث کو کلام اللہ نہیں کہا جا سکتا، اور اسی جگہ سے بعض متکلمین نے اس کلام لفظی کو بھی قدیم کہہ دیا ہے، گو ظہور اس کا حادث ہو، اور مسئلہ دقیق ہے بلا ضرورت اس میں خوض کرنا بھی جائز نہیں، باقی میرا مقصود دونوں قولوں پر حاصل ہے کہ ان الفاظ میں ایک خاص شان ہے جس سے اس میں کہنگی نہیں آتی۔

پس جب قرآن کے الفاظ سے جی نہیں بھرتا تو اس کے معنٰی سے کیوں کر سیری ہوسکتی ہے، اور اس پر عمل کرنے کا انوار سے کیوں کر جی بھر سکتا ہے، واللہ جو لوگ انوار معنی قرآن سے اور انوار اعمال سے مشرف ہو چکے ہیں ان کو کبھی سیری نہیں ہوتی اور نہ اُن کو کسی حد پر چین ہے، مگر مزہ یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں ان کو بڑے چین کے ساتھ بھی چین نہیں، یعنی ان کو اس بے چینی میں ایسا چین ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت ان کے سامنے حقیر ہے، غرض جب قرآن شریف کی یہ حالت ہے تو اس کے مضامین سے سیری کیوں کر ہوسکتی ہے، اور احکام الٰہی کے ذکر سے جی کس طرح بھر سکتا ہے، لہٰذا یہ مضمون پُرانا سنا ہوا ہے مگر اس کا تکرار بے فائدہ نہیں ہے، بلکہ قند مکرر کا سا تکرار ہے۔

دوسرے اگر پرانی بات چھوڑنے کے قابل ہے تو یہ آپ کا شبہ بھی تو پُرانا ہے، آپ ہی اس شبہ کو جانے دیجیے، جب میں قنوج گیا تھا تو وہاں ایک محلہ والوں نے اپنے محلہ کا نام اس لیے بدل دیا تھا کہ پہلے نام میں اس کی قومیت ظاہر ہوتی تھی، اس کو چھپانے کے لیے نام بدل گیا، میں نے اس پر ایک وعظ کہا تھا، دوبارہ جب پھر گیا تو وعظ میں پھر اس کا ذکر ہوا، اس محلہ کے لوگوں نے کہا کہ ہمارے پیچھے پڑ گئے، پہلے بھی وعظ میں ہم کو بُرا بھلا کہا تھا اب پھر وہی کہا، ایک صاحب نے جواب دیا کہ تم نے خود ہی کہلوایا ہے، اس نے نہیں کہا، اگر تم اول ہی اصلاح کر لیتے تو دوبارہ کرنے کی کیوں نوبت آتی، اسی طرح آپ کہلوا رہے ہیں اگر آپ پہلے مضامین کو سن کر اپنی اصلاح کر لیتے تو مجھے وہی مضمون دوبارہ کہنا نہ پڑتا۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے دنیائے مذموم سے منع فرمایا ہے، اور آخرت کی ترغیب دی ہے، مگر عنوان دونوں جگہ ایسا عجیب ہے جس سے دنیا وآخرت دونوں کی اصلی حقیقت تھوڑے سے لفظوں میں ظاہر فرما دی، واقعی خدا تعالیٰ کے سوا ایسا کوئی نہیں کرسکتا، اس آیت سے پہلے دنیا کا بے حقیقت ہونا ایک مثال سے ظاہر فرمایا ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُم مَّثَلَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَاءٍ أَنزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا۔

اس کے بعد یہ آیت ہے: الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا کہ مال اور اولاد حیات دنیا کی زینت وہ آرائش ہیں، اور یہ بات سب کو معلوم ہے کہ زینت

ہر چیز کو اس کے تابع ہوا کرتی ہے، اور جب تابع ہے تو اس کا مرتبہ اصل سے کم ہوا، اور متبوع کا بے حقیقت ہونا پہلے یعنی اوپر کی آیت میں بیان ہو چکا ہے، اس سے خود ہی معلوم ہو گیا کہ اس کا تابع کیسا کچھ ہوگا؟ تو ایک لفظ زینت سے اس قدر ان کی بے وقعتی کو واضح فرمایا ہے، عجیب فصاحت و بلاغت ہے۔

اس کے علاوہ اس میں ایک اور بھی نقطہ ہے وہ یہ کہ آرائش اور زینت کی چیز یں اکثر فضول اور زائد اور بے ضرورت ہوا کرتی ہیں، تو حق تعالیٰ نے مال و بنون کا بے حقیقت و بے ضرورت ہونا لفظ زینت سے ظاہر فرما دیا ہے کہ یہ سب زینت ہی زینت ہے اور کچھ نہیں، مطلب یہ ہے کہ جو مال و اولاد تم کو مطلوب ہے جس میں آخرت کو چھوڑ کر تم منہمک ہو رہے ہو وہ بے ضرورت اور زائد چیزیں ہیں، کیونکہ مال سے مقصود رفع ضرورت ہے اور رفع ضرورت سے مطلوب بقاء النفس ہے، تو اصل مقصود کے لیے واسطہ در واسطہ ہے پھر ایسے واسطہ کو مطلوب بنا لینا حماقت نہیں کہ رات دن اسی میں منہمک ہو اور بقاء النفس جو مطلوب ہے وہ بھی بے حقیقت ہے کیونکہ اس کا بقاء چند روزہ ہے جو قابل اعتبار نہیں، غرض مال خود مطلوب بنانے کے قابل ہرگز نہیں، اور اولاد تو اس سے بھی گھٹیا ہے، کیونکہ وہ تو بقاء النفس کے لیے بھی نہیں صرف بقاء نوع کے لیے مطلوب ہے، اور بقاء نوع کے لیے اسی کی کیا ضرورت ہے کہ آپ ہی کی اولاد ہو اگر میرے اولاد نہ ہوئی اور آپ کے دو ہو گئیں تو اس سے بھی بقا نوع ہو سکتا ہے، دوسرے بقا نوع کی آپ کو کیا فکر ہے جب تک حق تعالیٰ کو انسان کی آبادی دنیا میں مطلوب ہے اُس وقت تک وہ اس کی تدبیر کریں گے، آپ

اس میں رائے دینے والے کون ہیں کہ خواہ مخواہ آپ کی نوع باقی ہی رہے اور وہ بھی اس صورت سے کہ آپ ہی کے اولاد ہو۔

## لڑکے دنیا کی زینت اور لڑکیاں گھر کی زینت ہیں

یہاں ایک بات قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس جگہ حق تعالیٰ نے بنون کو زینت حیاۃ الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے، کیونکہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی۔

دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ بنات زینت دنیا بھی نہیں ہے، بلکہ محض زینت خانہ ہے، اگر وہ بھی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے، پس صرف بنون کو زینت دنیا فرمانا اور بنات کا ذکر نہ فرمانا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی بھی زینت نہیں ہیں، کیونکہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو، اور وہ ایسی زینت نہیں کہ تم ان کے ساتھ لئے لئے پھرو، اور سب دیکھیں کہ ان کی اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں، بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں۔

یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا، دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کا پردہ کرایا جائے، کیونکہ اردو میں عورت کو عورت کہتے ہیں، جس کے معنی لغت میں ہے چھپانے کی چیز، تو اس کے ساتھ یہ کہنا کہ عورتوں کو پردہ نہ کراؤ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ، پہننے کی چیز کو نہ

پہنو، اور اس کا لغو ہونا ظاہر ہے تو یہ قول بھی لغو ہے کہ عورتوں کا پردہ نہ کراؤ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیز ہیں۔

ایک ترقی یافتہ کہتے تھے کہ عورتیں پردے کی وجہ سے ترقی علمی سے رکی ہوئی ہیں، میں نے کہا جی ہاں، اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں، یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے، اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ یا غیر تعلیم یافتہ ہونے پر پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں، بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے، اگر کسی قوم کو عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں، ورنہ بے پردگی سے بھی کچھ نہیں ہوسکتا بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہوسکتی ہے کیونکہ تعلیم کے لیے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشہ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اسی واسطے مرد بھی مطالعہ کے لیے گوشہ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں جیسا کہ طلبہ کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے بس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لیے معین ہے نہ کہ مانع، نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کا منافی سمجھتے ہیں۔

ہاں علوم تجارت اور علوم تجارت کے لیے سیر و سیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لیے سیر و سیاحت سے تجربہ میں حقیقی یعنی اخلاقی ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی اسی لیے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی کیونکہ یہ ایسی کا محاصلہ ہے کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہو جاتی ہیں مرد تو برسوں میں کسی بہت ہی بڑی بات پر طلاق کا قصد

کرتا ہے وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ہے ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھوں میں طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادی کیا کرتی بس عورتوں کے لیے یہی صرف اور صحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں جن تجربوں کو کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔

## تعلق مع اللہ وہ دولت ہے کہ اس کے بعد

### کسی سیر وتماشا کی ضرورت نہیں

بلکہ میں کہتا ہوں نظر حقیقت سے دیکھے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں، اگر سیر وتماشا چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے، دل کی آنکھوں سے دیکھ لو تم کو اپنے ہی اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھولوں اور پھلواریوں سے استغفار ہو جائے گا۔

ستم ست اگر ہوست کشد کہ بسیر سر وسمن درآ
توز غنچہ کم ندمیدۂ دردل کشا بچمن درآ
چوں کوئے دوست، ہست بصحرا ءچہ حاجت ست
خلوت گزیدہ رابہ تماشا چہ حاجت ست

جس کو یہ دولت مل گئی ہے اس کو تو اس کی بھی ضرورت نہیں رہی کہ آنکھوں سے کچھ نظر آتا ہو اور نابینائی کی حالت میں بھی خوش وخرم رہے گا۔ بینا سے نابینا ہونے کے بعد مطمئن ہم نے کسی کو نہیں دیکھا، مگر حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ

کو لوگوں نے ابھی دیکھا ہے مولانا نابینا کی حالت میں بھی ایسے مطمئن تھے جیسے بینائی کی حالت میں تھے، آخر مولانا میں کیا بات تھی؟ مولانا نبی تو نہ تھے، امتی ہی تھے، تو جو بات ان کو حاصل تھی وہ آپ بھی حاصل کر سکتے ہیں، یعنی تعلق مع اللہ یہ وہ دولت ہے کہ اس کے بعد کسی سیر وتماشہ کی ضرورت نہیں رہتی، یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کشف وکرامت کو مولانا کی طرف منسوب کررہا ہوں کہ مولانا کو نابینا ہی کی حالت میں بھی ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ بینائی کی حالت میں، اس لیے آپ مطمئن تھے ان حضرات کے سامنے کشف وکرامت کی حقیقت ہی کیا ہے، نہیں بلکہ مولانا کے اطمینان کا سبب محض تعلق مع اللہ تھا، ان کو دنیا سے تعلق ہی نہ تھا، اس لیے بینائی کے جاتے رہنے کا بھی کچھ غم نہ تھا، بلکہ عجب نہیں کہ اس سے خوش ہوئے ہوں کہ پہلے اغیار پر نظر پڑتی تھی اب محبوب کی سوا کسی پر نظر نہیں۔

افسوس ان حضرات پر نادانوں کو یہ شبہ تھا کہ وہ شورش برپا کریں گے اس لیے ان کی سخت نگرانی چاہیے، ہائے! شورش یہ کریں گے جن کو دنیا سے کچھ علاقہ ہی نہیں، شورش تو وہ کرے جس کو دنیا مطلوب ہو اور ان حضرات کی تو یہ حالت ہے کہ بے شورش کے بھی اگر ان کو کوئی ملک ملتا ہو تو اس سے بیزاری ظاہر کرتے ہیں شورش کر کے تو ملک وحکومت یہی لیں گے۔

حضرت سیدنا عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ملک سنجر کے بادشاہ ملک نیمروز کا خط آیا تھا کہ میں ملک نیمروز کا ایک حصہ آپ کو خرچ خانقاہ کے لیے دینا چاہتا ہوں اگر یہ حضرات طالب حکومت ہوتے تو فوراً منظور کر لیتے، مگر آپ نے جواب میں تحریر فرمایا۔

چوں چتر سجری رخ بختم سیاہ باد

دردل بوداگر ہوس ملک سنجرم

یعنی اگر میرے دل میں تیرے ملک کی ہوس تک بھی ہوتو خدا کرے میرا بخت سیاہ رو ہو جائے ، جیسا کہ تیرا چتر سیاہ ہے اس زمانے میں سلاطین کا چتر سیاہ ہوا کرتا تھا، آگے اس کے بے رغبتی کی وجہ بیان فرماتے ہیں ۔

زانگہ کہ یافتم خبراز ملک نیم شب

من ملک نیمروز بہ یک جو نمی خرم

کہ جب سے مجھے نیم شب یعنی آدھی رات کی بادشاہت ملی ہے اس وقت سے میں ملک نیمروز کو ایک جو کے بدلے بھی نہیں خریدنا چاہتا، اس وقت ایک طرف سے آواز ائی کہ حضرت ادھر بھی رخ کیجئے، آواز نہیں آتی فرمایا کہ پھر ایک واعظ اور بلا لو جو اُدھر اُدھر والوں کو سنا دے گا، ہم کسی کے نوکر نہیں، جو آپ کے گھمانے سے گھومتے رہیں، جب جی چاہے گا تو اُدھر بھی رخ کرلیں گے اور اگر کسی کو آواز نہ پہنچتی ہو اور اس لیے بیٹھنا گراں ہو تو وہ اٹھ کر چلا جائے۔

## کیا حضرت علیؓ کے دل میں منصب خلافت کا شوق تھا؟

واللہ جس کو یہ دولت مل گئی ہو اس کو سلطنت کی ہوس نہیں رہ سکتی، بلکہ وہ تو اس سے گھبراتا ہے، کیونکہ اس سے تعلق مع اللہ میں تشویش اور تشتت پیدا ہوتا ہے ،لوگ آج کل حضرات صحابہؓ کے قصوں کی بحث میں اوقات ضائع کرتے ہیں، مثلاً بعضے کہتے ہیں کہ حضرت علیؓ کو اول خلیفہ کرنا چاہیے تھا، میں بقسم کہتا ہوں کہ

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے دل سے پوچھا جائے وہ تو حضرات شیخین کے احسان مند ہوں گے کہ انہوں نے ان کو مصیبت سے بچا لیا، کیونکہ حضرات صحابہؓ کی خلافت شاہان اودھ کی سی بادشاہت نہ تھی کی رات دن عیش اور مستیاں کرتے ہوں۔

وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کہ ایک دن گرمی کی سخت دوپہر میں جب کہ لُو چل رہی تھی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا، یہ تو امیر المومنین ہیں، جب ان کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیر المومنین اس وقت سخت گرمی اور لُو میں کہاں جا رہے ہیں؟ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں، انہوں نے عرض کیا کہ کسی خادم کو نہ بھیج دیا، فرمایا قیامت میں تو سوال مجھ سے ہوتا، خادم سے سوال نہ ہوتا، عرض کیا پھر تھوڑی دیر توقف کر کے تشریف لے جائیں، ذرا گرمی کم ہو جائے فرمایا: نَارِ جَهَنَّمُ اَشَدُّ حَرًّا جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے، یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لو میں جنگل تشریف لے گئے یہ سلطنت تھی۔

یہ ان حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص ان پر روک ٹوک کرنے کو موجود تھا تو اس صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز تھی، جس کی تمنا کی جائے، ہرگز نہیں، واللہ اس سے زیادہ مصیبت کی چیز کوئی نہ تھی، تو کیا حضرت علیؓ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہو سکتے تھے کبھی نہیں۔

دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی تو اس کی تمنا وہ کرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو تو کیا نعوذ باللہ ان لوگوں نے

حضرت علیؓ کو دنیا دار اور طالب دنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے، اگر وہ ایسا سمجھیں تو ان کو یہ خیال مبارک ہو ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علی کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی، کیونکہ ان کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی یہ خاصیت ہے کہ ؎

آں کس کہ تراشناخت جاں راچہ کند

فرزند وعیال وخانماں راچہ کند

پھر ان کو خلافت دیر میں ملی تو کیا اور نہ ملتی تو کیا ان کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہو سکتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے پھر جس بات سے ان کو خوشی ہو آپ اس میں رنج کرنے والے کون ہیں؟ یہ تو وہی مثل ہوئی مدعی سست گواہ چست۔

اس دنیا کی بے وقتی کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مال و بنون زینت حیاۃ دنیا ہیں اور ان کو زینت کہنے میں ایک نکتہ اور سمجھ میں آیا وہ یہ کہ زینت وآرائش اعراض میں سے ہے تو اس میں یہ بتلایا ہے کہ دنیا کے جواہر بھی اعراض ہی ہیں گو بظاہر جواہر نظر آتے ہیں، مگر فانی ہونے کی وجہ سے وہ اپنے وجود میں غیر مستقل مثل اعراض کے ہیں اس کے مقابلہ میں آخرت کے اعراض بھی جواہر ہیں، کیونکہ وہ باقیات صالحات ہیں یہ نکات تو اس وقت ذہن میں ہیں اگر غور کیا جائے تو اور بھی نکات نکل آئیں گے ان کی تو انتہاء ہی نہیں۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۷ ۵۱ تا ۵۴۴)

**ایک شبہ کا جواب:** اب ایک شبہ اور رہا وہ یہ کہ حق تعالیٰ اللہ شانہٗ یہاں اعمال کو باقی فرمایا ہے حالانکہ وہ تو اعراض ہیں وہ کیسے باقی رہ سکتے ہیں۔

مثلاً پھر بقاء تبعاً للمعروض بھی اعراض لازمہ کو ہے نہ کہ غیر لازمہ کو اور اعمال صالحہ ظاہر ہے کہ اعراض لازمہ نہیں بلکہ غیر لازمہ ہیں۔ ان کا بقاء تبعاً للمعروض بھی نہیں رہ سکتا، مثلاً نماز پڑھ کر یہاں فارغ ہوئے بس عمل ختم ہوا، اب اس کا بقاء نہ اصالۃً ہے نہ تبعاً۔

اس جگہ سب معقولی تھک گئے مگر علامہ جلال الدین دوانی نے رسالہ زوراء میں لکھا ہے کہ آخرت میں یہ اعراض جواہر ہوں گے یعنی جو عمل ہم کرتے ہیں وہ یہاں تو عرض ہے مگر عالم آخرت میں جو کہ مکاناً اس وقت بھی موجود ہے جواہر ہوں گے، فقط اور اس کے لیے یہ صورت جو ہر یہ صدور ہی کے وقت سے حاصل ہو جاتی ہے، اور وہ صورت جو ہر یہ باقی رہے گی، اب کوئی اشکال نہیں عارفین تو کشفی طور پر اس کے قائل ہی ہیں مگر ایک معقولی عقلی طور پر بھی اس کا قائل ہے اور عقلاً اس کو جائز وممکن سمجھتا ہے، تقریب الی الفہم کے لیے میں طلبہ کے واسطے ایک معقولی مثال سے اس کو واضح کرتا ہوں۔

وہ یہ کہ حصول اشیاء بانفسہا فی الذہن بہت سے حکماء کے نزدیک حق ہے اور ظاہر ہے کہ حصول بانفسہا سے مراد یہ تو نہیں ہے کہ بعینہ یہی شے جو خارج میں ہے ذہن میں حاصل ہوتی ہے، اگر بعینہ ہو تو تصور جبال سے ذہن کا انشقاق اور تصور نار سے احراق لازم ہوگا وغیرہ وغیرہ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیقت شے کی ذہن میں حاصل ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ حقیقت جوہر کی جوہر ہے حالانکہ صورۃ حاصلہ فی الذہن عرض ہے تو جو نسبت ذہن کو خارج سے ہے ہم کہتے ہیں کہ وہی نسبت دنیا کو

آخرت سے ہے، جس طرح اعراض ذہنیہ خارج میں جواہر ہیں اسی طرح اعراض دنیویہ آخرت میں جواہر ہوں تو اس کا اشکال کیا ہے۔

ایک نکتہ اس جگہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے الباقیات الصالحات نہیں، بلکہ باقیات صالحات فرمایا ہے، اس عنوان میں یہ بتلایا گیا ہے کہ ان اعمال میں ہر ہر عمل میں مستقل صلاحیت ہے، اس لیے صالحہ کا مصداق بھی متعدد ہو کر صالحات صادق آوے گا، یہ نہیں کہ مجموعہ میں صلاحیت ہوتا کہ ان کو مجموعہ بنا کر صالحہ صفت مفردہ سے تعبیر کیا جائے، یہاں سے ان لوگوں کو غلطی واضح ہو گئی جو بعض اعمال صالحہ کو حقیر سمجھتے ہیں۔

یہ سخت غلطی ہے بلکہ ہر عمل قابل وقعت ہے، حدیث میں آیا ہے کہ ایک بدکار عورت نے ایک کتّے کو پیاس کی حالت میں پانی پلایا تھا اس کی اسی عمل پر مغفرت ہو گئی، تو اب بتلایئے کیونکر کسی عمل کو حقیر سمجھا جائے، نہ معلوم ان کو کون سی بات پسند آجائے۔

تا یار کرا خواہد و ملیش بکہ باشد

یہاں سے سالکین کو سبق لینا چاہئے کیونکہ اہل ظاہر تو اپنے اعمال کو حقیر نہیں سمجھتے، بلکہ وہ تو اپنے ہر عمل کو اتنا بڑا سمجھتے ہیں کہ اس کے گھٹانے کی ضرورت پڑتی ہے، مگر اہل سلوک چونکہ مٹ چکے ہیں اسی لیے وہ اپنے کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے اعمال کو ہیچ، اور لاشے سمجھتے ہیں مگر اس میں بعض اوقات تواضع کے ساتھ ناشکری ہو جاتی ہے، پس دونوں کے جمع کے طریقہ یہ ہے کہ اپنے عمل کو اس حیثیت سے تو کچھ نہ سمجھو کہ تم نے کیا ہے، مگر اس حیثیت سے کے حق تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے

بڑی قدر کرنا چاہیے، خلاصہ یہ ہے کہ یوں سمجھو کہ ہم تو نالائق ہیں کسی قابل نہیں، مگر حق تعالیٰ کا فضل واحسان ہے کہ انہوں نے اپنے کرم سے یہ دولتیں ہم کو عطا فرمادی ہیں، اس صورت میں تواضع بھی ہے اور شکر بھی، پس اپنے اعمال کو مطلقاً ایسا حقیر نہ سمجھا جائے کہ نعمت حق کی ناشکری ہونے لگے۔

## اعمال پر نظر رکھیں احوال پر نہیں

الٰہ آباد میں ایک ولایتی بزرگ محمد شاہ صاحبؒ تھے، حافظ عبدالرحمٰن صاحب بگھری بیان کرتے تھے کہ میں ایک شخص کے ہمراہ ان کی زیارت کو گیا تو انہوں نے ساتھی سے پوچھا یہ کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ حافظ بھی ہیں، حاجی بھی ہیں، انہوں نے تواضعاً کہہ دیا کہ جی نہیں میں تو کچھ بھی نہیں، بس محمد شاہ ان کے سر ہو گئے اور کہا اچھا تم یہ چاہتے ہو کہ حق تعالیٰ تم سے حفظ کی دولت چھین لے، اور تمہارا حج باطل کر دیں، یہ بڑے چُپ ہوئے، پھر جب جاتے تو شاہ صاحب کہتے آؤ ناشکرا، آؤ ناشکرا۔

صاحبو! اگر یہی تواضع ہے تو نہ معلوم اپنے کو کیا بناؤ گے، کیونکہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ کمال ہے، اگر اپنے کو مسلمان کہو گے اس میں بھی کمال ہے، آدمی کہو گے اس میں بھی کمال ہے، بھنگی چمار کہو گے اس میں بھی کمال ہے، کیونکہ آخر تو وہ بھی آدمی ہیں، جانوروں سے تو اچھے ہیں، دوسرے بھنگی اور چماروں کے پاس ایسا کمال ہے کہ اگر وہ آج اپنا کام چھوڑ دیں تو سارا عالم پریشان ہو جائے اور بڑے بڑے امراء ان کی خوشامد کرنے لگیں۔

عجیب بات ہے کہ آج کل سالکین اعمال کی تو بے قدری کرتے ہیں، ہاں احوال کی قدر کرتے ہیں، چوبیس ہزار دفعہ ذکر اللہ کر کے جی خوش نہیں ہوتا، ہاں ذرا کچھ کشف ہو جائے، یا گریہ طاری ہو جائے، تو بس جامہ سے باہر ہیں، یہ کیسی نادانی کی بات ہے، یاد رکھو! اصل چیز اعمال ہی ہیں، یہی کام آنے والے ہیں، احوال کا کیا ہے، ہوئے یا نہ ہوئے، ہاں اگر اعمال کے ساتھ احوال بھی نصیب ہو جائیں، تو نور علی نور ہے، ورنہ صرف احوال کا اعتبار نہیں۔

ہمارے حضرت حاجی صاحبؒ سے جب کوئی شکایت کرتا کہ حضرت ذکر سے نفع نہیں ہوتا تو فرماتے یہ کیا تھوڑا نفع ہے کہ تم ذکر کر رہے ہو پھر یہ شعر پڑھتے ؎

یابم اورا یا نیابم جستجوئے می کنم
حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

غرض باقیات کے ساتھ صالحات کے جمع لانے میں ہر عمل کی وقعت کا اظہار ہے اور جب اعمال آخرت باقی رہنے والے ہیں اور اس کے مقابلہ میں مال و بنون کو زینت فرمایا گیا ہے تو اس لفظ سے اس پر تنبیہ ہے کہ یہ دنیا کی چیزیں فنا ہونے والی ہیں، اور جب دنیا کے اموال و اولاد فانی ہیں، تو اگر وہ آپ سے پہلے اور آپ کے سامنے ہی فنا ہو جائیں تو غم نہ کرو، کیونکہ وہ تو فنا ہونے والے تھے ہی بس ایسے فانی چیزوں کے متعلق تمہارا یہ حساب لگانا کہ یہ لڑکا اتنی عمر کا ہوگا تو اتنی تنخواہ کمائے گا، پھر اس کی شادی ہوگی، پھر اس کے بال بچے ہوں گے، یہ سارا حساب ایسا ہے جیسا دریا کے متعلق ایک بنئے نے حساب کیا تھا۔

جس کا قصہ یہ ہے کہ ایک لالہ جی گاڑی کرایہ کر کے اپنے کنبہ کو لے کر چلے تھے راستہ میں دریا آیا جو خوب چڑھا ہوا تھا، گاڑی بان نے کہا معلوم نہیں کتنا پانی ہے؟ ڈوبنے کا خطرہ ہے، بنئے نے ایک بانس لے کر ناپا کہ پانی کنارہ پر کتنا ہے اور بیچ میں کتنا؟ اور دوسرے کنارے کو پہلے پر قیاس کر لیا، سلیٹ پر حساب نکالا اور بیچ کی گہرائی کو دونوں کناروں کو تقسیم کر کے اوسط نکالا، کمر تک ہے اور گاڑی بان سے کہا کہ تم بے فکر ہو کر گاڑی ڈال دو، ہم نے اوسط نکال لیا ہے، کمر تک ہے، چنانچہ گاڑی ڈلوادی جب بیچ میں پہنچے تو لگے ڈوبنے، اب لالا جی نے اپنے حساب کو پھر دیکھا تو اوسط پھر وہی نکلا'' تو آپ کہتے ہیں لیکھا جوں کا توں، پھر کنبہ ڈوبا کیوں''؟ تو جیسے اس احمق نے حساب لگایا تھا کہ جیسے سلیٹ پر پانی کا اوسط نکل آیا ایسے ہی دریا میں بھی اوسط برابر ہو گیا ہوگا، ایسا ہی اولاد کے متعلق یہ تمہارا حساب ہے جس کو تم اپنے ذہن میں لگا کر یوں سمجھتے ہو کہ بس ایسا ہی ہوگا، حالانکہ وہاں ہوتا وہ ہے جو پہلے سے مقدر ہے تمہارا ہے، حساب سے کیا ہوتا ہے؟ اسی طرح اگر مال اور روپے ہلاک ہو جائیں تو غم نہ کرو، یوں سمجھ لو کہ یہ تو ہلاک ہونے والے ہی ہیں۔

بعضے مال کے ہلاک ہونے سے غم کرنے کی تاویل یہ کرتے ہیں کہ ہم اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں تو ہم کو ثواب ملتا ہے، میں کہتا ہوں اول تو یہ خیال ہی خیال ہے، ہلاک ہونے کے بعد ہی یہ خیال آتا ہے، اگر روپے گھر میں رہتے تو کبھی یہ خیال نہ آتا، اور اگر کسی کو واقعی یہ خیال ہو تو میں کہتا ہوں وہ شخص مطمئن رہے اس کو ثواب مل گیا، کیونکہ ثواب کا مدار نیت پر ہے، جب تم نے یہ نیت کر لی تھی کہ اس

کو اللہ کی راہ میں خرچ کریں گے تو ثواب اسی وقت مل گیا، اب چاہے خرچ کی نوبت آئے یا نہ آئے تمہارا ثواب ضائع نہیں ہوگا، پس اس وجہ سے بھی قلق نہ ہونا چاہیے۔

البتہ اعمال صالحہ اگر فوت ہوں اس کا قلق ہونا چاہیے مگر اس میں بھی ایک تفصیل ہے، وہ یہ کہ اعمال صالحہ کے فوت ہونے کا عوام تو جس قدر چاہیں قلق کریں ان کو تو مفید ہے، اور سالکین زیادہ اس کا بھی قلق نہ کریں بلکہ تھوڑی دیر تک رنج کر لیں پھر جی بھر کے توبہ کر لیں اور اپنے کام میں لگیں، اور ماضی کی فکر میں نہ پڑیں کہ ہائے یہ کام کیوں فوت ہوا، ہائے یہ خطا کیوں ہوئی، ہر وقت اسی کا شغل رکھنا سالک کو مضر ہے، کیونکہ یہ فکر ترقی تعلق مع اللہ میں حجاب ہوتا ہے، تعلق مع اللہ بڑھتا ہے نشاط قلب سے اور یہ قلق نشاط کو کم کر دیتا ہے لیکن تھوڑی دیر تک تو قلق کرنا چاہیے اور خوب رونا دھونا چاہیے تاکہ نفس کو کوتاہی کی سزا تو ملے، پھر توبہ کر کے اور اچھی طرح استغفار کر کے اس سے التفات کو قطع کرے اور کام میں لگے۔

آج کل زیادہ قلق کرنے میں ایک اور بھی نقصان ہے وہ یہ کہ قلق اس وقت بے حد ضعیف ہے، زیادہ قلق سے ان کا ضعف بڑھ جاتا ہے جس سے بعض اوقات تعطل کی نوبت آجاتی ہے جو کھلا ضرر ہے، بہر حال جب بعض منافع باقیہ کا فوت بھی زیادہ محل قلق نہیں تو منافع فانیہ یعنی منافع دنیویہ تو بالکل ہی محل قلق نہ ہوں گے تو ان پر تحسر بالکل ہی بے معنی ہے، خصوصاً جب کہ یہ بات ثابت ہے کہ مسلمان کی جو چیز بھی ضائع ہوتی ہے سب حق تعالیٰ کے ہاں جمع ہو جاتی ہے جس کا اسے ثواب ملتا ہے، یہاں تک کہ ایک کانٹا بھی لگتا ہے تو اس سے بھی ثواب ملتا ہے، اس جگہ اسی

اصل پر ایک آیت کی تفسیر سمجھ لو، بڑے کام کی بات ہے وہ یہ کہ ایک جگہ حق تعالیٰ نے دنیا کی مثال میں فرمایا ہے۔

مَثَلُ مَا يُنۡفِقُوۡنَ فِىۡ هٰذِهِ الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا كَمَثَلِ رِيۡحٍ فِيۡهَا صِرٌّ اَصَابَتۡ حَرۡثَ قَوۡمٍ ظَلَمُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ فَاَهۡلَكَتۡهُ‌ؕ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰـكِنۡ اَنۡفُسَهُمۡ يَظۡلِمُوۡنَ۔

حاصل ارشاد یہ ہے کہ کفار حیوۃ الدنیا میں جو خرچ کرتے ہیں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہ کافر قوم کی کھیتی پر پالہ پڑ جائے اور اس کو تباہ کردے، تو جیسے وہ کھیتی ہری بھری ہونے کے بعد بالکل ضائع ہو جاتی ہے یوں ہی کفار کا خرچ کیا ہوا مال بوجہ عدم ایمان کے ضائع محض ہوتا ہے، یہ تو آیت کا حاصل تھا، مگر سوال یہ ہے کہ اس مثال میں: حرث قوم ظلموا انفسهم، کیوں فرمایا؟ حالانکہ پالہ تو کافر کی کھیتی کو بھی تباہ کرتا ہے اور مسلمان کی کھیتی کو بھی، تو بات یہ ہے کہ مسلمان کی کھیتی کا پالہ سے کامل طور پر نقصان نہیں ہوتا، گو کھیتی برباد ہو جائے مگر اس مصیبت سے اجر صبر بڑھ جائے گا، اور آخرت میں جو ثواب اس کے بدلہ میں ملے گا وہ اس کھیتی سے لاکھ درجہ افضل ہوگا، کیونکہ اجر آخرت کی تو شان یہ ہے ۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
آنچہ در وہمت نیاید آں دہد

پس ضیاع اعمال کافر کے لیے کافی ہی کی کھیتی مثال ہو سکتی ہے کہ پالہ سے فنائے کامل اسی کو ہوتا ہے کیونکہ اس کا بدل بھی نہیں ملتا، مسلمان کو کامل اور حقیقی

نقصان نہیں ہوتا ،اس لیے: ظلموا انفسھم کہ قید بڑھا دی ،واللہ یہ بڑے مزے کی قید ہے اور مسلمانوں کے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ دنیا کے کسی نقصان سے بھی ان کا حقیقی نقصان نہیں ہوتا، حقیقی نقصان صرف کافر کو ہوتا ہے، مسلمان کے لیے ہر وقت خوشی اور مسرت ہی ہے، راحت میں بھی اور مصیبت میں بھی، غیر قومیں بھی تو کہا کرتی ہیں کہ مسلمان بڑھے تو امیر گھٹے، تو فقیر جن کی امیروں سے بھی زیادہ قدر ہے اور مر گئے تو پیر، اور دوسری قوم بڑھیں تو سپوت اور گھٹیں تو کپوت اور مریں تو بھوت کہ زندوں کو لپٹتے پھرتے ہیں مسلمان کی مراد حاصل ہو جائے تب تو خوشی ہی ہے اگر نامراد بھی رہے تب بھی خوشی ہے کیونکہ مولانا فرماتے ہیں۔

گر مرادت رامذاق شکرست
بے مرادی نے مراد دلبرست

اگر مراد میں مزا ہے تو بے مرادی میں ثواب ہے کیونکہ وہ حضرت حق کی مراد کے موافق ہے، عشاق کیلئے تو یہی بات خوش ہونے کو کافی ہے، گو ثواب بھی نہ ہوتا مگر اب تو ثواب بھی ہے، عشاق کو تو اسی سے خوشی ہوتی ہے کہ محبوب کی رضا اسی میں ہے، بس یہ سوچ کر بڑی سے بڑی مصیبت بھی خوشگوار ہو جاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات سے زیادہ مسلمانوں کیلئے کیا مصیبت ہوگی مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال پر بھی حضرت خضر علیہ السلام نے صحابہؓ کو اس طرح تسلی فرمائی تھی۔

اَنَّ فِي اللّٰهِ جَزَاءً مِّنْ كُلِّ مُصِيبَةٍ، وَخَلَفاً مِنْ كُلِّ فَائتٍ، فَبِاللّٰهِ فَثِقُوْا، وَإِيَّاهُ فَارْجُوا، فَاِنَّمَا الْمَحْرُوْمُ مَنْ حُرِمَ الثَّوَابَ۔ (سنن الکبریٰ للبیہقی)

یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات میں ہر مصیبت سے تسلی ہے، اور ہر فوت ہونے والے کا عوض ہے، پس اللہ پر بھروسہ رکھو، اور اسی سے امید رکھو، کیونکہ پورا محروم تو وہی ہے جو ثواب سے بھی محروم ہے، اور مسلمان کسی مصیبت میں ثواب سے محروم نہیں رہتا، جب اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی بدل ہے تو اور کیا رہ گیا، تو اب کوئی مصیبت ایسی نہیں جس سے خدا کے ہوتے ہوئے مسلمان پریشان ہو، ہاں دین میں کمی ہو تو قلق ہونا چاہئے، کیونکہ اس کا عوض کچھ نہیں مگر اس میں بھی اعتدال ہونا چاہئے، جیسا کہ اوپر بتلایا گیا کیونکہ نقصان دین کی تلافی بھی توبہ اور استغفار اور گریہ وزاری سے ہو سکتی ہے۔

اب میں آیت کا ترجمہ پھر کرتا ہوں اور چند باتیں اس کے متعلق بیان کر کے ختم کرنا چاہتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَالْبَاقِيَاتُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَخَيْرٌ أَمَلًا۔

کہ باقیات صالحات خدا کے پاس ثواب اور امید کے اعتبار سے بہتر ہیں یعنی اعمال صالحہ سے ثواب کے ساتھ بندہ کو حق تعالیٰ کے ساتھ امید بھی قائم ہو جاتی ہے کہ ان شاء اللہ وہ ہم سے راضی ہیں اور یہ امید بڑی چیز ہے، اس کی قدر اس شخص سے پوچھنا چاہئے، عشاق تو اسی امید کے بھروسہ جیتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

اگرچہ دور افتادم بدیں امید خرسندم
کہ شاید دست من بار دگر جانان من گیرد

اور یہ امید ہوسنا کی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ رجا ہے جس سے روح تازہ

اورزندہ ہوتی ہے جیسے ایک عاشق کا قصہ ہے کہ نزع کے وقت اسے محبوب کے آنے کی خبر ملی تو فرط شوق میں اٹھ بیٹھا، پھر معلوم ہوا کہ وہ دروازہ تک آ کر لوٹ گیا، یہ سنتے ہی گر پڑا، تو یہ رجاء وہ چیز ہے جس سے مرتے مرتے کو بھی ایک دفعہ حیات جدیدہ حاصل ہو جاتی ہے، مگر اس عشاق کا محبوب تو مجازی تھا، ظالم تھا، اسلئے اس کی رجاء ادھوری رہی، اور جن کو حق تعالیٰ سے رجاء ہو جو لم یزل ولا یزال ہیں اور رحیم وکریم وعاشق نواز ہیں ان کا کیا پوچھنا، واللہ! ان کیلئے تو اس رجاء کی بدولت ہر دم تازہ حیات ہے۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اعمال صالحہ میں نقد بھی ہے صرف ادھار ہی نہیں، ہاں ایک ادھار بھی ہے، یعنی ثواب اور اس کے ساتھ ایک چیز نقد ہے وہ یہی رجاء اور امید ہے جو بدون اعمال صالحہ کے حاصل نہیں ہوتی، اگر کسی مجرم کو امیدوار دیکھا جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ امیدوار نہیں ہے بلکہ ہوس ناک اور مبتلائے غلطی ہے، اور اگر سچ مچ امیدوار ہی ہو تو یقیناً اس کے پاس کوئی عمل صالح ہے جس کی بنا پر اس کو یہ رجاء حاصل ہے چاہے اور کچھ نہ ہو ایمان اور اسلام ہی ہو، کیونکہ ایمان افضل الاعمال الصالحہ ہے، باقی کسی کافر کو خدا سے صحیح امید نہیں ہو سکتی اس کو تو محض ہوس اور غرور ہی ہوگا، غرض اعمال صالحہ کا یہ ثمرہ نقد ہے۔

اور اسی طرح اعمال سیۂ کا بھی ایک ثمرہ ادھار ہے اور ایک نقد، ادھار تو عذاب جہنم ہے اور نقد وہ وحشت اور ظلمت اور بے چینی ہے، جو گناہوں کے لیے لازم ہے اسی واسطے بعض لوگوں نے تو کہہ دیا کہ جنت اور دوزخ ہر شخص کو اسی وقت

محیط ہیں، جس کے پاس اعمال صالحہ ہیں اس کو اسی وقت جنت محیط ہے ہیں، کیونکہ رجاء کی وجہ سے اس کو بہت بڑی راحت حاصل ہے اور جس کے پاس اعمال سیۂ ہیں اس کو اسی وقت دوزخ محیط ہے، کیونکہ گناہوں کی وحشت اور ظلمت سے دنیا میں بے چینی اور عذاب میں ہے۔

میں نے حضرت مولانا فضل الرحمن صاحبؒ سے خود سنا ہے فرمایا کہ بھائی جنت کا مزہ برحق، حوض کوثر کا مزا برحق، مگر نماز میں جو مزہ ہے وہ کسی چیز میں نہیں، اور سجدہ میں جاتے ہوئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ نے پیار کرلیا، سبحان اللہ جس شخص کو اعمال کی یہ لذت نصیب ہو اس کیلئے دنیا ہی میں جنت کیوں نہ ہوگی۔

## آخرت کا بدلہ ادھار ہے یا نقد؟

یہاں سے ان لوگوں کا جواب بھی ہوگیا جو کہا کرتے ہیں کہ آخرت دنیا سے افضل تو ہے، مگر وہ ادھار ہے، اور یہ نقد ہے، اور طبعاً انسان نقد کا عاشق ہے، اس لیے اضطراراً دنیا کو ترجیح دیتا ہے، میں کہتا ہوں اول تو یہی غلط ہے کہ نقد کو ہر حال میں ترجیح دی جاتی ہے، بھلا اگر کوئی آپ سے یہ کہے کہ اگر اس وقت مکان لینا چاہو تو یہ کچا گھر ملے گا، اور اگر سال بھر کے بعد تو بڑا عالیشان پختہ محل ملے گا، بتلائیے اس وقت آپ کس کو ترجیح یں گے، یقیناً سال بھر کے انتظار کو گوارا کریں گے۔

دوسرے یہ بھی غلط ہے کہ آخرت ادھار ہے، واللہ! اعمال آخرت کا ثمرہ نقد بھی ملتا ہے اور جن کو اس ثمرہ کا پتہ چل گیا ہے وہ ہفت اقلیم کی سلطنت پر بھی نگاہ نہیں

اٹھاتے وہ ثمرہ یہی ہے خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور ان سے امید کو وابستہ ہوجانا، اسی لئے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ اگر سلاطین دنیا کو اس دولت کی خبر ہو جائے جو ہمارے پاس ہے تو وہ تلوار لے کر ہمارے اوپر چڑھ آئیں اور اس دولت کو چھیننے کا ارادہ کریں حق تعالیٰ نے ایک مقام پر عمل صالحہ کے دو ثمرے بیان فرمائے ہیں۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ۔

یہ لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں، اور یہی لوگ پوری فلاح پانے والے ہیں، یعنی اعمال صالحہ کا ایک ثمرہ اخروی فلاح تو ہے ہی دوسرا ثمرۂ عاجلہ ہدایت بھی ہے، یہاں ظاہر میں شبہ ہوتا ہے کہ ہدایت کا ثمرہ ہونا کیسا مزا تو وہ ہے جس میں حظ ہو اور ہدایت تو خود عملی حالت ہے، اس میں کیا حظ ہوتا، مگر ایک حکایت سے آپ کو اس کا ثمرہ ہونا معلوم ہوجائے گا اور وہ قصہ خود مجھے پیش آیا۔

میں ایک دفعہ سہارنپور سے کانپور جا رہا تھا تو سہارنپور سے لکھنؤ جانے والی ریل میں سوار ہوا، اسی گاڑی میں میرے ایک دوست اور ہم وطن مگر جنٹلمین بھی پہلے سے سوار تھے، میں یہ سمجھا کہ شاید یہ بھی لکھنؤ جا رہے ہوں گے، کیونکہ ایک زمانہ میں ان کے تعلقات لکھنؤ میں بہت رہ چکے تھے، سردی کا موسم تھا اور وہ حضرت بیک بینی ودو گوش تھے، ساتھ نہ کمبل، نہ رضائی، کیونکہ آج کل جنٹلمینوں کے سفر کا اصول یہی ہے کہ سفر میں اسباب ساتھ نہیں لیتے، جب ریل چھوٹ گئی تو میں نے ان سے پوچھا کہ آپ لکھنؤ جائیں گے، کہنے لگے میں میرٹھ جا رہا ہوں، میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جا رہے ہوں لیکن میں افسوس کرتا ہوں یہ گاڑی

لکھنؤ جارہی ہے؟ میں نے انہیں کے محاورہ میں گفتگو کی، اب تو بڑے چونکے، کہنے لگے کیا یہ گاڑی لکھنؤ جارہی ہے، میں نے کہاہاں! پھر تو ان کی یہ حالت تھی کہ بار بار لاحول پڑھتے ہیں اورادھراُدھر دیکھتے جاتے ہیں، میں نے کہا میاں! اب تو رڑکی سے اس طرف یہ گاڑی ٹھہرتی نہیں، پریشان ہونے سے کیا حاصل، اطمینان سے بیٹھواور باتیں کروتو وہ جھلاّ کر کہتے ہیں کہ تم کو باتوں کی سوجھی ہےاور مجھے پریشانی ہورہی ہے۔

اس وقت میں نے اپنی اوران کی حالت میں غور کیا کہ حالانکہ میں ابھی تک منزل تک نہیں پہنچااقرابھی اپنے مقصود سے بہت دورنہیں ہوئے بلکہ لوٹتی گاڑی میں یہ اپنی منزل مقصود پر مجھ سے پہلے پہنچ جائیں گے،مگر پھر بھی مطمئن ہوں اور یہ غیر مطمئن،تو آخر میرے اطمینان اوران کی بےاطمینانی کا سبب کیا ہے،تو یہی معلوم ہوا کہ میرے اطمینان کا سبب یہ تھا کہ میں راہ پر تھا،اوران کی بےاطمینانی کا سبب یہ تھا کہ وہ راہ سے ہٹے ہوئے تھے،اس وقت ریل جس قدر مسافت طے کرتی تھی مجھے مسرت وراحت بڑھتی تھی،اوران کو ہر ہرقدم خارتھا۔

تو اس واقعہ سے آیت کی تفسیر واضح ہوئی کہ أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ بھی ایک بڑاثمرہ ہےاور ہدایت پر ہونا بڑی نعمت اور بڑی دولت ہے، یہ ثمرہ دنیامیں ہرمسلمان کوحاصل ہے کافرکو یہ بات نصیب نہیں۔

# مدرسہ وہی ہے جس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ عمل کی بھی تربیت ہو

پھر مزید برآں یہ بات سونے پر سہاگہ ہے کہ اعمال صالحہ باقیات صالحات بھی ہیں کہ آخرت میں ان کا اجر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے باقی رہنے والا ہے، پھر اس بقا میں بھی تفصیل ہے کہ بعض اعمال تو مطلقاً باقیات ہیں اور بعض کو ابقیٰ کہنا چاہئے جیسے مدرسہ اور خانقاہ کہ یہ صدقات جاریہ ہیں، یعنی بعض اعمال کی تو یہ حالت ہے کہ زندگی کے بعد اُن کا ثواب نہیں بڑھتا، بس جتنا ثواب زندگی میں کما چکے ہو اور وہی باقی رہے گا، اب اس میں ترقی نہ ہوگی اور صدقات جاریہ کا ثواب مرنے کے بعد بھی برابر بڑھتا ہے، تم قبر میں پڑے سو رہے ہوگے اور اُس وقت بھی فرشتہ نامۂ اعمال میں ثواب لکھتے ہوں گے، تو مدرسہ اور خانقاہ کی بناء ایسے ہی اعمال ہیں، جن کا ثواب مرنے کے بعد بھی جاری رہتا ہے، مگر آج کل خانقاہ بنانے والوں کو چاہئے خانقاہ کے نام سے نہ بنائیں، بلکہ مدرسہ ہی کے نام سے بنائیں، اور اس میں کام کریں خانقاہ کا کیونکہ ایک تو خانقاہ کے نام سے شہرت زیادہ ہوتی ہے، دوسرے بعد میں خانقاہ کے اندر بدعات ہونے لگتی ہیں، کوئی عرس کرتا ہے، کوئی قوالی کرتا ہے، پھر گدی نشینی کا قصہ ہوتا ہے، جس میں جھگڑے اور فساد ہوتے ہیں، اس سے بہتر یہ ہے کہ خانقاہ کا نام نہ کیا جائے، بلکہ مدرسہ بناؤ اور اس میں ترتیب اخلاق اور تعلیم سلوک کا کام کرو کہ وہی حقیقی مدرسہ بھی ہوگا، اور وہی خانقاہ بھی ہوگی، پس حقیقی

مدرسہ وہ ہے جس میں علم کے ساتھ عمل کی بھی تعلیم اور نگہداشت ہو، پس اے مدرسہ والو! تم اپنے مدرسوں کی سنبھال کرا وران کو حقیقی مدرسہ بناؤ یعنی طلبہ کے اعمال کی بھی نگہداشت کرو ورنہ یادرکھو۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔

کے قاعدہ پر آپ سے اس کے متعلق سوال ہوگا کیونکہ آپ طلبہ کے نگہبان ہیں، اور وہ آپ کی رعایا ہیں، پس یہ جائز نہیں کہ آپ طلبہ کو سبق پڑھا کر الگ ہوجائیں، بلکہ یہ بھی دیکھتے رہو کہ اُن میں سے کون علم پر عمل کرتا ہے اور کون عمل نہیں کرتا، جس کو عمل کا اہتمام ہو اُسے پڑھاؤ ورنہ مدرسہ سے نکال باہر کرو، جب تو آپ کا مدرسہ واقعی دارالعلم ہوگا ورنہ وہ دارعلم بلغت فارسی ہوگا کہ اس میں علم کو سولی دی گئی ہے، طلبہ کے تمام افعال کی نگہداشت کرو، ان کو لباس اہل علم کی ہدایت کرو، ورنہ مدرسہ سے الگ کرو، چاہے مشابہت تامہ ہو یا مشابہت ناقصہ، سب کا انتظام کرو، اوران سے صاف کہہ دو۔

یامکن باپلبیا ناں دوستی!
یابنا کن خانہ برانداز پیل

## تم روز پیشاب ہی کرلیا کرو پاخانہ مت کرو

اب عوام کو خطاب کرتا ہوں کہ آپ مدرسہ کی خدمت کریں، جس کام میں بھی آپ امداد کریں یہ تمام باقیات الصالحات ہوں گے، بعض لوگ صرف تعلیم کی امداد کو وصدقہ جاریہ سمجھتے ہیں، یہ غلط ہے، بلکہ مدرسہ کی تعمیر اور طلباء کے کھانے پینے اور

کپڑے کی امداد سب صدقات جاریہ ہیں، کیونکہ سب سے تعلیم ہی کو امداد پہنچتی ہے۔ پھر جب یہ لوگ پڑھ کر فارغ ہوں گے اور مخلوق کو جا کر تعلیم دیں گے تو ہمیشہ آپ کو اس کا ثواب ملتا رہے گا، جب تک اس مدرسہ کے طلبا سے علم کا فیض چلے گا برابر آپ کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا، تو یہ کتنی خوشی کی بات ہے کہ مدرسہ کی امداد تو آپ نے پچاس برس تک یا کسی کی بہت عمر ہوئی تو سو برس تک کی اور نامۂ اعمال میں ثواب لکھا گیا، ہزار برس تک بلکہ قرب قیامت تک ان شاء اللہ علم کا چرچہ دنیا میں رہے گا اور اگر اپنی زندگی میں آپ نے ان کاموں میں امداد نہ کی تو روپیہ تو صرف ہو ہی جائے گا وہ تو باقی نہ رہے گا، مگر فضول یا ناجائز مواقع میں صرف ہوگا، یا بعد میں ورثاء رنگچھرے اڑائیں گے اور ان گناہوں کے آثار آپ کے نامۂ اعمال میں باقی رہیں گے۔

جیسے ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ روز بستر پر پیشاب کر لیا کرتا تھا، اس کی بیوی نے ملامت کی کہ یہ کیا خرافات ہے کہ تم اتنے بڑے ہو کر بستر پر پیشاب کرتے ہو، روز بستر کو دھوتی دھوتی تھک گئی، کہنے لگا کیا بتاؤں رات کو ہر روز شیطان خواب میں آتا ہے کہ آؤ تمہیں سیر کرا لاؤں پھر کہیں راستہ میں پیشاب کی ضرورت ہو جاتی ہے تو میں خواب کے اندر قدمچہ پر بیٹھ کر پیشاب کرتا ہوں وہ بستر پر نکل جاتا ہے۔ بیوی کہنے لگی کہ جب شیطان تمہارا اتنا بڑا دوست ہے تو آج اس سے یہ کہنا کہ تیری دوستی کس کام آئے گی، ہم غریب آدمی ہیں کہیں سے ہم کو بہت سے روپے دلوا دے، مرد نے کہا، بہت اچھا آج ضرور کہوں گا، چنانچہ رات ہوئی

اور شیطان آیا تو اپنی بیوی کا پیغام پہنچایا، شیطان نے کہا تمہارے واسطے روپے بہت، ایک خزانہ میں اس کو لے گیا اور اس کی کمر پر اتنے روپے لادے کہ میاں کا پاخانہ نکل گیا، صبح کو جو آنکھ کھلی تو بستر ے پر پاخانہ تو موجود اور روپے غائب، بیوی نے کہا یہ کیا؟ اپنا سارقصہ سنایا، وہ کہنے لگی بس جی میں ایسے روپوں سے باز آئی تم روز پیشاب ہی کرلیا کرو پاخانہ مت کرو۔

تو اسی طرح گناہ کے کاموں میں روپیہ صرف کرنے کا یہ انجام ہوگا کہ روپیہ تو غائب ہو جائے گا اور نامۂ اعمال میں اس کے گناہ باقی رہیں گے، پھر جہنم کا عذاب الگ رہا، اس لیے ضرورت ہے کہ اعمال صالحہ کا اہتمام کرو اور اپنی کمائی کو اچھے موقع پر صرف کرو اور گناہوں سے بچنے کا اہتمام کرو اور حق تعالیٰ کی رضا اور اس کی اطاعت میں کوشش کرو۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص ر ۷ ۵۴ تا ۵۶۳)

## احکام شرعیہ ہی پر فلاح دنیا کا ترتب ہوتا ہے

صحیح مذہب یہ ہے کہ احکام شریعہ پر فلاح دنیا کا ترتب تو ہوتا ہے مگر یہ مقصود نہیں، اور اگر کوئی شخص اعمال صالحہ سے دنیا کو مخصوص سمجھے گا اور مصالح دنیویہ کے لیے ان کو اختیار کرے گا تو وہ اعمال صالحہ نہیں رہیں گے، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

إِنَّمَا الأَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ، وَإِنَّمَا لِكُلِّ امْرِئٍ مَا نَوَى، فَمَنْ كَانَتْ هِجْرَتُهُ إِلَى دُنْيَا يُصِيبُهَا، أَوْ إِلَى امْرَأَةٍ يَنْكِحُهَا، فَهِجْرَتُهُ إِلَى مَا هَاجَرَ إِلَيْهِ۔ (متفق علیہ)

کہ اعمال کا اعتبار نیت سے ہے اور ہر شخص کو وہی ملے گا جو اسے مقصود ہے اگر کوئی اللہ اور رسول کے واسطے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت تو واقعی اللہ ورسول کے واسطے ہے، اور مقبول ہے، اور جو کوئی دنیا کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے ہجرت کرے تو اس کی ہجرت خدا اور رسول کی طرف نہیں، بلکہ اسی چیز کی طرف ہے جس کی اس نے نیت کی ہے، اس سے صاف فیصلہ ہو گیا کہ دنیا کو اعمال صالحہ میں مخصوص سمجھنے سے اعمال صالحہ باقی نہیں رہتے، بلکہ صرف اعمال کی نقل رہ جاتی ہے، پس اعمال شرعیہ سے دنیا کو غرض بنانا تو ناجائز ہے مگر تبعاً طاعات سے فلاح دنیوی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ (خطباتِ حکیم الامتؒ ص ۵۹۴ تا ۵۹۵)

## مجذوب سے نہ دین کا نفع ہے نہ دنیا کا

اگر ان میں سے کوئی سچ مچ بھی مجذوب ہو تو تمہیں اس سے کیا نفع دین کا نفع نہ ہونا تو ظاہر ہی ہے، دنیا کا بھی ان سے کچھ نفع نہیں، لوگ سمجھتے ہیں کہ مجذوب سیف زبان ہوتے ہیں، جو کہہ دیتے ہیں وہی ہو جاتا ہے، تو سمجھو کہ ان کی زبان سے نکلتا وہی ہے جو ہونے والا ہوتا ہے، ان کے کہنے کو وقوع میں کچھ دخل نہیں، اس میں بھی لوگوں کی نادانی ہے کہ ان کی باتوں کو وقوع کا سبب سمجھتے ہیں حالانکہ وہ اپنے اختیار سے کوئی بات بھی نہیں کہہ سکتے، ان کے منہ سے وہی نکلتا ہے جو ہونے والا ہے، اگر وہ نہ کہتے جب بھی اس کا وقوع ضرور ہوتا، تو جب مجذوبوں سے نہ دین کا نفع ہے نہ دنیا کا، پھر تو مفت میں وہاں جا کر گالیاں کیوں کھاتے ہو، عجب بات ہے

کہ جو بزرگ خوش اخلاقی سے ملیں، ان سے تو عوام بھاگتے ہیں اور جو بات بات میں گالیاں دیں ان کو لپٹتے ہیں۔

## کچھ لوگوں کی بیوی ان کو بھڑوے کہہ کر جوتے بھی مارتی ہے

وہی قصہ ہو گیا جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ اس کی بیوی نہایت حسین تھی مگر وہ اسے منہ نہ لگاتا تھا، بلکہ ایک رنڈی سے پھنسا ہوا تھا بیوی کو فکر ہوئی کہ دیکھنا چاہئے، دیکھا تو صورت میں ناک بھی نہ تھی مگر حالت یہ تھی کہ میاں جب اس کے پاس پہنچے تو اس نے دو چار جوتے لگائے کہ بھڑوے کہاں تھا، اتنے دیر کہاں لگائی، وہ جوتے مارتی اور یہ خوشامدیں کرتا بیوی نے سمجھ لیا کہ اس مرد کے لیے اس انداز کی ضرورت ہے، چنانچہ اس کے بعد جو مرد گھر میں آیا تو بیوی نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ دو چار جوتے لگائے اور گالیاں برسانے لگی تو مرد ہنس کر کہنے لگا کہ جی تیرے اندر بس اسی کی کسر تھی، اب سے میں کہیں نہ جاؤں گا تو واقعی لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانا کرتے، بعض آدمی اس کے مشتاق ہوتے ہیں کہ گالیاں کھائیں بُرا بھلا سنائیں، سو یہ طریقہ تو سب کو آتا ہے مگر تہذیب معنی ہوتی ہے۔

بعض لوگ مجذوبوں سے دعا کے واسطے کہتے ہیں تو یاد رکھو وہ کسی کے واسطے دعا نہیں کرتے، وہاں دعا کا محکمہ ہی نہیں بلکہ وہ تو دیکھتے ہیں کہ حکم کیا ہو رہا ہے، مولانا اس کی بابت فرماتے ہیں۔

کفر باشد نزد شاں کردن دُعا
کاے خدا از ما بگرداں ایں قضاء

## مجذوب اور سالک میں فرق

خوب سمجھ لیجئے کہ ایک تو کوتوال ہوتا ہے اور ایک ہوتا ہے مصاحب، تو کوتوال کی یہ مجال نہیں کہ وہ کسی مجرم کی سفارش کر دے وہ تو حکم کا تابع ہے جس کے لیے سزا کا حکم ہوا، سزا کر دیتا ہے اور جس کے لیے رہائی کا حکم ہو گیا، اُسے رہا کر دیتا ہے اور مصاحب کو سفارش کا اختیار ہوتا ہے وہ بڑے سے بڑے مجرم کی سفارش کر سکتا ہے۔

تو مجذوبوں کا درجہ تو کوتوال کا سا ہے وہ سفارش اور دعا نہیں کر سکتے، اور سالک کی حالت دوسری ہے، یعنی اُن میں مصاحبت کی شان ہوتی ہے وہ دعا اور سفارش کر سکتے ہیں تو ان کے اختیارات زیادہ نہیں ہوتے مگر مقبول یہی زیادہ ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے سلطان محمد کے سامنے تو ایاز تھا اور ایک حسن میمندی، حسن میمندی کے اختیارات بہت کچھ تھے کیونکہ وزیر اعظم تھا اور ایاز کے اختیارات باضابطہ کچھ نہ تھے کیونکہ وہ کسی عہدہ پر معین نہ تھا

مگر مقبولیت اور قرب کی یہ حالت تھی کہ جب محمد کو کسی بات پر غصہ آ جاتا تو کس کو دم مارنے کی مجال نہ تھی او حسن میمندی کے سب اختیارات رکھے رہ جاتے، اس وقت سب لوگ ایاز ہی کی خوشامدیں کرتے تھے کہ اس وقت سلطان سے تمہارے سوا کوئی بات نہیں کر سکتا۔

پس سالکین کی وہ شان ہے جو ایاز کی شان تھی، یہ ہر وقت دعا اور سفارش کر سکتے ہیں تو دنیا بھی انہی کے پاس سے ملتی ہے اور ملنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ خود تم کو خزانے دے دیں گے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ حاکم سے عرض کر دیں گے اور دین تو انہی میں منحصر ہے، مگر لوگوں نے عجیب خلط ملط کر رکھا ہے کہ مجذوبوں سے دنیا بھی طلب کرتے ہیں اور دین بھی، حالانکہ ان کے اختیار میں کچھ بھی نہیں، گو وہ صاحب ولایت ہوتے ہیں مگر کسی کو کچھ دے نہیں سکتے، اور یہ بھی جب ہے کہ وہ مجذوب ہوں اور صاحب حال ہوں، اور اگر صاحب حال نہ ہوں جیسے آج کل عموماً بھنگڑ سنگڑ پھرتے ہیں، تو وہ صاحب ولایت بھی نہیں بلکہ ان میں بعض تو پاگل سڑی ہوتے ہیں اور بعضے بنے ہوئے ہوتے ہیں، وہ تو پورے شیطان ہیں اور صاحب حال کی پہچان اہل علم کے لئے یہ ہے کہ اس کے پاس بیٹھ کر خدا کی یہ ہے کہ خدا کی محبت زیادہ ہو اور دنیا کی محبت کم ہو، اب دیکھئے ان بھنگڑوں کے پاس جا کر بھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ ہرگز نہیں!

پس خوب سمجھ لو کہ ہر مجنون مجذوب نہیں، اور اگر کوئی ہو بھی تو وہاں نہ دنیا ہے نہ دین، دنیا تو اس لئے نہیں کہ وہ دعا نہیں کر سکتا اور دین اس لیئے نہیں کہ ان کے پاس تعلیم نہیں، پس ان کی زیارت تو کرو، وہ بھی جب کہ ان میں صاحب حال ہونے کی علامت موجود ہو جس کو اہل علم ہی سمجھ سکتے ہیں ورنہ جاہل کو تو مجذوب اور مجنون میں فرق نہیں معلوم ہو سکتا، مگر زیارت کے سوا کوئی تعلق نہ رکھو، حتیٰ کہ میں تو اہل علم کو بھی خاص طور پر یہی کہتا ہوں۔ (خطباتِ حکیم الامتؒ ص/ ۶۰۵ تا ۶۰۷)

سو خوب سمجھ لو کہ یہ خیال بالکل غلط ہے، دین ہرگز فلاح دنیا اور ترقی دنیا کے

لیے مانع نہیں ہے اور دین دار بن کر بھی تجارت وزراعت ہو سکتی ہے مگر اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہ ذریعۂ معاش دین کے خلاف نہ ہو تب تو وہ دنیا نہیں ہے بلکہ عین دین ہے کیونکہ حدیث میں ہے۔

كسب الحلال فريضة من بعد الفريضة۔

اس صورت میں تجارت وزراعت بھی باعث ثواب ہے بلکہ ان کاموں میں مشغول ہو کر دین کی پابندی کرنا یہ نرے ذکر وشغل سے افضل ہے۔

## اچھی نیت کی برکت دیکھئے

چنانچہ ایک بزرگ کا انتقال ہوا جو بہت بڑے تارک اور زاہد اور صوفی تھے، انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، فرمایا مجھے بخش دیا گیا، مگر بھائی ہمارے پڑوس میں جو ایک مزدور صاحب عیال رہتا تھا وہ ہم سے افضل رہا، کیونکہ وہ رات دن اپنے بال بچوں کے لیے محنت مزدوری کرتا اور ذکر وشغل کم کرتا تھا، مگر ہر وقت اس کی تمنا یہ تھی کہ فرصت ملے تو میری طرح ذکر میں مشغول ہو، حق تعالیٰ نے اس نیت کی برکت سے اس کی وہ درجہ عطا کیا جو مجھے بھی نصیب نہیں ہوا۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسب حلال کے ساتھ احکام الٰہیہ کی پابندی کرنا نرے ذکر وشغل ہونے سے بعض دفع افضل ہو جاتا ہے، مگر اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ سب کے لیے یہی طریقہ افضل ہے اور بس ہر شخص اسی طریقے کو اختیار کر لے بات

یہ ہے کہ مصالح باہم متعارض ہیں کسی کے لیے ایک طریق مصلحت ہے اور کسی کے لیے مفسدہ ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طب میں ایک ایک مرض کے لیے متعدد دوائیں نافع ہوتی ہیں، مگر ہر دوا ہر شخص کے لیے مفید نہیں ہوتیں، بلکہ اس میں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہر شخص کے مزاج کا لحاظ کر کے چند دواؤں میں سے ایک کو منتخب کیا جائے اور اس کے ساتھ کچھ اور دوائیں بھی ملائی جائیں جو اس کی مضرتوں کی اصلاح کر دے اور نفع کو قوی کر دیں۔

ان سب باتوں کا لحاظ کر کے نسخہ مرتب کرتا ہے اب اگر کوئی مریض حکیم کے نسخہ کو چھوڑ دے اور اس میں سے صرف ایک دوا کو چھانٹ لے تو یہ اس کی غلطی ہے، اس طرح وہ کبھی شفایاب نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ خود دوا جو اس نے منتخب کی ہے اس مرض کو مفید ہے، مگر اس مریض کے مزاج کے لحاظ سے اس کے ساتھ بدرقہ اور مصلح کی ضرورت تھی جس کے بغیر یہ دوا مرض کو زائل نہیں کرسکتی۔

اسی طرح باطن میں بھی ہر مریض کو شیخ کی تجویز کا اتباع ضروری ہے، اپنی رائے سے کسی طریق کے تجویز کر لینے کا اسے حق نہیں۔

کیونکہ جس طریق کو شیخ تجویز کرتا ہے حق تعالیٰ اس کو طالب کے مناسب ہی کر دیتے ہیں اس طریق کا مناسب ہونا یا غیر مناسب ہونا تو دراصل حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے، اور وہیں سے سب کچھ ملتا ہے، مگر وہ اکثر مشائخ کاملین کے دل میں ہر ایک کے مناسب ایک بات ڈال دیتے ہیں کہ اس مریض کے لیے فلاں طریق تجویز کرنا مناسب ہے۔

# قرب کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ گھر پر

## نماز پڑھو اور حرم کو ترسو

ایک شخص حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ میں بیمار ہو گیا تھا، کئی وقت سے حرم میں جا کر نماز بھی نہ پڑھ سکا، اس کا بہت رنج ہے، حضرت نے فرمایا کہ قرب کے طریقے مختلف ہیں یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ گھر پر نماز پڑھو، اور حرم کی حاضری کو ترسو، جس حال میں رکھیں اسی میں راضی رہنا چاہئے۔

پھر فرمایا کہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے حج کو بمبئی سے بھی جاتے ہیں اور کراچی سے بھی، اگر بمبئی سے چلے جاؤ اور وہ کراچی سے بلا ویں تو کراچی سے چلے جاؤ، مقصود دونوں حالتوں میں حاصل ہے اسی کو فرماتے ہیں ؎

چوں کہ برمیخت بہ بندوبستہ باش
چوں کشاید چابک وبرجستہ باش

اسی طرح اگر حق تعالیٰ کسی کو اسباب میں رکھیں، اسباب میں رہو اور ترک اسباب میں رکھیں تو اسی میں رہو، چنانچہ اگر کوئی شخص زراعت وتجارت اس طرح کرے کہ وہ دین کے موافق ہو، کوئی بات خلاف شرع نہ ہو تو یہ عین ثواب ہے اور اس حالت میں یہ دنیا نہیں بلکہ عین دین ہے، ہاں اگر کوئی بات دین کے خلاف ہے تو البتہ یہ دنیا ہے، جو دین کے مضر ہے، پس یہ خیال غلط ہے، جو عام طور پر لوگوں

کے دل میں جما ہوا ہے کہ دین کے ساتھ دنیا کے کام نہیں ہو سکتے اور دنیوی فلاح بدون ترک دین کے حاصل نہیں ہوسکتی، خدا تعالیٰ کا کلام اس خیال کو غلط بتلا رہا ہے، کیونکہ یہاں حق تعالیٰ نے چند احکام بیان فرما کر لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ، فرمایا ہے جو اپنے عموم سے فلاح دنیوی کو بھی شامل ہے۔

## فلاح کی تعریف

اس میں غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ یہ اعمال شرعیہ فلاح اخروی کا طریق تو ہیں ہی مگر فلاح دنیوی بھی ان کو لازم ہے، لیکن سب سے پہلے فلاح کی حقیقت سمجھنا چاہیے، تو سمجھو کہ فلاح کہتے ہیں کامیابی کو نہ کہ مالیابی کو، آج کل لوگوں نے کثرت مال کو فلاح سمجھ لیا ہے یہ غلط ہے، دیکھئے قارون کو بہت لوگ صاحب نصیب اور صاحب فلاح سمجھتے تھے وہ بھی اسی خیال کے لوگ تھے، جیسے آج کل بعض لوگوں کا خیال ہے، چنانچہ جب وہ اپنے حشم وخدم لے کر ساز وسامان کے ساتھ نکلا ہے تو ان لوگوں کی رال ٹپک پڑی اور کہنے لگے۔

یٰلَیۡتَ لَنَا مِثۡلَ مَاۤ اُوۡتِیَ قَارُوۡنُ اِنَّهٗ لَذُوۡ حَظٍّ عَظِیۡمٍ۔

کیا خوب ہوتا کہ ہم کو بھی وہ ساز وسامان ملا ہوتا جیسا قارون کو ملا ہے، واقعی وہ بڑا صاحب نصیب ہے تو اس وقت جو عقلاء تھے انہوں نے ان لوگوں کو ان کی غلطی پر متنبہ کیا اور بتلایا کہ فلاح اور خوش نصیبی کثرت مال سے نہیں ہے بلکہ یہ تو اطاعت خداوندی سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّلَا يُلَقَّاهَا إِلَّا الصَّابِرُوْنَ۔

اور جن لوگوں کو فہم عطا ہوا تھا وہ کہنے لگے کہ ارے تمہارا ناس ہو تم اس مال اور سامان پر کیا للچاتے ہو، اللہ تعالیٰ کا ثواب ہزار درجہ اس سے بہتر ہے جو ایسے شخص کو ملتا ہے کہ ایمان لائے اور نیک عمل کرے اور وہ کامل طور پر انہی لوگوں کو دیا جاتا ہے جو (دنیوی حرص وطمع) سے صبر کرنے والے ہیں، اس جواب سے معلوم ہو گیا کہ کثرت مال سے خوش نصیبی اور فلاح نہیں ہوتی، بلکہ دنیا کی فلاں اور خوش نصیبی بھی اطاعت الٰہیہ ہی سے حاصل ہوتی ہے، اس زمانہ کے عوام عقلاً تو اس جواب سے خاموش ہو گئے ہوں گے مگر شاید کسی کو دلیل حسی کا انتظار رہا ہو تو وہ زمانہ عجیب تھا کہ بات بات کے لیے دلائل وآیات ظاہر ہوتی تھیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ایسی نشانی ظاہر کر دی جس سے دنیا داروں کو بھی اقرار کرنا پڑا کہ واقعی خدا تعالیٰ کی نافرمانی کرنے والوں کو دنیوی فلاح بھی حاصل نہیں ہوسکتی، وہ کیسے ہی مالدار ہوں، بلکہ دنیا میں بھی خوش نصیب اور صاحب فلاح دین دار ہی ہیں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

فَخَسَفْنَا بِهِ وَبِدَارِهِ الْأَرْضَ فَمَا كَانَ لَهُ مِنْ فِئَةٍ يَّنْصُرُوْنَهُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُنْتَصِرِيْنَ، وَأَصْبَحَ الَّذِيْنَ تَمَنَّوْا مَكَانَهُ بِالْأَمْسِ يَقُوْلُوْنَ وَيْكَأَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ وَيَقْدِرُ لَوْلَا أَنْ مَّنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا لَخَسَفَ بِنَا وَيْكَأَنَّهُ لَا يُفْلِحُ الْكَافِرُوْنَ۔

پھر ہم نے قارون کو اور اس کے محل سرائے کو زمین میں دھنسا دیا، سو کوئی

ایسی جماعت نہ ہوئی جواس کواللہ کے عذاب سے بچالیتی اور نہ وہ خود ہی اپنے آپ کو بچاسکا، اورکل جولوگ اس جیسا ہونے کی تمنا کررہے تھے وہ آج اس کو دھنسا ہوا دیکھ کر کہنے لگے کہ بس جی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہے زیادہ روزی دے دیتا ہےاور جس کو چاہے تنگی سے دیتا ہے، یہ ہماری غلطی تھی کہ ہم کثرت مال کوخوش نصیبی سمجھتے تھے،بس جی خوش نصیبی اور بدنصیبی کا مداراس پرنہیں، بلکہ یہ تومحض کسی حکمت کی وجہ سے ہے، اگرہم پر اللہ تعالیٰ کی مہربانی نہ ہوتی تو ہم کو بھی دھنسادیتا، کیونکہ دنیا کے گناہ میں ہم بھی مبتلا ہو گئے تھے،بس جی معلوم ہوا کہ کافروں کو فلاح نہیں ہوتی وہ چند روز مزے لوٹ لیں مگر انجام پھر ناکامی اور خسران ہی ہے، اس میں حق تعالیٰ نے دنیاداروں کا قول نقل فرمایا ہے کہ آخر کے انہوں نے بھی اقرار کرلیا کہ کافروں کوفلاح اور کامیابی نہیں ہوتی، اور یقیناً قارون کی جوحالت آخرمیں ہوئی اس کودیکھ کرکیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ قارون کا کامیاب تھا ،ہرگزنہیں، ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ مالیاب تھا یہ معلوم ہوگیا کہ فلاح کامیابی کا نام ہے نہ مالیابی کا۔

یہ ضرورنہیں کہ جوشخص مالیاب ہووہ کامیاب بھی ہو،مگرعجیب اندھیر ہے کہ آج کل لوگ تمول ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں، حالانکہ مال خودمقصودنہیں، بلکہ یہ تومقصود کا وسیلہ ہے،مال توایسا ہے جیسے بادام کا خول اورمقصود ایسا ہے جیسے بادام کا مغز،تو بڑا نادان ہے وہ شخص جوچھلکوں کومقصود سمجھے اورانہی کوجمع کرنے میں ساری عمر گنوادے،اس کی دماغ کے بادام سے خاک بھی قوت حاصل نہ ہوگی،اوریقیناً وہ

مقصود سے نا کام رہے گا، اور جو شخص مغز کو مقصود سمجھے اور اسی کو جمع کرے گا اس کے پاس چھلکا ایک بھی نہ ہو وہ کامیاب ہے اس کے دماغ میں بے شک قوت پہنچے گی اب سمجھو کہ اصل مقصود کیا ہے تو سب جانتے ہیں کہ مال آرام وراحت کے لیے جمع کیا جاتا ہے پس راحت وآرام اصل چیز ہے اور یہی مغز ہے، اب میں پوچھتا ہوں کہ اگر کسی کو بدون مال کے آرام وچین حاصل ہو تو وہ کامیاب ہو گیا نہیں یقینا وہ کامیاب ہے۔

اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے کسی کے پاس بادام کی گڑیاں موجود ہیں گو چھلکے نہ ہوں اور اگر کسی کو باوجود کثرت مال کے آرام وچین نصیب نہ ہو تو بتلایئے وہ ناکام ہے یا نہیں، یقیناً وہ ناکام ہے اور بے چینی کے ساتھ اس کے پاس مال کا جمع ہونا ہے ایسا جیسے کسی کے پاس بادام کی چھلکے جمع ہوں جن میں مغز کا نام نہ ہو۔

## مجھے کوئی دیندار دنیوی آسائش سے محروم دکھا دیجئے؟

تو میں دعویٰ کے ساتھ کہتا ہوں کہ مطیع خدا کے برابر دنیا کا آرام وچین بھی کسی کو حاصل نہیں ہوتا، اس کو وہ راحت ہے جو کسی بادشاہ کو بھی نصیب نہیں، مجھے آپ کوئی دیندار دنیوی آسائش سے محروم دکھا دیجئے، اور میں دنیا دار ہزاروں آرام سے محروم بتلاتا ہوں، ہر وقت سینکڑوں تشویشات اور ہزاروں افکار میں مبتلا ہیں۔

## مجھ کو امیروں پر غریبوں سے زیادہ رحم آتا ہے

میں بقسم کہتا ہوں کہ مجھ کو امیروں پر غریبوں سے زیادہ رحم آتا ہے، کیونکہ

غریبوں کو اتنے افکار نہیں ہیں، جتنے امراء کو ہیں ہمارے اکثر بھائی چندوں میں امیروں کی گردنیں دباتے ہیں، اوران سے زیادہ وصول کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ ظاہر میں وہ غریبوں سے زیادہ مالدار ہیں مگر مجھے ان پر رحم آتا ہے، کیونکہ جیسا مال ان کے پاس زیادہ ہے ویسے ہی ان کے افکار بھی زیادہ ہیں، اور خرچ بھی بہت ہیں، مثلاً کسی کی آمدنی پانچ سو روپیہ ماہوار کی ہے تو اس کے اخراجات سات سو روپے ماہوار کے ہیں، اور خرچ کا آمدنی سے زیادہ ہونا جڑ ہے کلفت اور پریشانی کی اور جو لوگ غریب ہیں ان کی آمدنی اور خرچ عموماً برابر ہے، جتنا کما لیا وہی کھا لیا پہن لیا، بلکہ اس میں سے بھی بعض دفعہ کچھ بچا لیتے ہیں اس لیے غریب آدمی پیسوں میں سے ایک پیسہ بآسانی دے سکتا ہے، اور امیر آدمی ایک ہزار میں سے بھی ایک روپیہ نہیں دے سکتا، کیونکہ وہ ہزار سے زیادہ کا مقروض ہے، وہ اگر ایک روپیہ دے گا تو اس سے بھی قرض میں ہی کچھ اضافہ ہوگا، تو جو اس راز کو سمجھے گا وہ امیروں پر غرباء سے زیادہ رحم کرے گا، مگر لوگ ان کے ظاہری سامان کو دیکھ کر انہی کی گردن دباتے ہیں تو ان بیچاروں کو زیادہ نہ ستانا چاہئے۔ (خطبات حکیم الامتؒ ص/ ۶۰۸ تا ۶۱۸)

**پریشانی دو قسم کی ہے:** ایک اضطراری، ایک اختیاری، پہلی قسم کی میں نے فضیلت بیان کی تھی کہ اگر من جانب اللہ کسی کو افکار میں مبتلا کر دیا جائے تو وہ اسی پر راضی رہے اس وقت فکر ہی سے ترقی ہوگی اور ثواب بڑھے گا اور دوسری قسم کی مذمت کر رہا ہوں کہ اپنے اختیار سے پریشانی کو مول لینا سراسر موجب کلفت ہے۔

غرض اصل مقصود راحت و آسائش ہے اور وہ دنیا میں بھی دین داروں ہی کو

حاصل ہے پس آخرت کی فلاح تو ان کے لیے ہے ہی دنیا کی فلاح بھی انہی کے لیے ہے کیونکہ روحانی راحت دنیا میں ان کے سوا کسی کو نہیں بلکہ میں اس سے بھی ترقی کر کے بتاتا ہوں کہ دین داروں کو روحانی راحت حاصل ہے ہی جسمانی راحت بھی انہی کو حاصل ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ بیمار نہیں ہوتے بلکہ مطلب یہ ہے کہ بیماری اور حوادث میں ان کو روحانی اطمینان کے ساتھ جسمانی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے وہ مصائب میں نہایت استقلال اور سکون کے ساتھ رہتے ہیں اور دنیا داروں کو ایسے وقت میں روحانی اطمینان تو ہوتا ہی نہیں جسمانی راحت بھی نہیں ہوتی ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگتی اور باتوں سے گھبراہٹ و بے صبری نمایاں ہوتی ہے۔

مثلاً جب طاعون آتا ہے تو جتنے لوگ دین دار ہیں ان کو پریشانی نہیں ہوتی نہ وہ گھبراہٹ کی باتیں کرتے ہیں نہ مردوں کا شمار کرتے پھرتے ہیں کہ آج کتنے مرے اور کل کتنے ، نہ اپنی مجلسوں میں ہر وقت اس کا تذکرہ کرتے ہیں بلکہ اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور وہ اپنے مرنے سے گھبراتے ہیں ان کو طاعون کی پرواہ بھی نہیں ہوتی کیونکہ ان کا تو مذاق یہ ہے کہ مر کر ہم اپنے خدا کے پاس پہنچ جائیں گے تو جو شخص موت کو معراج سمجھتا ہے وہ طاعون سے کیا ڈرے گا بلکہ اہل اللہ تو اس کے مشتاق رہتے ہیں چنانچہ حافظ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم
راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

نظر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے
تا در میکدہ شاداں وغزل خواں بردم

وہ تو موت کو ایسا شیریں سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے نظریں مانتے ہیں، خیر یہ تو بڑے دین داروں کی حالت ہوتی ہے، مگر معمولی دینداروں کو بھی آپ دیکھیں گے کہ وہ طاعون سے اس قدر پریشان نہیں ہوتے جتنے دنیادار پریشان ہوتے ہیں۔

میں نے طاعون میں ایک ہندو کو مرتے دیکھا، چونکہ وہ سب سے میل جول رکھنے والا تھا اس لیے بیماری میں اس کے دیکھنے کو ہندو مسلمان سب ہی جاتے تھے، تو میں نے دیکھا کہ وہ ہائے ہائے کرتا تھا، اور سخت پریشان تھا، حالانکہ بڑا مالدار تھا ،مگر اس وقت مال نے اس کی پریشانی کو کچھ کم نہ کیا۔

اور ہم نے مسلمانوں کو بھی طاعون میں مرتے ہوئے دیکھا ہے کہ بڑے خوش وخرم جان دیتے تھے، ہمارے ہاں ایک دفعہ طاعون بہت زور کا ہوا تو مولانا فتح محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مکتب سے پردیسی طلبہ اپنے اپنے وطن جانے لگے، کیونکہ مولانا کا اسی طاعون میں وصال ہو چکا تھا، تو ان میں ایک طالب علم نور احمد نامی بھی جس کی عمر ۱۸ ؍برس کی تھی گھر جانے کے لیے تیار تھا، اسباب بندھا رکھا تھا کہ رات ہی کو اسے بخار ہوا اور گلٹی نمودار ہوئی ،سب کو بڑا رنج ہوا کہ اس بیچارہ کو اپنے وطن کی کیسی حسرت ہوگی ،گھر جانے کو تیار بیٹھا تھا، موت کا سامان ہونے لگا تو بعض نے تسلی کے طور پر اس سے کہا نور احمد گھبراؤ نہیں، ان شاء اللہ تم اچھے ہو جاؤ گے، اور تندرست ہو کر اپنے گھر جاؤ گے، تو وہ کہنے لگے کہ بس اب میرے واسطے ایسی دعا نہ

کرواب تو خدا تعالیٰ سے ملنے کو جی چاہتا ہے، یہ دعا کرو کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے، اس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اسے گھر کی ذرا بھی حسرت نہیں، چنانچہ ایک دو دروز میں اس کا انتقال ہو گیا تو میں نے دیکھا کہ اس کے جنازہ پر ایک نور تھا۔

صاحبو! بھلا ایسے لوگ کیا پریشان ہوں گے جو خدا تعالیٰ کے ہر حکم پر راضی ہیں، کھانے کو کم ملے تو اس پر راضی، پہننے کو پھٹا پرانا ملے اس پر راضی، بیماری آوے تو اس پر راضی، پھر انہیں کا ہے کا غم، ان کی طرف سے دنیا میں جو چاہے ہوتا رہے وہ کبھی پریشان نہ ہوں گے کیونکہ وہ سب کو خدا کی طرف سے سمجھتے ہیں ؎

ہرچہ ازدوست میرسد نیکو ست

ہرچہ آں خسروکند شیریں بود

## ہمیشہ اہل دنیا اہل دین کے محتاج ہیں

حضرت بہلول دانا نے ایک بزرگ سے دریافت کیا کہ فرمایئے کہ آج کل کیوں کر گزرتی ہے، فرمایا اس شخص کی خوشی کا کیا حال پوچھتے ہو جس کی خواہش کے خلاف عالم میں کچھ نہیں ہوتا، کہ جو کچھ ہوتا ہے اس کی خواہش کے موافق ہوتا ہے، بہلول نے کہا کہ یہ کیوں کر؟ فرمایا کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے یقیناً خدا کے ارادہ کے موافق ہوتا ہے اور میں نے اپنے ارادہ کو ان کے ارادہ میں فنا کر دیا ہے تو اب جو کچھ ہوتا ہے وہ میری خواہش کے بھی موافق ہوتا ہے۔

سو بتلایئے جس نے اپنی خواہش کو خدا کی خواہش میں فنا کر دیا ہو اس کو پھر غم

کا ہے کا اس سے بڑھ کرا کسے آسائش ہوگی صاحب آپ کسی اہل اللہ کے پاس بیماری کی حالت میں جا کر دیکھئے جونادار بھی ہوں واللہ آپ ان کو پریشان نہ پاویں گے۔

اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمیشہ یوں ہی ہوا ہے کہ اہل دنیا اہل دین کے محتاج رہے اور دین داران کے محتاج نہیں ہوئے۔

گدا با دشا ہت و نا مش گدا ست

## بدون دین کے اختیار کئے دنیا کی راحت

### بھی حاصل نہیں ہوگی

ہاں اگر کوئی دنیا دار ایسا ہو کہ اس کو خدا تعالیٰ نے دین و دنیا کی دونوں دولتیں دی ہوں جیسے بعض اہل اللہ سلطان وقت ہوئے ہیں، تو وہ اپنے وقت کا سلیمانؑ ہے، اس کو دین داروں سے استغناء ہوسکتا ہے مگر اس کو بھی یہ استغناء دین کی بدلت حاصل ہوا، نری دنیا کے ساتھ اس کو کبھی اہل دین سے استغناء نہیں ہوسکتا تھا، اور گفتگو اسی میں ہے کہ اگر کسی کے پاس صرف ایک ہی دولت ہوتو دونوں میں کون سی حالت اچھی ہے، تو میں اس کو بتلا رہا ہوں کہ اہل دین تو بدون مال کے کامیاب ہیں، اور اہل دنیا بغیر دین کے کامیاب نہیں ہوسکتے، بلکہ پریشان رہیں گے، تو اب ثابت ہوگیا کہ بدون دین کے اختیار کیے دنیا کی راحت بھی حاصل نہیں ہوسکتی۔

اگر کسی کو اس پر شبہ ہو کہ اہل یورپ تو بغیر دین کے آرام میں ہیں تو اس کا اصل جواب تو یہ ہے کہ وہ آرام میں نہیں ہیں، آپ محض ان کے ساز وسامان کو دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ وہ آرام میں ہیں، حالانکہ راحت اصل میں اطمینان قلب کا نام ہے، اور واللہ وہ

بے دین کو کبھی حاصل نہیں ہوسکتی، مگر یہ جواب ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا، بلکہ جس کو قلوب کفار کی حالت منکشف ہوگئی ہو وہی اس کو سمجھ سکتا ہے۔

مسلمان کو تو ذرا ذرا سی مخالفت پر سزا ملتی ہے اور جہاں اس نے کوئی گناہ کیا فوراً اس کی دنیاوی راحت سلب کر لی جاتی ہے، گو ظاہری ساز وسامان جلدی سلب نہ کیا جاوے مگر راحت قلب تو فوراً سلب ہوجاتی ہے، جو کہ فلاح وکامیابی کی اصل حقیقت ہے، کیونکہ وہ اطاعت کا مدعی ہے اور کفار کے جزوی افعال پر نظر نہیں کی جاتی، بس ان کو تو بغاوت کی سزا اکٹھی دی جاوے گی، جس کے لیے ایک میعاد معین ہے۔

شاید اس پر کوئی یہ کہے کہ اس دعویٰ اطاعت سے تو بغاوت ہی اچھی کہ روز روز کی گرفت سے تو بچے رہیں گے تو سمجھ لیجئے کہ مطیع کو تو ابھی سزا ہوگئی مگر یہ سزا بھگتنے کے بعد پھر وہ ہمیشہ کے لیے راحت میں ہے۔

مگر باغی چند روز یا چند سال کے لیے گو کچھ نہ کہا جاوے لیکن جب پکڑا جاوے گا تو اس کی سزا سولی سے ادھر نہ ہوگی، اسی طرح جو خدا تعالیٰ سے بغاوت کرے گا وہ چند روز دنیا میں گو راحت سے گزار لے مگر جب اس کو پکڑا جائے گا تو ابدالآباد کے عذاب جہنم سے ادھر اس کی سزا کچھ نہ ہوگی اب اختیار ہے جس کو چاہو اختیار کرلو۔

غرض آسائش کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو کوئی بالکل باغی ہو کر رہے تو سزائے بغاوت کے وقت سے پہلے اس کو چین ہے، اور یا بالکل مطیع ہو کر رہے تو اس کو ہمیشہ کے لیے چین ہے، یہاں بھی اور آخرت میں بھی، باقی مطیع ونافرمان

دونوں بن کر دنیا کی راحت تو حاصل نہیں ہوسکتی، ہاں آخرت میں کچھ سزا بھگتنے کے بعد ہو جائے گی، خلاصہ کلام یہ ہے کہ آسائش کا طریقہ جو کہ اصل ہے فلاح کی بدون دین کی پابندی کے ممکن نہیں۔

اس مضمون کو میں نے اس لیے بیان کیا کہ آج کل سب لوگ فلاح کے طالب ہیں جن میں زیادہ تر فلاح دنیا کے طالب ہیں، تو میں نے بتلادیا کہ فلاح دنیا بھی دین ہی کے اتباع سے مل سکتی ہے، اس کے بغیر مسلمان کو تو مل نہیں سکتی، اور اس وقت مسلمانوں ہی سے خطاب ہے، یہ مسئلہ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ سے مستنبط ہو اور یہاں لَعَلَّ شک کے لیے نہیں ہے بلکہ ترجی یعنی امید لانے کے لیے ہے، اور مطلب یہ ہے کہ یہ اعمال بجالا کر فلاح کے امیدوار ہو، لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس میں کوئی وعدہ تو ہے ہی نہیں، تو شاید ایسا نہ بھی ہو کیونکہ یہ شاہانہ کلام ہے اور بادشاہ کسی کو امید دلا کرنا امید نہیں کیا کرتے، شاہانہ کلام میں امیدوار ہونا ہزار پختہ وعدوں سے زیادہ ہوتا ہے، پھر رفع شک کے لیے بعض مقامات پر حق تعالیٰ نے پختہ وعدہ بھی فرمادیا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

## لَعَلَّ کی تحقیق اور حکمت

حقا علینا نصر المومنین۔

رہا یہ کہ پھر سب جگہ حقّاً حقّاً ہی کو کیوں نہ فرمایا کہیں کہیں لعلکم کس لیے فرمایا تو اس میں ایک راز ہے جو اہل سنت نے سمجھا ہے وہ یہ کہ پختہ وعدہ کے بعد بعض جگہ لَعَلَّ فرما کر اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ہم وعدہ کر کے مجبور نہیں ہو گئے،

بلکہ اب بھی جزا کا دینا اور نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے، تمہاری مجال نہیں کہ ہم پر تقاضا کرنے لگو اور ہم کو ایفائے وعدہ پر مجبور سمجھ کر کچھ سے کچھ ہانکنے اور بکنے لگو، ہماری شان یہ ہے۔ لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ۔

یہ اور بات ہے کہ ہم وعدہ کر کے ایفا ضرور کریں گے مگر اس پر مجبور نہیں ہے بلکہ وعدہ کے بعد بھی ویسے ہی مختار ہیں جیسے قبل وعدہ تھے۔

قسم اول کے متعلق تو صبروا ہے یعنی جس عمل کا وقت آجاوے اس وقت صبر سے کام لو، یعنی پابندی اور استقلال سے رہو تو حق تعالیٰ نے اس میں اعمال حاضرہ میں مستقل رہنے کا حکم فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ دینداری کے یہی معنی ہے کہ ہر کام کو پابندی اور استقلال سے کیا جاوے، آج کل لوگ ولولے اور جوش میں بہت سا کام شروع کر دیتے ہیں پھر نباہ نہیں ہوتا تو یہ دینداری کامل نہیں ہے، اسی لیے خدا تعالیٰ نے اتنا ہی کام بتلایا ہے جس پر نباہ ہو سکے، واجبات و فرائض وسنن مؤکدہ پر نباہ کچھ دشوار نہیں، اس سے زیادہ کام کرنے میں البتہ بعض سے نباہ نہیں ہوتا تو ان کو اپنے ذمہ اتنا ہی کام بڑھانا چاہئے، جس پر نباہ اور دوام ہو سکے تو اس کا حکم ان اعمال کے متعلق ہے جن کا وقت آ گیا ہے۔

غرض ایک تو وہ افعال ہیں جن میں کسی سے مقابلہ نہیں کرنا پڑتا، ان پر مداومت و استقلال کرنے کا حکم تو اصبروا میں ہے، اور جن میں دوسروں سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے ان میں ثابت قدم رہنے کا حکم صابروا میں ہے، یہ تو وہ افعال تھے جن کا وقت آ گیا اور ایک وہ افعال ہیں جن کا ابھی وقت نہیں آیا۔

ان کے متعلق حکم رابطوا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ان کاموں کے لیے تیار و مستعد رہنا چاہئے، مقابلہ کو تیار و مستعد رہنے کے واسطے کی جاتی ہے عام لغت کے موافق ایک تفسیر تو رباط کی یہ ہے۔

دوسری ایک تفسیر حدیث میں آئی ہے: انتظارالصلوۃ بعد الصلوۃ یعنی ایک نماز پڑھ کر دوسری نماز کے لیے منتظر رہنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے متعلق بھی فرمایا ہے، فذالکم الرباط فذالکم الرباط یہی رباط ہے یہی رباط ہے، اور اس تفسیر میں اور پہلی تفسیر میں کچھ منافات نہیں، بلکہ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم کو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ رباط اعداء ظاہری کے ساتھ ہی مختص نہیں، بلکہ جیسے اعداء ظاہری کے مقابلہ میں رباط ہوتا ہے اسی طرح کبھی اعداء باطنی یعنی نفس وشیطان کے مقابلہ میں بھی رباط ہوتا ہے، وہ مجاہدہ ظاہری کا رباط ہے، اور یہ مجاہدہ باطنی کا رباط ہے، اسی کو ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ، وَالْمُهَاجِرُ مَنْ هَجَرَ الْخَطَايَا وَالذُّنُوْبِ۔

یعنی مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے مقابلہ میں مجاہدہ کرے، اس سے معلوم ہوا کہ مجاہدہ کی ایک قسم مجاہدہ نفس بھی ہے، اور اس کے لیے بھی ایک رباط ہے جیسے اعداء ظاہر کے مقابلہ کی پہلے سے تیاری کی جاتی ہے اسی طرح نفس وشیطان کے مقابلہ میں بھی مورچہ بندی کی ضرورت ہے، کیونکہ یہ بھی بڑے سخت دشمن ہیں، جو بدون مورچہ بندی کے قابو میں نہیں آتے اسی کو فرماتے ہیں۔

اے شہاں کشتیم ما خصمے بروں
ماند خصمے زوتبرد راندروں

اورفرماتے ہیں ۔

کشتنِ ایں کار عقل وہوش نیست
شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

یعنی اس کا زیر کرنا عقل ہوش کا کام نہیں ، کیونکہ شیر خرگوشت کے بہلانے میں نہیں آیا کرتا، بلکہ ان کو زیر کرنے کے لیے شارع علیہ السلام کی تعلیم کا اتباع ضروری ہے، چنانچہ اسی کا ایک شعبہ یہ رباط ہے، یعنی نماز کا انتظار کرنا بعد ایک نماز کے، یہ نفس پر سب سے زیادہ گراں ہے، کیونکہ اس میں کوئی حظ نہیں ہے، بس نماز پڑھ کر خالی بیٹھتے ہیں اور دوسری نماز کا انتظار کر رہے ہیں۔

اج کل بعض لوگ سوال کرتے ہیں کہ اس خالی بیٹھے رہنے سے کیا فائدہ، میں کہتا ہوں اس میں دو فائدے ہیں، ایک تو نفس کو طاعات پر جمانا، دوسرے وہ فائدہ ہے جس کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا ہے: ان العبدفی الصلوۃ ماانتظرالصلوۃ، کہ بندہ جب تک نماز کے انتظار میں رہے اس وقت تک وہ نماز میں ہی رہتا ہے، یعنی اس انتظار میں بالکل وہ ثواب ملتا ہے جو نماز پڑھنے میں ملتا ہے، مگر چونکہ ثواب نظر نہیں آتا، اس لیے نفس پر یہ انتظار گراں ہوتا ہے، اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو رباط فرمایا ہے تو ایک تفسیر رباط کی یہ ہے جو پہلی تفسیر کی بھی مؤید ہے، اوران دونوں میں ایک عمل مشترک ہے، یعنی مستعد اور

تیار رہنا اگلی عبادت اور آئندہ کام کے لیے تو رباط کی روح اصل میں تیاری اور استعداد ہے، اس لیے میں نے رابطوا کی تفسیر یہ کی کہ جن کاموں کا وقت نہیں آیا ان کے لیے تیار ومستعد رہنا چاہیے۔

پس صبر کی ضرورت تو ان افعال میں ہے جن کا وقت آ گیا اور رباط کی ضرورت ان کاموں میں ہے جن کا وقت نہیں آیا، دین کا خلاصہ یہی ہے کہ جن کاموں کا وقت آ گیا ہو ان کو استقلال و پابندی سے ادا کیا جائے، اور جن کا وقت نہیں آیا ان کے لیے تیار ومستعد رہے، کسی وقت بے فکر ہو کر نہ بیٹھے بلکہ یہ حال ہونا چاہیے۔

اندریں رہ می تراش ومی خراش
تادم آخر دمے فارغ مباش
تادم آخر دمے آخر بود
کہ عنایت باتو صاحب سر بود

بس دین یہ ہے کہ آدمی کو ہر دم ایک دھن لگی رہے یا تو کسی کام میں لگا ہوا ہو یا کسی کام کی تیاری میں مشغول ہو۔

اے مسلمانو! خدا کے ساتھ وہ حالت تو ہونی چاہیے جو ایک محبوب مجازی کے ساتھ ہوتی ہے کہ ہر دم عاشق اس کی دھن میں رہتا ہے وہ دنیا کے سارے دھندے بھی کرتا ہے مگر اس کا خیال کبھی دل سے نہیں اترتا بس یہ حال ہوتا ہے۔

چو میرد مبتلا چو خیزد مبتلا خیزد

تو کم از کم طالب علم خدا کا یہ حال تو ہونا چاہیے جو ایک مردار کسبی کے عاشق کا ہوتا ہے کہ وہ کسی وقت دل سے نہیں اترتی۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلے بود
گوی گشتن بہراو اولےٰ بود

صاحبو! خدا کی محبت ایک مخلوق کی محبت سے بھی کم ہوگئی، اگر نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی ایسی دھن نہ ہو، واللہ جو سچا طالب ہوگا اس کے دل ہر وقت خدا تعالیٰ کی دھن لگی ہوگی، چنانچہ ایسے ہی لوگوں کی بابت ارشاد ہے۔

رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ۔

کہ ایسے لوگ ہیں جن کو تجارت اور خرید وفروخت خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی۔

ایک شخص نے مجھ سے سوال کیا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہم دنیا کا بھی کام کریں اور اس کے ساتھ خدا کی بھی یاد رہے میں نے کہا یہ ایسے ہوسکتا ہے جیسے اپ کو خدا کے کام کے ساتھ دنیا یاد رہتی ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ خدا کا یاد رہنا تعجب کی بات ہے تو اس پر بھی تعجب ہونا چاہیے، اور اگر اس پر تعجب نہیں تو اس کے عکس پر کیوں تعجب ہے۔

بات یہ ہے کہ جو چیز دل میں بس جاتی ہے وہ ہر کام کے ساتھ یاد رہا کرتی ہے، کیونکہ ہمارے دلوں میں دنیا بسی ہوئی ہے، اس لیے خدا کے کام میں بھی یاد رہتی ہے، اور اگر کبھی خدا دل میں بس جائے گا تو پھر وہ بھی دنیا کے کاموں میں یاد رہے گا، اور اس کی ایک بڑی نظیر طاعون کی بدولت مل گئی ہے اس سے ایک حدیث پر سے اشکال رفع ہوگیا، حدیث میں آتا ہے۔

إذا أصبحت فلا تحدث نفسك بالمساء، وإذا أمسيت فلا تحدث نفسک بالصباح وعدنفسک من اصحاب القبور۔

یعنی جب صبح کروتو اپنے دل میں شام کا خیال نہ لاؤ اور جب شام ہوتو دل دل میں صبح کا خیال نہ لاؤ، اور اپنے آپ کو مردوں میں شمار کرو۔

## اصل مقصود احکام کی پابندی ہے لذت مقصود نہیں

اصبروا فرمانے سے ایک اور مسئلہ ثابت ہوا وہ یہ کہ اصل مقصود احکام کی پابندی ہے، لذت مقصود نہیں، پس اگر کوئی شخص احکام کو پابندی سے بجالاتا ہو گو لذت اور مزانہ آتا ہوتو وہ مقصود سے کامیاب ہے، اگر ناگواری مطلوب نہ ہوتی تو حق تعالیٰ اصبروا نہ فرماتے، پس جابجا اہتمام کے ساتھ اصبروا فرمانا بتلا رہا ہے کہ لذت مقصود نہیں، بلکہ صبر واستقلال مطلوب ہے، مگر آج کل اکثر سالکین اس کے شاکی نظر آتے ہیں کہ ہائے ہم کو طاعت میں مزہ نہیں آتا اور اس کو طاعت کے لیے نقص سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ نفس کا ایک کید ہے کہ اس کو دنیا میں بھی مطلوب ہے، حالانکہ طاعت سے دنیا میں حظ مطلوب نہیں، بلکہ آخرت میں اس سے حظ حاصل ہوگا، لیکن اگر کسی کو بدون طلب کے حظ نصیب ہو جائے تو یہ لذت بے کار بھی نہیں، نعمت الٰہیہ ہے اس کی ناقدری نہ کریں، کیونکہ بعض کے لیے یہ بہت مفید ہوتی ہے ، پس جس کو یہ دولت حاصل ہو وہ کلفت کا ثواب سن کر زوال لذت کا بھی طالب نہ ہو، اور جس کو حاصل نہ ہو وہ اس کے درپے نہ ہو غرض جس حالت میں وہ رکھیں اسی میں خوش رہنا چاہئے، وہ تمہارے لیے جس کیفیت کو مصلحت جانیں وہی بہتر ہے۔

بگوش گل چہ سخن گفتۂ کہ خنداں ست
بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں ست

اس کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب ایک مریض کو تو حب ایارج دے اور ایک کو خمیرۂ گاوزبان دے، وہاں کوئی مزاحمت نہیں کرتا کہ اس کو میٹھی دوا اور مجھے کڑوی کیوں دی؟ اس جگہ سب عاقل بن جاتے ہیں کہ بھائی اس کے لیے یہی مصلحت ہے اور اس کے لیے یہی مناسب ہے، مگر یہاں طب باطنی میں لوگ طبیب سے مزاحمت کرتے ہیں کہ فلاں کو تو خدا تعالیٰ نے لذت وبسط میں رکھا ہے اور ہم کو کلفت وقبض دے دیا ہے نہ معلوم وہ کیوں ان کو عزیز ہے۔

صاحبو! عزیز کوئی نہیں سب غلام ہیں، اور غلام کو تجویز کا کوئی حق نہیں، غلام کی تو وہ حالت ہونی چاہیے جیسے ایک غلام کی حکایت ہے کہ اس کو کسی نے خریدا اور گھر لا کر پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ کہا، اب تک تو جو کچھ نام تھا وہ تھا، آج سے میرا نام وہ ہے جس سے آپ پکاریں، پوچھا تم کھاتے کیا ہو؟ کہا اب تک تو جو کچھ بھی کھاتا تھا آج سے وہ کھاؤں گا جو آپ کھلائیں، اے صاحبو! غلام کا تو یہ مذاق ہونا چاہیے ؎

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

اور یہ مذہب ہونا چاہیے ؎

خوشا وقت شوریدگانِ عشق
اگر ریش بینند وگر مرہمش!

گدایانِ از بادشاہی نفور
بامیدش اندر گدائی صبور
دمادم شراب الم درکشد
وگر تلخ بینندہ دم درکشند

## ان کے در کے سوا کوئی اور در اس قابل نہیں

### جہاں چلا جاؤں

بات یہ ہے کہ راہ محبت ایسی ہی چیز ہے کہ اس میں طالب کو کسی تجویز کا حق نہیں، محبت تو نام ہی فنا کا ہے، پھر یہ آواز کیوں نکلتی ہے کہ ہائے یوں ہوتا ہے، ہائے یوں ہوتا ہے، اور صاحبو! اس وقت تو طاعات میں ناگواری اور بدمزگی ہی ہے آپ ایسے گھبرا گئے یہ کیا چیز ہے؟ اگر کبھی آپ پر وہ امور پیش آتے جو بزرگوں کو پیش آئے ہیں تو حقیقت نظر آجاتی۔

بزرگوں کو تو اس راہ میں وہ وہ سختیاں پیش آئی ہیں کہ ان کے سامنے یہ ذرا سی ناگواری کچھ بھی نہیں، ایک بزرگ کو تہجد کے وقت غیب سے آواز آئی کہ کچھ بھی کر یہاں کچھ بھی قبول نہیں، اور اس زور سے آواز آئی کہ ان کے ایک خادم نے بھی سن لی مگر وہ ایسے عاشق تھے کہ وضو کر کے پھر بھی نماز میں لگ گئے، اگلے دن پھر لوٹا بدھنا لے کر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا حضرت جب وہ منہ بھی نہیں لگاتے اور کچھ قبول نہیں کرتے تو آپ ہی کیوں مصیبت جھیلتے ہیں، لیٹ کر سوئے بھی رہئے، بس ان

بزرگ پر حال طاری ہوگیا اور رو رو کر فرمایا کہ بیٹا میں ان کو چھوڑ دوں گا مگر یہ تو بتلاؤ کہ ان کے در کے سوا کوئی اور در ہی اس قابل نہیں جہاں چلا جاؤں، ظاہر ہے کہ اور کوئی در اس قابل نہیں تو پھر میں تو اسی در پر جان دے دوں گا چاہے وہ قبول کرے یا نہ کریں، اس جواب پر رحمت حق کو جوش آیا اور پھر آواز آئی ۔

قبول ست گرچہ ہنر نیست
کہ جز ما پناہے دگر نیست

اگر آج کسی کو ایسی آواز آجائے تو بس سارا کام چھوڑ چھاڑ کر الگ ہو جائے ، کیونکہ محبت پوری نہیں ہے۔

## واقعی شیخ کا زندہ ہونا بھی بڑی نعمت ہے

اسی طرح ایک بزرگ کو ذکر کرتے وقت یہ آواز آئی تھی کہ چاہے کتنا ہی کر تیرا خاتمہ کفر پر ہوگا، کافر ہو کر مرے گا، جب بہت دن اسی قصہ میں ہو گئے اور یہ آواز موقوف ہی نہ ہوئی تو آخر گھبرا گئے، مگر کام نہیں چھوڑا گیا، گھبراہٹ کا اثر یہ ہوا کہ اپنے شیخ کے پاس حاضر ہوئے اور ان سے یہ قصہ عرض کیا، واقعی شیخ کا زندہ ہونا بھی بڑی نعمت ہے، شیخ نے فرمایا کہ یہ دشنام محبت ہے، محبوبوں کی عادت ہے کہ عاشقوں کو چھیڑ چھاڑ سے تنگ کیا کرتے ہیں اس سے دلگیر نہ ہو۔

اسی طرح ایک مرتبہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ مسجد کی طرف چلے جا رہے تھے کہ غیب سے آواز آئی شبلی کیا یہ ناپاک قدم اس قابل ہیں کہ ہمارا راستہ ان سے قطع

کیا جائے، یہ کھڑے رہ گئے، پھر آواز آئی کہ اے شبلی تم کو ہماری طرف چلنے سے کیسے صبر آ گیا حضرت شبلی ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئے کہ نہ چلنے دیتے ہیں نہ ٹھہرنے دیتے ہیں۔

صاحبو! اگر آپ ایسے ایسے شکنجوں میں کسے جاتے تو پھر آپ کا کیا حال ہوتا ،اب تو اتنا ہی ہے کہ ذکر میں مزہ نہیں آتا، آپ اس سے ہی گھبرا گئے اول تو اگر اس الفت پر اجر بھی نہ ملتا تب بھی آپ کیا کر لیتے، محبت کا مقتضیٰ یہ تھا کہ بدون اجر کے بھی اس پر راضی رہتے مگر اب تو اجر بھی ملتا ہے پھر ناگواری اور شکایت کیوں ہے، اور اگر مزہ مطلوب ہوتا تو آپ دنیا ہی میں کیوں آتے، مزہ تو جنت میں تھا وہاں سے جو آپ دنیا میں آئے ہیں تو مزے کے لیے تھوڑا ہی آئے ہیں، بلکہ بدمزگی اور کلفت کے لیے آئے ہیں خوب کہا ہے ۔

کیا ہی چین خواب عدم میں تھا نہ تھا زلف یار کا کچھ خیال
سو جگا کے شور ظہور نے مجھے کس بلا میں پھنسا دیا

حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں: لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي كَبَدٍ کہ ہم نے انسان کو مشقت میں مبتلا کر کے پیدا کیا ہے، اور جناب آپ کو کیا چیز ہیں اس کلفت سے تو بڑے بڑے بھی نہیں بچے۔

چنانچہ جب سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اول وحی نازل ہوئی ہے تو پھر اس کے بعد تین برس تک منقطع رہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم تین سال تک وحی کو ترستے رہے، اور شدت حزن کی یہ حالت تھی کہ بعض دفعہ پہاڑ پر سے گر کر اپنے کو ہلاک کرنا

چاہتے تھے، مگر فوراً حضرت جبرئیل علیہ السلام نمودار ہو کر آپ کو سنبھالتے تھے، تو جب تین برس تک حضور کو کلفت میں رکھا گیا تو ہم کیا چیز ہیں، ہمیں تو اگر تین سو برس تک بدمزگی میں رکھا جائے تو حق ہے۔

دیکھو! اگر کوئی حاکم با اختیار اپنے بیٹے کو کسی ملازمت کے لیے تین برس امیدوار رکھے اور ہم تین روز میں جا کر ملازم ہو جانا چاہیں تو یہ حماقت ہے یا نہیں۔

پس جو لوگ ذکر وشغل شروع کرتے ہیں بدمزگی اور قبض کی شکایت کرنے لگتے ہیں وہ کم از کم تین برس تو صبر کریں گے حق تو یہ تھا کہ زیادہ مدت تک صبر کریں مگر افسوس آج کل تو لوگ اتنے عرصہ تک بھی صبر نہیں کرتے جتنے عرصہ تک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فترۃ وحی میں قبض رہا۔

غرض اول تو مزہ مطلوب نہیں، دوسرے محبت کا مقتضی یہ ہے کہ مزے کا طالب نہ ہو، تیسرے اگر مزہ مطلوب بھی ہو تو کم از کم کچھ دنوں تک تو بدمزگی کا تحمل کیا جائے، چوتھے اس میں ثواب بھی ملتا ہے اور اس کے علاوہ یہ کہ اس میں باطنی مصلحت بھی ہوتی ہے، بعض اقسام تربیت کے اسی پر موقوف ہیں کہ طالب کو ظاہراً ناکام رکھا جائے جیسے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعضی عورتوں کو اسقاط میں سات آٹھ دن تک طبیب بھوکا رکھتا ہے اور ان کو بھوک زیادہ لگتی ہے اور روٹی کے لیے ضد بھی کرتی ہیں مگر اس وقت ان کو ناکام رکھنا ہی تربیت ہے، آپ خود سمجھ لیجئے کہ اس وقت ان کو روٹی دینا محبت ہے یا نہ دینا یقیناً نہ دینا ہی محبت ہے اور اسی میں مصلحت ہے پس اسی طرح باطن میں سمجھ لو کہ بعض دفعہ لذت سے محروم کر دینا ہی محبت ہے۔

آں کس کہ توانگرت نمی گرداند
اومصلحت تواز تو بہتر داند

افسوس ! اللہ میاں طبیب کے برابر نہیں کہ طبیب بھوکا مارے، تو اس کو شفقت سمجھتے ہو، اور اللہ میاں لذت سے ترسا دیں تو شکایتیں کرتے ہو۔

## مسلمان دین میں کوتاہی کرتا ہے تو دنیا بھی خراب ہوجاتی ہے

وجہ یہ ہے کہ تاریخ اس امر کی شہادت دے رہی ہے کہ مسلمانوں کی دنیا دین کے ساتھ درست ہوتی ہے یعنی جب ان کے دین میں ترقی ہوتی ہے تو دنیا میں بھی ترقی ہوتی ہے، اور جب دین میں کوتاہی ہوتی ہے تو دنیا بھی خراب ہوجاتی ہے، تو جب ہم دین سکھلاتے ہیں معاملات معاشرت اخلاق کو درست کرتے ہیں، تو گویا ہم دنیا کی ترقی کی تدابیر بھی بتلاتے ہیں، البتہ ہماری تدابیر اور دوسروں کی تدابیر میں تھوڑا سا فرق ہے، اور وہ یہ کہ دوسروں کی تدبیر میں پریشانی زیادہ ہوتی ہے ان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ ۔

چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد

واللہ العظیم، جو لوگ بظاہر نہایت آسائش میں معلوم ہوتے ہیں ان کی اندرونی حالت اگر دیکھی جائے تو معلوم ہوگا کہ ساری پریشانیوں کا نشانہ یہی ہیں۔

ان لوگوں کی حالت پر مجھے ایک لطیفہ یاد آیا میرے استاد علیہ الرحمہ فرماتے تھے کہ ایک شخص نے یہ دعا کی مجھے خواجہ خضر مل جائیں، چنانچہ خواجہ خضر اس کو مل گئے، اس نے کہا کہ حضرت یہ دعا کر دیجیے کہ خدا تعالیٰ مجھ کو اس قدر دنیا دے دیں کہ

میں بالکل بے فکر ہو جاؤں ،خواجہ خضر نے کہا کہ بے فکری اور راحت دنیا دار میں نہیں ہوسکتی، اس نے پھر اصرار کیا، انہوں نے فرمایا کہ اچھا تو کسی ایسے شخص کو انتخاب کر لے جو تیرے نزدیک بالکل بے فکر اور نہایت آرام میں ہو، میں یہ دعا کروں گا کہ تو بھی اسی جیسا ہو جائے اور تین دن کی اس کو مہلت دی آخر اس نے لوگوں کی حالت کو دیکھنا شروع کیا جس کو دیکھا کسی نہ کسی تکلیف یا شکایت و پریشانی میں مبتلا پایا، بہت سی تلاش کے بعد اس کو ایک جوہری نظر پڑا جس کے پاس حشم وخدم بھی بہت کچھ تھے ،صاحب اولاد بھی تھا اور اس کو بظاہر کوئی فکر نہ معلوم ہوتی تھی اس کو خیال ہوا کہ اس جیسا ہونے کی دعا کراؤں گا،لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ بھی کسی بلا میں مبتلا ہو اور میں بھی دعا کی وجہ سے اسی میں مبتلا ہو جاؤں،لہذا بہتر یہ ہے کہ اول اس سے اس کی اندرونی حالت دریافت کرلوں چنانچہ جوہری کے پاس گیا اور اپنا پورا ماجرہ اس کو کہہ سنایا۔

جوہری نے ایک آہ سرد کھینچی اور کہا کہ خدا کے لیے مجھ جیسا ہونے کی دعا ہرگز نہ کرانا ، میں تو ایک مصیبت میں گرفتار ہوں کہ خدا نہ کرے کوئی اس میں گرفتار ہو واقعہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ میری بیوی بیمار ہوئی ،اور بالکل مرنے کے قریب ہوگئی میں اس کو مرتے دیکھ کر رونے لگا اس نے کہا کہ تم تو روتے ہو، میں مر جاؤں گی تم دوسری کرلو گے، میں نے کہا کہ نہیں میں اب ہرگز نکاح نہ کروں گا، کہنے لگی کہ سب کہا ہی کرتے ہیں ایفا رکوئی بھی نہیں کرتا، میں چونکہ اس کی محبت میں مغلوب تھا اور اس وقت اس کے مرنے کا نہایت سخت رنگ دل پر تھا، میں نے اس کے کہنے پر استُر ا لے کر اپنا اندام نہانی فوراً کاٹ ڈالا اور اس سے کہا کہ اب تو تجھ کو بالکل اطمینان ہو گیا، اتفاق سے وہ اپنے مرد سے جانبر ہوگئی، اب چونکہ میں بالکل بیکار ہو چکا تھا اس

لیے اس نے میرے نوکروں سے ساز باز کر لیا یہ جس قدر اولاد تم دیکھتے ہو سب میرے نوکروں کی عنایت ہے میں اپنی انکھوں سے اس حرکت کو دیکھتا ہوں لیکن اپنی بدنامی کے خیال سے کچھ نہیں کر سکتا اس واسطے تم مجھ جیسے ہونے کی دعا ہرگز نہ کرانا۔

آخر اس شخص کو یقین ہو گیا کہ دنیا میں کوئی آرام سے نہیں، جب تیسرے دن حضرت خضر سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے کہا کہ کہو کیا رائے ہے، اس نے کہا حضرت یہ دعا کر دیجیے کہ خدا تعالیٰ مجھے اپنی محبت کاملہ اور دین کامل عطا فرمائے چنانچہ آپ نے دعا فرمادی اور وہ نہایت کامل دیندار ہو گیا۔

تو حقیقت میں دنیا داروں میں کوئی بھی آرام سے نہیں ہے، اندرونی حالت سب کی پریشان ہے، اس واسطے کہ دنیا کی حالت یہ ہے کہ لاینتھی ارب الاالیٰ ارب ایک آرزو ختم نہیں ہوتی کہ دوسری شروع ہو جاتی ہے، اور تفویض ورضا بالقضا ہے نہیں، ہر کام میں یوں چاہتا ہے کہ یہ بھی ہو جائے اور وہ بھی ہو جائے، اور سب امیدوں کا پورا ہونا دشوار، اس لیے نتیجہ اس کا پریشانی ہی پریشانی، گو ظاہر میں اموال واولاد سب کچھ ہے مگر اس حالت میں وہ خود اعلیٰ تعظیم ہیں، اسی کو فرماتے ہیں: فَلَا تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ کہ بظاہر اگرچہ ان کے پاس مال ودولت بہت کچھ ہے، لیکن وہ ان کے لیے عذاب ہے، میں نے کانپور میں ایک رئیسہ کو دیکھا ہے کہ ان کو اپنی اولاد سے اس قدر محبت ٹھیک ہے، اولاد کی بدولت کبھی چارپائی پر سونا نصیب نہیں ہوا، کیونکہ بچے کئی تھے، ایک چارپائی پر کیسے سمائیں اور سب اپنے پاس لے کر سوتی تھی، اسی پر ایک ہاتھ رکھ لیا، کسی پر دوسرا ہاتھ رکھ لیا، کسی پر پیر رکھ لیا پھر

غضب یہ کی رات کو اٹھ کر ٹٹولتی تھی کہ سب ہیں بھی یا نہیں، تمام رات ان کو اس مصیبت میں گزرتی تھی، اتفاق سے ان کا ایک بچہ مرگیا تو اس قدر پریشان ہوئیں کہ اس کے کفن دفن میں بھی شریک نہیں ہوئی، اور کانپور چھوڑ کر ٹخنوں یا اور کہیں چل دیں۔

علیٰ ہذا، مال بھی اکثر لوگوں کو عذاب جان ہو جاتا ہے اور راز اس کا بھی یہی ہے کہ واقعات تو اختیار میں ہوتے نہیں اور ہوس زیادہ ہوتی ہے اس واسطے ہمیشہ مصیبت میں گزرتی ہے، برخلاف کچھ شخص کے کہ جس کے پاس دین ہو کیونکہ اس کو خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اور محبت میں یہ حالت ہوتی ہے کہ ؎

ہر چہ آں خسرو کند شیریں بود

## سب کو مولوی بنانا جائز نہیں

حضرت غوث اعظمؒ کا واقعہ ہے کہ ان کو کسی نے ایک آئینہ چینی نہایت بیش قیمت لا کر دیا، آپ نے خادم کے سپرد کر دیا کہ جب ہم مانگا کریں تو ہمیں دے دیا کروا، یک روز اتفاق سے خادم کے ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا خادم ڈرا اور حاضر ہو کر عرض کیا کہ ؎

از قضا آئینہ چینی شکست

آپ نے بیساختہ نہایت خوش ہو کر فرمایا کہ ؎

خوب شد اسباب خود بینی شکست

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ سب کا مولوی بنانا جائز بھی نہیں ہے، اس

پر شاید لوگوں کو تعجب ہو، لیکن بات یہ ہے کہ مولوی ہونے سے مراد مقتداء ہونا ہے اور مقتدا ہونے کے لیے کچھ شرطیں ہیں جن میں سے بڑی شرط یہ ہے کہ اس شخص میں حق پرستی ہو، نفس پرستی نہ ہو، لالچ اس میں نہ ہو کہ اپنے دماغ کی وجہ سے مسئلہ کو بدل دے، علماء بنی اسرائیل میں یہی بات تھی کہ جس کی وجہ سے وہ گمراہ ہوئے ،اسی کی نسبت کہتے ہیں ۔

بے ادب را علم وفن آموختن
دادن تیغ ست دست راہزن

اور یہ مشاہدہ ہے کہ طمع میں بہت طبائع مبتلا ہیں، جب یہ ہے تو فرض کیجئے کہ ایک شخص میں طمع اور نفس پرستی ہے اور اس کو مقتدی بنا دیا گیا تو وہ کیا کرے گا، ظاہر ہے کہ بجائے اصلاح قوم کے قوم کو تباہ کرے گا، اور اپنی طرف سے تلاش کر مسئلے لکھے گا، میں نے ایک شخص کا فتویٰ دیکھا ہے کہ اس نے ایک ہزار روپیہ لے کر ساس سے نکاح کو حلال کر دیا تھا۔

## حلال کرنیوالا مولوی اور حرام کرنے والا مولوی

دہلی کے ایک بادشاہ کے متعلق مشہور ہے کہ اس کو ایک مرتبہ حریر پہننے کی طرف میلان ہوا، بعض تنخواہ دار مولویوں نے اس کی حلت کا فتویٰ دے دیا، اور بہت سے وجوہ حلت کے لکھ دئے بادشاہ نے کہا کہ اگر ملا جیون بھی دستخط کر دیں تو میں پہن لوں گا، ملا جی کے پاس استفتاء گیا، آپ نے کہلا بھیجا کہ میں دہلی آ کر جواب دے دوں گا، اور جامع مسجد میں جواب دوں گا، چنانچہ آپ دہلی تشریف

لائے اور جامع مسجد میں ممبر پر جا کر بعد نقل سوال وجواب کے استحلال معصیت کی بنا پر بطور زجر کے فرمایا کہ مفتی ومستفتی ہر دو کافر اند۔ بادشاہ یہ سن کر نہایت غضب ناک ہوا اور اس نے قتل کا حکم دیا، بادشاہ کے ایک فرزند کو جو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے ملا جی کے پاس آئے اور کہا کہ آپ کے قتل کی تدبیر ہو رہی ہے، ملا جی نے جو سنا تو بہت برہم ہوئے اور فرمایا کہ میں نے ایسا قصور کیا کیا ہے اور فرمایا کہ وضو کے لیے پانی لاؤ کہ میں بھی ہتھیار باندھ لوں، کیونکہ الوضوء سلاح المومن حقیقت حضرات کو تنہا نہ سمجھنا چاہیے حافظ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؂

بس تجربہ کردیم دریں دیر مکافات
بادور کشاں ہر کہ درافتاد برافتاد

حدیث شریف میں ہے۔

مَن عادَى لي وَلِيًّا فقَدْ آذَنْتُهُ بالحَرْبِ۔

شہزادہ نے جو آپ کے جلال کی حالت دیکھی تو دوڑا ہوا باپ کے پاس گیا اور کہا کہ آپ کیا غضب کرتے ہیں، ملا جی آپ کے مقابلہ کے لیے وضو کر رہے ہیں، اور سلاح وضو درست کر رہے ہیں، سج رہے ہیں، بادشاہ یہ سن کر تھرّا گیا اور کہا کہ اب کیا کروں؟ میں تو حکم دے چکا ہوں، شہزادے نے کہا کہ سب کے سامنے میرے ہاتھ ایک خلعت بھیج دیا جائے، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا تب ملا جی کا غصہ فرو ہوا۔

اس قسم کے لوگ البتہ مقتداء ہونے کے قابل ہیں اور ایسے بہت لوگ گزرے ہیں برخلاف ان طماع لوگوں کہ کے یہ بجز فساد کے اور کیا کریں گے۔

چنانچہ ایک ایسے ہی بزرگ وار کا قصہ ہے اور میں نے ان کو دیکھا بھی ہے کہ

ان سے ایک عورت نے جس کا دوسرے شخص سے تعلق تھا کہا کہ میں اپنے شوہر کے پاس رہنا نہیں چاہتی، اور وہ مجھے طلاق نہیں دیتا، انہوں نے کہا کہ تو کافر ہو جا، (نعوذ باللہ) اس سے نکاح ٹوٹ جائے گا۔

فرمایئے! جب ایسے لوگ مقتداء ہوں گے تو قوم کی کیا حالت ہوگی، اور عجب نہیں کہ ایسے لوگوں کی وجہ سے ان کے پڑھنا پڑھانے والوں سے بھی باز پرس ہو، جبکہ ان کو کر قرائن سے معلوم ہو کہ یہ ایسے ہوں گے اور یہی وجہ تھی کہ سلف صالحین انتخاب کر کے پڑھاتے تھے، ہر کس و ناکس کو علم دین مقتدائیت کے درجے تک نہ سکھلاتے تھے۔

اس مقام پر شاید متکبرین خوش ہوں کہ ہم کہا کرتے تھے کہ جلا ہے نیلیوں کو نہ پڑھایا جائے وہی بات ثابت ہوگئی، سو ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہدایت سلف صالحین میں انتخاب نساب سے نہیں ہوتا تھا، بلکہ ملکات سے ہوتا تھا، یعنی جس شخص میں ملکات فاضلہ دیکھتے تھے ان کو دین کی تعلیم کامل دیتے تھے اور جس شخص میں ملکات رذیلہ دیکھتے تھے اس کو بقدر ضرورت سکھلا کر کسی دوسرے کام میں مشغول ہونے کی رائے دیتے تھے۔

# نیک عالم جس کے گھر جاتے ہیں اس دن

## ان کے یہاں عید ہوجاتی ہے

آج کل جو علماء کا گروہ بدنام ہے یہ انہی طمّاعوں کی بدولت، واللہ اگر علماء آج دست کش ہوجائیں جیسا کہ اہل حق بحمدللہ ہیں تو یہ بڑے بڑے متکبرین ان کے سامنے سر تسلیم خم کریں بلکہ علماء کے لیے تو یہ مناسب ہے کہ اگر کوئی دنیادار ان کے سامنے کوئی چیز پیش بھی کرے تو لینے سے انکار کردیں، صاحبو! علماء کا وجود ہی فی نفسہ ایسا محبوب تھا کہ اگر یہ کسی کے گھر چلے جاتے تو اس دن عید ہونی چاہیے تھی، حالانکہ آج وہ دن یوم الوعید ہوجاتا ہے اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان طماعوں کی بدولت ہر عالم کی صورت دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کچھ مانگنے آئے ہوں گے، صاحبو! استغناء وآزادی میں علماء کا تو یہ مذہب ہونا چاہیے کہ ؎

اے دل آں بر کہ خراب از مے گلگوں باشی
بے زروگنج بہ صد حشمت قارونِ باشی
درمنزل لیلیٰ کہ خطر ہاست بجاں
شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

یعنی وہ حالت ہونی چاہیے کہ مال اور جاہ دونوں کو الگ لگا دو، اگر تم ان امراء کے دروازے پر جانا چھوڑ دو تو یہ خود تمہارے دروازہ پر جائیں گے۔

آج کل مقتداء بننا بھی ایسا سستا ہوگیا ہے کہ جس کا جی چاہے وہی مقتدا بن جاتا ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ لوگ کسی ایک بڑی جگہ اور مرکزی جماعت سے

وابستہ نہیں، اس لیے سب خود مختار ہیں، لہٰذا بہت ضروری ہے کہ سب کے سب کسی ایسی جگہ اور ایسی جماعت سے وابستہ ہوں کہ ان کا ہر فعل وہاں کی اجازت اور سند کے بعد ہو، بدون خاص اہتمام کے یہ جماعت علماء کی قائم نہیں ہوسکتی، اس لیے اس کا اہتمام نہایت ضروری ہے، مگر اس کا تمام تر اہتمام مولویوں پر نہ رکھو، کیونکہ اس میں بعض کام ایسے بھی ہوں گے کہ اس کو مولوی نہیں کر سکتے ہیں نہ ان کے لیے مناسب ہے۔

## علماء کو مناسب نہیں کہ وہ چندہ کی تحریک میں حصہ لیں

مثلاً مدارس قائم کرنے کے لیے چندہ کرنے کی ضرورت ہوگی ،سو علماء کو مناسب نہیں کہ وہ چندہ کی تحریک میں حصہ لیں، اس سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عام لوگ ان کو دیکھ کر یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے اپنی اولاد کو پڑھایا تو وہ بھی یہی مانگنے کا کام کریں گے، پس مولوی پڑھانے کا کام کریں اور رئیس چندہ اصول کریں، کیونکہ ان پر یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ خود کھا جائیں گے، دوسرے جب مولوی پڑھانے کا کام کرتے ہیں تو کھانے کمانے کے کام بھی انہی کے سر کیوں ڈالے جائیں، آج کل عوام مولویوں کو بھانڈ کا ہاتھی سمجھتے ہیں۔

مشہور ہے کہ اکبر نے کسی بھانڈ کو خوش ہو کر ایک ہاتھی دے دیا تھا، بھانڈ نے ہاتھی تو لے لیا لیکن اس کو خیال ہوا کہ میں غریب آدمی ہاتھی کو کھلاؤں گا کہاں سے؟ اس کی تو چار خوراکوں میں میرا سارا گھر بھی ختم ہو جائے گا، آخر اس کو معلوم ہوا کہ آج اکبر کی سواری فلاں طرف سے فلاں وقت گزرے گی، جب وہ وقت آیا تو آپ نے ہاتھی کے گلے میں ایک ڈھول ڈال کر اسی طرف اس کو چھوڑ دیا، اکبر کی

سواری جب گزری تو اس نے دیکھا کہ سامنے سے ایک ہاتھی چلا آرہا ہے اور گلے میں ڈھول پڑا ہوا ہے، غور کیا تو معلوم ہوا کہ خاصہ کا ہاتھی ہے، لوگوں سے پوچھا کہ یہ ہاتھی اس حالت میں کیوں پھرتا ہے، لوگوں نے کہا حضور نے آپنے بھانڈ کو یہ ہاتھی دے دیا تھا اکبر نے بھانڈ کو طلب کیا اور پوچھا کہ تم نے ہاتھی کو اس حالت میں کیوں چھوڑا ہے، کہنے لگا کہ حضور نے مجھے ہاتھی تو عنایت فرمایا مگر میرے پاس کھلانے پلانے کو کیا دھرا تھا، آخر یہ سمجھ میں آیا کہ جو میرا پیشہ ہے وہی اس کو بھی سکھلاؤں اس لیے میں نے گلے میں ڈھول ڈال کر چھوڑ دیا کہ مانگو اور کھاؤ، اکبر کو یہ لطیفہ پسند آیا اور اس نے ایک گاؤں بھی انعام میں دیا۔

## عالم کی مثال آفتاب کی سی ہے

تو لوگوں نے مولویوں کے لیے بھی یہی تجویز کر رکھا ہے کہ کام بھی کرو اور مانگو اور کھاؤ بھی، صاحبو! ان کو کیا غرض پڑی ہے خدا تعالیٰ نے ان کو دولت علم کی دی ہے، ان کو کیا مصیبت پڑی کہ وہ تم سے بھیک مانگے، اور میں مولویوں کو بھی کہتا ہوں کہ آپ کو کامل توکل کرنا چاہیے، نیز مولویوں کے مانگنے میں ایک بڑی خرابی ہے کہ لوگ ان پر یہ اعتراض کریں گے کہ یہ لوگ دوسروں سے تو مانگتے ہیں لیکن خود کبھی نہیں دیتے، اور جو محرک نہ دے اس کی تحریف میں شبہات پیدا ہوتے ہیں، اور رؤساء اگر دوسروں سے ۵۰ مانگیں گے تو کم سے کم ۲۰ تو خود بھی دیں گے اس لیے ان پر اعتراض کرنے کا کسی کو موقع نہیں ہے، تو یہ طریقہ ہے کام کرنے کا، اس طور پر مدرسے کا قائم ہونا نہایت ہی ضروری ہے، بالخصوص شہر میں کہ یہاں کے لوگوں کو

دین کی طرف بہت ہی کم رغبت ہے، سراسر دنیا ہی میں پھنسے ہوئے ہیں، اور زیادہ تر وجہ اس کی یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کو علماء کی صحبت بہت ہی کم ہے، جس کے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خود علماء کو یہاں بلاؤ اور ان سے فیض حاصل کرو، عالم کی مثال آفتاب کی سی ہے کہ اس کے طلوع ہوتے ہی نصف کرۂ زمین منور ہو جاتا ہے، اور ظلمت بالکل جاتی رہتی ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ وہ دیندار عالم ہو، ایسا نہ ہو کہ تمہارے تابع بن جائے اس کی صفت یہ ہو کہ۔

لَا یَخَافُونَ لَوْمَۃَ لَائِمٍ۔

اور اس کے لیے کم سے کم ۲۰ یا پچیس روپے ماہوار کا انتظام کر دو اج کل لوگ یہ چاہتے ہیں کہ عالم تو بہت بڑا ہو لیکن دس بارہ روپیہ ماحوار سے زیادہ نہ دینے پڑیں۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کے پاس ایک عالم کی طلب میں ایک خط ایا تھا جس میں ان عالم کے لیے بہت سی شرطیں لکھی تھیں کہ وہ ایسے ہوں اور ایسے ہوں اور کل دس روپے تنخواہ لکھی تھیں مولانا فرمانے لگے کہ بھلے مانسو فی وصف ایک روپیہ تو رکھا ہوتا۔

صاحبو خدا کا شکر ہے کہ اس نے آپ کو وسعت دی ہے کچھ مشکل نہیں کہ دس پندرہ روپیہ ماہوار کا ایک مولوی کے لیے انتظام کر دیں عمائد شہر اگر اس پر متوجہ ہو جائیں تو بہت آسانی سے سب کچھ ہو سکتا ہے یہ تو بقاء علماء کی صورت تھی۔

دوسرے کام یعنی عمل کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ مدرسے میں جو عالم ہوں ان

سے مسائل دریافت کر کر کے اور علت وحرمت کو معلوم کر کے ان کے فتوے کے موافق عمل کیا جائے اور جس وقت تک مدرسے کا انتظام نہ ہو اس وقت تک یہ کیجئے کہ کسی ذی علم کو وعظ لیے نوکر رکھ لیجئے اس کا کام یہ ہو کہ محلوں میں جا کر وعظ کہے اور ترغیب وترہیب اور احکام شرع کو اس میں بیان کرے آپ اس طریق پر عمل کر کے دیکھیے ان شاء اللہ تعالیٰ ایک سال میں کتنی حالت درست ہو جائے گی۔

دوسرے یہ کیجئے کہ ہر محلے کے لوگوں کو ہفتے بھر میں ایک دفعہ کسی جگہ جمع کر کے ایک ادمی مسائل کی کتاب لے کر ان کو مسائل سنا دیا کریں اور جو لوگ خود پڑھے لکھے ہیں وہ مسائل کی کتابیں خرید کر اپنے پاس رکھنا ہے اور روزانہ ان کو دیکھا کریں اور جہاں شبہ رہے کسی عالم سے حل کرلیں ہے غرض اس کو عمر بھر کا شغل رکھیں اور عورتوں کے لیے یہ کریں کہ جو پڑھی لکھی ہیں وہ تو یہ کریں کہ کتابیں خرید کر ان کو سبقاً سبقاً پڑھ لیں اور جو بے پڑھی ہیں وہ پڑھی لکھی عورتوں سے سن لیا کریں۔

## اچھی صحبت عالم اور جاہل سب کیلئے ضروری ہے

پہلے زمانہ میں جو سب لوگ اچھے ہوتے تھے اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ وہ سب اسی صحبت کا اہتمام رکھتے تھے اس وقت یہ حالت ہے کہ تعلیم کا اہتمام تو کسی قدر ہے بھی کہ اس پر ہزاروں روپیہ صرف کیا جاتا ہے اور بہت سا وقت اس کو دیا جاتا ہے مگر صحبت کے لیے فی سال ایک ماہ بھی کسی نے نہیں دیا واللہ اگر صحبت کی طرف ذرا بھی توجہ کرتے تو مسلمان ساری تباہیوں سے بچ جاتے اور اگر کسی کو اس میں شبہ ہو تو وہ اب امتحان کر دیکھے اور خود کو بھی اور اپنی اولاد کو بھی بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب

کرے میں انشاء اللہ پانچ برس کے بعد دکھلاؤں گا کہ سب کے اقوال افعال اعمال کس قدر درست ہوئے اس وقت شائستگی کے عام ہونے سے یہ حالت ہوگی کہ ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

کسے رابا کسے کارے نباشد

کار نہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ کار موذی نہ ہوگا اور اس لیے دنیا جنت کی مثل ہو جائے گی، اور راز اس کا یہ ہے کہ علم سے نیک باتیں معلوم ہوں گی اور صحبت سے اخلاق رذیلہ دور ہوں گے اور یہی دو چیزیں جہل اور بدخلقی ساری خرابیوں کی جڑ ہے، کیونکہ مثلاً اگر کسی شخص میں تکبر ہو اور اس سے کوئی غلطی ہو جائے تو اس کا تکبر کبھی اعتراف اور قبول حق کی اجازت نہ دے گا بلکہ وہ اپنی غلطی پر مصر ہوگا اور ہزاروں آدمی اس غلطی سے گمراہ ہوں گے، اور جب تکبر کی اصلاح ہو جائے گی تو یہ بات نہ رہے گی اور اثر اس کا یہ ہوگا کہ ہر غلطی کو تسلیم کرلے گا۔

## غلطی کا احساس

سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ میرٹھ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص نے عشاء کے وقت پوچھا، آپ نے اس کا جواب دے دیا، مستفتی کے جانے کے بعد ایک شاگرد نے عرض کیا کہ مجھے یہ مسئلہ یوں یاد آرہا ہے آپ نے فرمایا کہ تم ٹھیک کہتے ہو اور مستفتی کو تلاش کرنا شروع کیا، لوگوں نے عرض کیا کہ اس وقت رات زیادہ ہوگئی ہے آپ آرام فرمائیے ہم صبح ہونے پر اس کو بتلادیں گے، لیکن آپؒ نے قبول نہیں فرمایا، اور اس کے مکان پر تشریف لے

گئے گھر میں سے اس کو بلایا اور فرمایا کہ ہم نے اس وقت مسئلہ غلط بتلایا تھا تمہارے آنے کے بعد ایک شخص نے ہم کو صحیح مسئلہ بتلایا اور وہ اس طرح ہے جب یہ فرما چکے تب چین آیا اور واپس آکر آرام فرمایا۔

تو اس بے چینی کا سبب کیا نرا علم تھا، ہرگز نہیں، یہ صرف حال کا اثر تھا جو صحبت کا اثر تھا اسی کو کہتے ہیں ؎

قال را بگذار مرد حال شو
پیش مرد کاملے پامال شو

## پہلے چھوٹا بنو تب بڑے بنو گے

بعض لوگ جن کی تربیت نہیں ہوتی اور مقتدا ہو جاتے ہیں ان کے اخلاق نہایت خراب ہوتے ہیں اور وجہ اس کی یہی ہے کہ وہ چھوٹا ہونے کے قبل بڑے ہو جاتے ہیں کسی نے خوب کہا ہے ؎

اے بے خبر بکوش کہ صاحب خبر شوی
تارہ ہیں نباشی کے راہبر شوی
در مکتب حقائق پیش ادیب عشق
ہاں اے پسر بکوش کہ روزے پدر شوی

تو پسر بننے سے پہلے پدر بن جانا بہت سی خرابیوں کا باعث ہے، اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اول چھوٹا بن کر اخلاق کی درستی کی جائے کہ اس سے اعمال کی درستی ہو جائے گی اور تدبیر اس کی یہ ہے کہ جن لوگوں کو خدا تعالیٰ نے فراغ دیا ہے وہ

توکم از کم چھ ماہ تک کسی بزرگ کی خدمت میں رہیں لیکن اس طرح کہ اپنا تمام کچا چٹھا ان کے سامنے پیش کردے، اور پھر جس طرح یہ کہیں اس طرح عمل کریں، اور اگر وہ ذکر تجویز کریں تو ذکر وشغل میں مصروف ہوجایئے، اگر وہ اس سے منع کر کے کسی دوسرے کام میں لگا دیں اس میں لگ جائے اوران کے ساتھ محبت بڑھانے اوران کی حالت کو دیکھتا رہئے کہ کسی چیز کے لینے کے وقت یہ کیا برتاؤ کرتے ہیں اور دینے کے وقت کس طرح پیش آتے ہیں، اس کا اثر یہ ہوگا کہ تخلق اخلاق اللہ ہو جائے گا، اور پھر اس کی ذات سے سراسر نفع ہی پہنچے گا اور جن لوگوں کو فروغ راہ نہیں وہ یہ کہنا کہ وقتاً فوقتاً جب ان کو دو چار یوم کی مہلت ہوا کرے اس وقت کسی بزرگ کے پاس رہ آیا کریں۔

اور اپنی اولاد کے لیے یہ کرو کہ روزمرہ جیسا ہر کام کے لیے نظام الاوقات ہے ایسا ہی اس کے لیے بھی ایک وقت مقرر کرو کہ فلاں مسجد میں فلاں بزرگ کے پاس جا کر کچھ دیر بیٹھا کریں، صاحبو! کس قدر افسوس کی بات ہے کہ فٹ بال کے لیے وقت ہو اور درستی اخلاق کے لیے وقت نہ نکل سکے، اور اگر شہر میں کوئی ایسا شخص نہ ہو تو چھٹی کے زمانے میں کسی بزرگ کی خدمت میں بھیج دیا کرو اس زمانے میں تو ان کو کوئی کام بھی نہیں ہوتا، کمبخت دن رات مارے مارے پھرتے ہیں نہ نماز کے نہ روزے کے ماں باپ خوش ہیں کہ ہم نماز کے بہت پابند ہیں حالانکہ ان کو یہ خبر نہیں کہ قیامت میں وہ اولاد کے سبب ان کے ساتھ جہنم میں جائیں گی حدیث شریف میں ہے۔

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ۔

آج کل لوگ اپنی اولاد کی تربیت ایسی کرتے ہیں جیسا کہ قصائی گائے کی تربیت کیا کرتا ہے کہ اس کو کھلاتا پلاتا ہے حتیٰ کہ وہ خوب موٹی تازی ہو جاتی ہے لیکن غرض اور مآل اس کا یہ ہوتا ہے کہ اس کے گلے پر چھری پھیر لی جاتی ہے اسی طرح یہ لوگ اپنی اولاد کو خوب زیب وزینت اور تعیش میں پرورش کرتے ہیں اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ وہ لقمہ جہنم ہوتے ہیں اور ان کی بدولت مربی کی بھی گردن ناپی جاتی ہے، کیونکہ اس تعیش کی بدولت اولاد کو نہ نماز کی خبر ہوتی ہے اور نہ روزے کی بعض نامعقول تو حد سے اس قدر آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان کو اسلام کی کسی بات کی خبر نہیں ہوتی۔

ایک نوجوان کی نسبت میں نے سنا ہے کہ وہ بیرسٹری پاس کر کے آرہے تھے ان کے باپ نے اپنے ایک دوست کو لکھا کہ میرا لڑکا لندن سے آرہا ہے تمہارے شہر سے اس کا گزر ہوگا اگر تم اسٹیشن پر اس کو مل لو تو بہتر ہوتا کہ اس کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو، ان کے لکھنے کی موافق یہ مکتوب الیہ اسٹیشن پڑ گئے اور جا کر ان بیرسٹر صاحب سے ملے اس وقت بیرسٹر صاحب کھانا کھا رہے تھے چونکہ رمضان شریف تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا اور انہوں نے دریافت کیا کہ رمضان شریف ہے آپ نے روزہ نہیں رکھا، صاحبزادے پوچھتے ہیں کہ رمضان کیا چیز ہوتا ہے انہوں نے کہا کہ رمضان ایک مہینہ کا نام ہے، کہنے لگا جنوری فروری الخ ان میں تو رمضان کہیں نہیں آیا آخر اس کی حالت دیکھ کر ان کو سخت صدمہ ہوا اور سمجھے کہ منبع الکفر کا مسخ شدہ ہے اس کی حالت میں تغیر آنا معلوم اور انا للہ پڑھ کر چلے آئے۔

اب آپ غور کیجئے کہ یہ مسلمانوں کے بچے ہیں مسلمان خواتین کی گودوں کے پرورش کیے ہوئے ہیں اور آغوش جہنم میں دیے جارہے ہیں، وصاحبو! اگر یہی رنگ رہا تو عجب نہیں کہ ۵۰ برس کے بعد یہ لوگ اپنے کو مسلمان کہنا بھی ننگ وعار سمجھیں، اتنا اثر تو اب بھی آ گیا ہے کہ اسلامی نام پسند نہیں ہے، آپ خوش ہیں کہ ہم نے بی اے کرادیا، ایم اے کرادیا حالانکہ آپ نے جہنم کی پگ ڈنڈی پر چھوڑ دیا ہے اور آنکھوں پر ایسے چشم بند چڑھائے ہیں کہ شاہرہ جنت نظر ہی نہ آسکے۔

## بچہ کو انگریزی پڑھاؤ مگر کسی اہل اللہ کی صحبت میں بھی ضرور رکھنا ورنہ رونا پڑے گا

صاحبو! آپ کہتے ہیں کہ مولوی انگریزی پڑھنے سے منع کرتے ہیں واللہ ہم منع نہیں کرتے، خدا کے لیے ان کا دین تو خراب نہ ہونے دو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ ان کو اہل اللہ کی صحبت حاصل ہو، خیر اگر چھ مہینے دوزخ میں جانے کے کام کریں گے تو چھ مہینے جنت میں جانے کے کام بھی تو کرلیں گے یادرکھو اہل اللہ کی صحبت وہ اکسیر ہے کہ ؎

گر تو سنگ خارۂ مرمر شوی
چوں بصاحب دل رسی گوہر شوی

اور کہتے ہیں ؎

یک زمانہ صحبت با اولیاء
بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

بہتر از صدسالہ زہد وطاعت است
صحبت نیکاں اگریک ساعت است

## رہبری کرنیوالے کی صفات

اب میں اپنے بیان کوایک ضروری بات پر ختم کرتا ہوں وہ یہ کہ صحبت کے لیے جوشخص کوتجویز کیا جائے وہ کیسا ہواوراس کے صاحب کمال ہونے کی علامتیں کیا ہیں،سوعلامتیں اس کی یہ ہے کہ۔

ایک تو بقدرضرورت علم دین جانتا ہو۔

دوسرے شریعت پر پوری طرح کاربند ہو۔

تیسرے اس میں یہ بات ہو کہ جس امرکوخودنہ جانتا ہوعلماء سے رجوع کرتا ہو۔

چوتھے علماء سے اس کووحشت نہ ہو۔

پانچویں یہ کہ اس میں روک ٹوک کی عادت ہومریدین اور متعلقین کوان کی حالت پرنہ چھوڑ دیتا ہو۔

چھٹے یہ کہ اس کی صحبت میں برکت ہو کہ اس کے پاس بیٹھنے سے دنیا کی محبت کم ہوتی جائے۔

ساتویں یہ کہ اس کی طرف صلحاء اور دین کے سمجھنے والے لوگ زیادہ متوجہ ہوں اور یہ بڑی علامت ہے کمال کی۔

جس شخص میں یہ علامتیں پائی جائے وہ مقبول ہے اور کامل ہے اس کے پاس جایئے اوراس کی صحبت سے مستفید ہوجایئے ،اوراس کی ضرورت نہیں کہ آپ اس

سے بیعت ہوجائیں، کیونکہ پیری مریدی کی حقیقت مقصود ہے اور وہ یہ یہی ہے جو مذکور ہوئی، اس کی صورت مقصد نہیں ہے۔

خلاصہ اس سب تقریر کا یہ ہے کہ اپنی اولاد کے لیے اہل اللہ کی صحبت طویلہ کو تجویز کرو، یہ تو مردوں اور تندرستوں کے لیے ہے۔

اور جو اپاہج یا عورتیں ہوں تو ان کے لیے صحبت کا بدل یہ ہے کہ ایسے بزرگوں کے ملفوظات دیکھا کریں یا سنا کریں، ان کے توکل صبر وشکر تقویٰ طہارت کی حکایت دیکھنا سننا یہی صحبت کے قائم مقام ہوجاتا ہے۔

# ضمیمہ

## سحر، ساحرین، جنات اور شیاطین سے نجات کا مجرب نسخہ

سلسلہ کے تمام حضرات اس مضمون کو بار بار پڑھ کر حرزِ جان بنالیں اور پورا پورا استفادہ کریں۔

﴿حضرت حکیم الامت مجددالملت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے نہایت قیمتی ملفوظات﴾

## ﴿جنات کیسے بھاگتے ہیں؟﴾

فرمایا: سالک طریقت کی پیشانی کے نور سے مومن جنات گرویدہ ودیگر جنات وشیاطین بھاگ جاتے ہیں، یہ نور ازلی ہوتا ہے، ہر پیشانی میں موجود ہوتا ہے، لیکن مستور ہوتا ہے، نفس کی کدورت کی جھلی اس نور کو محجوب کئے ہوتی ہے۔

نفس جب کدورت سے پاک ہوتا ہے تو یہ نور منور ہوجاتا ہے، جگمگا اٹھتا ہے، ورنہ کسی اور طرح یہ حجاب نہیں اٹھ سکتا، بھاویں سوسو حیلے کرو، قرآن کریم کی تلاوت کے نور کا جلال جنات وشیاطین کو جلادیتا ہے، کوئی بھی تاب نہیں لاسکتا۔

## ﴿قرآن شریف شیطان کو کیسے جلاتا ہے﴾

فرمایا: سالک جب قرآن شریف کی تلاوت میں محو ہوتا ہے قرآن مجید کے نور کے جلال سے ہمزات شیاطین لاغر نحیف اور بے بس ہوکر توبہ توبہ کرنے لگتے ہیں، قرآن کریم کی تلاوت کے نور کا جلال شیطان کو جلادیتا ہے، تلاوت

قرآن، نماز، ذکران تینوں میں ہر مرض سے کلی شفاء ہے، ان تینوں کی کثرت مساوی ہو یہی سلف صالحین کا نسخۂ کیمیا ہے۔

## شیطان سے بچنے کا ہتھیار

**فرمایا:** دیکھئے بیت اللہ، اللہ تعالیٰ کا گھر ہے ابرہہ نے چاہا تھا کہ اس گھر کے اوپر قبضہ جمائے، اللہ تعالیٰ نے ابابیلوں کو مسلط کر دیا، انہوں نے کنکریاں مار مار کر اس کے پورے لشکر کو کھائے ہوئے بھس کی طرح بنا دیا، بالکل اسی طرح انسان کا دل اللہ تعالیٰ کا گھر ہے، اگر شیطان اس کی طرف قدم بڑھانا چاہے تو آپ لا الہ الا اللہ کی ضربوں سے اور اللہ اللہ کے الفاظ سے اس کے اوپر پتھروں کی بوچھاڑ کیجئے، پھر دیکھئے کہ اللہ آپ کو شیطان سے محفوظ فرمالیں گے اور قرآن پاک میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

**إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ۔** (سورہ الاعراف، آیت: 201)

ترجمہ: بلا شبہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا جب شیطان کی طرف سے کوئی خیال بھی ان کو چھوتا ہے تو وہ اللہ کا ذکر کر لیتے ہیں تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔

## (حضرت مولانا) محمد علاء الدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی

## خلیفہ ومجاز بیعت

حبیب الامت حضرت مولانا ڈاکٹر حکیم ادریس حبان رحیمی رحمۃ اللہ علیہ

خلیفہ ومجاز: حضرت حاذق الامت مولانا ذکی الدین صاحب پرنامبٹیؒ

خلیفہ ومجاز: مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب جلال آبادیؒ

خلیفہ ومجاز: حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

## شجرہ: سلسلۂ چشتیہ منظومہ

# حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی

سلاسل اربعہ کے مشائخ کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ مشائخ کا شجرہ انفرادی اور اجتماعی طور پر پڑھنے سے مصائب دور، مسائل حل اور مقاصد پورے ہوتے ہیں، اسلئے باجازت شیخ اس کا اہتمام کرنا چاہئے۔

حمد ہے سب تیری ذات کبریا کے واسطے
اور درود و نعت ختم الانبیاء کے واسطے
اور سب اصحاب و آل مصطفٰی کے واسطے
رحم کر مجھ پر الٰہی اولیاء کے واسطے
حضرت طیبؔ شہ علم و ہدیٰ کے واسطے
حضرت محمودؔ و اشرفؔ ذوالعلا کے واسطے
حاجی امدادؔاللہ مہاجر ذوالعطاء کے واسطے
حضرت نورؔ محمد پر ضیاء کے واسطے

حاجی عبدالرحیمؒ اہل غزا کے واسطے
شیخ عبدالباریؒ شہ بے ریا کے واسطے
شاہ عبدالہادیؒ پیر ہدیٰ کے واسطے
شاہ عضدالدینؒ عزیز دوسرا کے واسطے
شہ محمدؒ اور محمدیؒ اتقیا کے واسطے
شہ محب اللہؒ شیخ باصفا کے واسطے
بو سعیدِؒ اسعد اہلِ وراء کے واسطے
شہ نظام الدینؒ بلخی مقتدا کے واسطے
شہ جلال الدینؒ جلیل اصفیا کے واسطے
عبد قدوسؒ شہ قدس و صفا کے واسطے
اے خدا شیخ محمدؒ رہنما کے واسطے
شیخ احمدؒ عارف صاحب عطا کے واسطے
احمد عبدالحقؒ شہ ملک بقا کے واسطے
شہ جلال الدینؒ کبیر الاولیاء کے واسطے
شیخ شمس الدینؒ ترکِ باصفا کے واسطے
شیخ علاء الدینؒ صابر بارضا کے واسطے
شہ فریدالدینؒ شکر گنج بقا کے واسطے
خواجہ قطب الدین مقبول ولا کے واسطے
شہ معین الدینؒ حبیب کبریا کے واسطے
خواجہ عثمانؒ با شرم و حیا کے واسطے

شہ شریفؒ زندانی با اتقیاء کے واسطے
خواجۂ مودودؒ چشتی پارسا کے واسطے
شاہ بویوسفؒ شہ شاہ و گدا کے واسطے
بو محمدؒ محترم شاہِ ولا کے واسطے
احمدؒ ابدال چشتی باسخا کے واسطے
شیخ ابواسحاقؒ شامی خوش ادا کے واسطے
خواجہ ممشادؒ علوی بوالعلاء کے واسطے
بوہبیرہؒ شاہ بصری کے پیشوا کے واسطے
شیخ حذیفہؒ مرعشیؒ شاہ صفا کے واسطے
شیخ ابراہیمؒ ابن ادہمؒ بادشاہ کے واسطے
شہ فضیلؒ ابن عیاض اہل دعا کے واسطے
خواجہ عبدالواحدؒ بن زید شاہ کے واسطے
شیخ حسن بصریؒ امام الاولیاء کے واسطے
ہادیٔ عالم علیؓ شیرِ خدا کے واسطے

# معمولات

## صبح و شام

معمولات اوران کی تعداد کم ہوں یا زیادہ مشائخ اپنے مریدین ومتوسلین کو ان کے حسب احوال ارشاد فرماتے ہیں ۔راقم السطور مندرجہ ذیل طریقے پر سالکین طریقت وعاشقان حق کی رہنمائی کا ادنی فریضہ انجام دیتا ہے۔

### ﴿طبقۂ اولیٰ﴾

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ الٰہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: حضرت حکیم الامتؒ کے بعض ذاتی معمولات یہ تھے ۔تہجد کے بعد آپ اس طرح معمولات کوشروع فرماتے:

أَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِي عَنْ غَيْرِكَ وَنَوِّرْ قَلْبِي بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ ـــــــــ ۳،بار

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ رَبِّيْ مِنْ كُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَيْه ـــــــــ ۱۰۰بار

درودشریف۔ ـــــــــ ۱۰۰بار

لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه۔ ـــــــــ ۲۰۰بار

اِلَّا اللّٰه۔ ـــــــــ ۴۰۰,ار

اَللّٰهُ اللّٰه۔ ـــــــــ ۶۰۰,بار

اَللّٰهُ۔ ـــــــــ ۱۰۰بار

تلاوت کلام پاک کم ازکم ایک پارہ مع سورۂ یٰس شریف۔

مناجات مقبول حضرت حکیم الامتؒ۔روزانہ ایک منزل۔

# شام کے معمولات

استغفار۔ ______________ ۱۰۰،بار

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ ______________ ۱۰۰،بار

درودشریف۔ ______________ ۱۰۰،بار

سورۂ اخلاص،سورۂ فلق،سورۂ ناس،تین تین مرتبہ۔

## طبقۂ ثانیہ صبح کے معمولات

أَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ عَنْ غَیْرِكَ وَنَوِّرْ قَلْبِیْ بِنُوْرِ مَعْرِفَتِكَ ____ ۳،بار

اَسْتَغْفِرُ اللہَ رَبِّیْ مِنْ کُلِّ ذَنْبٍ وَّاَتُوْبُ اِلَیْہِ ______________ ۱۰۰،بار

درودشریف۔ ______________ ۱۰۰،بار

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ ______________ ۱۰۰،بار

اَللہُ اللہ۔ ______________ ۱۰۰،بار

اللہ۔ ______________ ۱۰۰،بار

کم از کم سورۂ یٰسٓ شریف کی تلاوت،زیادہ سے زیادہ تلاوت کی کوئی حد نہیں۔

مناجات مقبول حکیم الامتؒ ہر روز ایک منزل۔

سورۂ اخلاص،سورۂ فلق،سورۂ ناس،تین تین مرتبہ۔

# شام کے معمولات

استغفار۔ ________________ ۱۰۰،بار

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ۔ ________________ ۱۰۰،بار

درودشریف ۔ ________________ ۱۰۰،بار

سورۂ اخلاص،سورۂ فلق ،سورۂ ناس،تین تین مرتبہ۔

# نصیحت

جوشخص ان معمولات کوبلا ناغہ پابندی سے پڑھےاورساتھ ساتھ نماز پنجگانہ کا بھی اہتمام کرے وہ دنیامیں جہاں بھی اورجس ماحول میں بھی رہے گاان شاءاللہ بتدریج اسے دین پر ضرور استقامت کی دولت حاصل ہوگی اورتمام بلاؤں ،بیماریوں،حوادث،سحر،نظر بد،جن وشیاطین کے حملوں سے محفوظ رہے گا،اگرقسمت کا چھوٹااور بدنصیب ہےتوروز بروز اس کا نصیب اچھاہوتا چلا جائے گا،جسے تجربہ کرنااورآزماناہوآزماکردیکھ لے۔

(حضرت مولانا) **محمدعلاءالدین صاحب قاسمی مدظلہ العالی**

خانقاہ اشرفیہ ومکتبہ رحمت عالم رحمانی چوک پالی گھنشیام پور

ضلع دربھنگہ(بہار)

۲۹ذی قعدہ ۱۴۴۳ھ بروز جمعرات

بمطابق ۳۰جون ۲۰۲۲ء

# {مؤلف کا تعارف}

**نام:** محمد علاء الدین قاسمی ابن الحاج حافظ حبیب اللہ صاحب۔

**ولادت و پیدائش:** مقام و پوسٹ: جھگڑوا، تھانہ جمال پور، وایا گھنشیام پور، ضلع دربھنگہ بہار (انڈیا)

**ابتدائی تعلیم:** ناظرہ، وحفظ، وقرأت قرآن شریف: مدرسہ عربیہ حسینیہ چلہ امروہہ ضلع مرادآباد یوپی۔

**عربی اول:** جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد (یوپی)

**عربی دوم، سوم:** مدرسہ جامعہ اسلامیہ جامع مسجد امروہہ (یوپی)

**اعلی تعلیم:** عربی چہارم تا دورۂ حدیث دارالعلوم دیوبند (یوپی)

**فراغت:** سنہ ۱۹۹۱ء

# بعد فراغت مصروفیات

**درس وتدریس:** درجہ سوم تا ہفتم: مدرسہ حسینیہ شریوردھن کوکن مہاراشٹر۔

**حرمین شریفین کی زیارت اور عملی سرگرمیاں:**

فریضۂ امامت اور جدہ اردو نیوز کے لئے کالم نگاری۔

**موجودہ مصروفیات :**

خانقاہ اشرفیہ پالی کی ذمہ داری اور تصنیف وتالیف کے مشاغل۔

# مؤلف کی مشہور کتابیں

۱۔ رمضان المبارک سے محرم الحرام تک۔

۲۔ اپنے عقائد کا جائزہ لیجئے۔

۳۔ نکاح اور طلاق۔

۴۔ حج گائیڈ۔

۵۔ چالیس حدیثیں۔

۶۔ جادوٹونا، اور کہانت کا حکم۔

۷۔دس عظیم صحابہ کرامؓ کے ایمان افروز واقعات۔

۸۔ وعظ وادب کا خزانہ۔

۹۔ عظمت قرآن۔

۱۰۔ مسائل حاضرہ۔

۱۱۔ قربانی کے ضروری مسائل۔

۱۲۔ اصلاح کا تیر بہدف نسخہ ۔

۱۳۔ چراغ اصلاح۔

۱۴۔تکبر ایک وبال ہے۔

۱۵۔تنقید ایک بُری عادت ہے۔

۱۶۔جنت کے حسین محلات اور لذیذ ونفیس نعمتیں۔

۱۷۔تراویح کا پیسہ لینا جائز نہیں۔

۱۸۔رمضان المبارک کو نفع بخش اور مقبول بنانے کے صحیح طریقے۔

۴۱۔اعتکاف کے فضائل ومسائل۔
۴۲۔رمضان المبارک کیسے گذاریں۔
۴۳۔اسلام میں حقوق ومعاملات کی نزاکت واہمیت۔
۴۴۔عذاب قبراوراوال برزخ ودوزخ۔
۴۵۔اصلاح کے قیمتی موتی۔
۴۶۔اصلاح وتزکیہ کے پراثرارشادات۔
۴۷۔بچے اوربچیوں کاتعلیمی وتربیتی نصاب۔
۴۸۔گناہوں سے نجات جلد سے جلد پالیجئے۔
۴۹۔زبان کے بڑے بڑے گناہ۔
۵۰۔عورتوں کی اصلاح کی روشنی۔
۵۱۔اولادکی تربیت کے اسلامی اصول۔
۵۲۔ماں باپ کی خدمت اوران کے حقوق۔
۵۳۔تصوف کی اہمیت وضرورت۔
۵۴۔اسلام کی عظیم اورمشہورشخصیتیں،جلداوّل۔

## ﴿بیعت سے آدمی پاک صاف ہوجاتا ہے﴾

حضرت خواجہ صاحبؒ فرماتے ہیں میرا بیعت ہونے کو بہت جی چاہتا تھا، مگر ہمت نہیں ہوتی تھی کیونکہ مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ اگر بیعت ہونے کے بعد بھی گناہ ہوتے رہے تو بیعت ہونے سے کیا فائدہ؟ اس لئے پہلے حضرت میرے ناپاک ہاتھوں کو اس قابل کر دیں کہ حضور کے پاک ہاتھوں میں دے سکوں، احقر کی عرض مذکور پر تمثیلاً فرمایا کہ: ایک دریا تھا اس کے پاس ایک ناپاک اور میلا کچیلا آدمی آیا اس دریا نے کہا کہ آتو میرے پاس آجا۔ اس نے کہا کہ میری بھلا کیا مجال ہے میں تیرے پاس آسکوں، تو بالکل صاف وشفاف، میں بالکل نجس، پلید، ناپاک، دریا نے جواب دیا تو تو اس حالت میں میرے پاس آنے نہیں پاتا اور بغیر میرے پاس آئے اور میرے اندر نہائے پاک ہو نہیں سکتا، تو بس ہمیشہ کیلئے دوری ہی رہی، ارے سبھائی پاک ہونے کی تدبیر بھی تو یہی ہے کہ بس آنکھیں بند کر کے بلا پس وپیش میرے اندر کود پڑ بس، پھر فوراً ہی میرے اندر سے ایک ایسی موج اٹھے گی جو تیرے سر پر ہو کر گذر جائے گی اور آن کی آن میں تیری ساری نجاستوں کو دھو کر تجھے سر سے پاؤں تک بالکل صاف کر دے گی۔ (اشرف السوانح، ج/ ۲، صفحہ/ ۵۱)

### نوٹ

اس مضمون کو طباعت کے وقت بیک فرنٹ پر ڈالیں۔